اکال ساگر کیا ہے؟ ایک پراسرار، خوفناک اور دہشت ناک ناول

اکال ساگر

ایم اے راحت

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور- فون ۷۲۴۷۴۱۴

"چھوٹے مالک' چھوٹے مالک' انرتھ ہو گیا چھوٹے مالک۔ بڑے مہاراج' بڑے مہاراج۔" بدری ناتھ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ سندر لال کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیا ہوا بدری کاکا؟" بمشکل تمام اس نے کہا۔

"سنسار چھوڑ گئے بڑے مالک۔ ہمارے مالک کا دیہانت ہو گیا چھوٹے مالک۔" بدری ناتھ نے کہا اور سندر لال نے مسہری سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ پھر وہ دوڑتا ہوا ٹھاکر کنہیا لال کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کا منظر بے حد خوفناک تھا۔ کنہیا لال کا بے جان بدن آدھا مسہری سے اوپر اور آدھا نیچے پڑا ہوا تھا۔ سندر لال نے اسے چھو کر دیکھا۔ اس میں زندگی کا نام و نشان نہیں تھا۔

حویلی میں تہلکہ مچ گیا۔ کنہیا لال کی لاش جس حالت میں تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ اسے مرے ہوئے بھی چار چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ فوراً سری لال وید کو طلب کیا گیا۔

"زہر دیا گیا ہے۔" وید جی نے انکشاف کیا اور سندر لال کو چکر آ گئے۔ سری لال نے کہا۔ "خود کو سنبھالئے سندر لال جی اور ایک بات سنئے۔ کنہیا لال نے مجھ سے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ان کی جان لینے کی کوشش کی جا سکتی ہے کیونکہ انہوں نے کچھ لوگوں کی برائی پکڑ لی ہے۔"

"کس کی وید جی؟" سندر لال نے کہا۔

"بھگوان کی سوگند نام نہیں لیا کسی کا انہوں نے۔"

"آپ ابھی زبان بند رکھئے۔ اور ایسی بات ہے تو میں سوگند کھاتا ہوں کہ کنہیا جی کے قاتلوں کو جیتا نہیں چھوڑوں گا۔"

"میری طرف سے آپ بالکل چنتا نہ کریں چھوٹے ٹھاکر۔ میں نے بھی آپ ہی لوگوں کا نمک کھایا ہے۔"

کنہیا لال کے کریا کرم کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ارتھی تیار ہو گئی اور پھر تمام

رسومات کے بعد ارتھی شمشان کی طرف چل پڑی۔ ”رام نام ست ہے“ کے نعرے لگاتے ہوئے لوگ ارتھی لے کر چل پڑے۔ چتا تیار ہو چکی تھی۔ ارتھی لے کر شمشان پہنچنے والے اس وقت خوف سے اچھل پڑے جب اچانک انہوں نے اپنے کندھوں کا بوجھ ہلکا محسوس کیا۔ ایسا اچانک ہوا تھا لیکن کوئی کسی سے کیا کہتا۔ بات تو کھلی ہی تھی کنہیا لال کا بدن ارتھی پر موجود نہ تھا۔ ایک بار پھر ہاہا کار مچ گئی۔ یہ کیا ہوا۔ سب کی عقلیں چکرائی ہوئی تھیں۔ سارا راستہ محفوظ تھا۔ کوئی بھول کر بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ لاش کہیں گر گئی ہے یا اور کوئی بھول ہوئی ہے۔ کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ ہر شخص سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہا تھا۔ تب پنڈت رام مورتی نے کہا۔

”خالی ارتھی چتا پر رکھ دو۔“ خاموشی سے یہ عمل کیا گیا اور پھر اسی خاموشی سے واپس چل پڑے۔

☆——————☆======☆

مفلوک الحال علاقے کی ایک چھوٹی سی آبادی بشن بری کا ہندو نمبردار دیال چند جوشی شام کے جھٹپٹے میں تیز تیز قدموں سے اپنے گھر جا رہا تھا۔ جوں جوں شام جھکتی آ رہی تھی جوشی کے قدموں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی پیٹھ پر ایک بڑا تھیلا لٹکا ہوا تھا جس میں کپڑوں کے کئی تھان تھے۔ یہ تھان وہ سندھ کے شہروں سے آنے والے کپڑے کے بیوپاریوں سے خرید کر لایا تھا اور انہیں اپنی دکان پر رکھ کر بیچنا چاہتا تھا۔ یہی اس کا روزگار تھا۔ پاس کی بڑی بستی نو کلومیٹر دور تھی۔ بڑے بیوپاری منگل کے دن منڈی لگاتے تھے اور اس میں تھوک مال بیچتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے دکاندار عام طور سے منگل کو اپنا کاروبار بند رکھتے تھے اور منڈی جا کر مال خریدتے تھے۔ دیال چند آج ذرا دیر سے گھر سے نکلا تھا۔ بس پاروتی پر صبح ہی سے سوگ طاری تھا۔ ہفتہ پندرہ دن میں اس پر یہ جنون طاری ہو جاتا تھا اور اس کی وجہ تینوں بیٹیاں تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بھگوان بھی کبھی کبھی اپنے بنائے ہوئے کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ ایک ایسے گھر میں جہاں دو وقت کی روٹی اور تن بھر کپڑا حاصل کرنے میں ایک انسان کا تیل نکل جائے، تین جنتی پھول کھلے تھے۔ جوانی کی تپش ایسی کہ فولاد پگھل جائے۔ سارا وجود پھول کر کپا ہو رہا تھا۔ چہرہ لال بھبھوکا۔ چھوٹی چھوٹی عمریں تھیں لیکن جوانی سیلاب بنی ہوئی تھی۔ بہت سی فکریں دامن گیر تھیں۔ مگر اس دور میں بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنا آسان تو نہیں ہوتا۔ دیال چند اکثر حسرت سے سوچتا تھا کہ بھگوان کہیں سے

مایا مل جائے۔ کچھ ہو جائے تاکہ میں ان تین کیلوں کو کلیجے سے نکال پھینکوں۔

اس نے سہمی ہوئی نظروں سے آسمان کو دیکھا۔ آسمان سے اندھیرا گر رہا تھا۔ اکثر راستوں میں ڈکیتی کی وارداتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ غریب کی پونجی تو یہی چند تھان تھے۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ اس نے رفتار اور بڑھا دی۔ اب بشن بری زیادہ دور نہیں تھا۔ بائیں طرف شمشان گھاٹ تھا اور دائیں طرف مسلمانوں کا قبرستان۔ شمشان گھاٹ میں ایک چتا سلگ رہی تھی، شعلے مدھم پڑ چکے تھے۔ لوگ جا چکے تھے، لیکن شمشان گھاٹ کی پگڈنڈی کے قریب مٹی کے ایک ڈھیر پر کوئی بیٹھا تھا۔ ملگجے ماحول میں اس کا صرف ہیولا نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں خوف کی ایک سرد لہر دیال جوشی کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس کے قدم ٹھٹکے لیکن آگے تو بڑھنا ہی تھا۔ جس جگہ وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں سے پگڈنڈی صرف دو گز کے فاصلے پر تھی۔ وہ ایک ایک قدم سہم سہم کر رکھتا ہوا آگے بڑھا تو ایک آواز ابھری۔

”ارے او اوشٹ کی تھوبڑی والے۔“

دیال چند اچھل پڑا۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کون؟“

”مرا کیوں جا رہا ہے آگے آ۔“ ہیولے نے کہا اور جوشی آنکھیں پھاڑتا ہوا آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر قریب جا کر اس نے اس ہیولے کی شکل دیکھی تو چونک پڑا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ارے۔ ٹھاکر صاحب آپ؟ جے رام جی کی۔“

”بک بک کئے جا رہا ہے یا کسی کام بھی آئے گا۔ مجھے سہارا دے، میں بیمار ہو گیا ہوں۔“

”جی مہاراج۔“ جوشی نے کپڑے کا تھان سنبھالا اور پھر ٹھاکر کنہیا لال کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کی کھوپڑی ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ٹھاکر کنہیا لال اور اس حال میں، انہوں نے بدن پر ایک بوسیدہ سا کمبل اوڑھا ہوا تھا۔ بال بری طرح مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ بشن بری کے بڑے رئیسوں میں سے تھے۔ پرکھوں سے یہاں آباد تھے۔ تقسیم ہو چکی تھی لیکن ٹھاکر خاندان نے حویلی نہیں چھوڑی تھی۔ بے شمار جائیداد ہندوستان میں تھی اور اس کی آمدنی اب بھی باقاعدہ آتی تھی۔ تین بیٹے دو بیٹیاں تھیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیوں کی شادی کر چکے تھے۔ بیٹیاں ملک سے باہر بیاہ کر گئی تھیں۔ سب سے چھوٹا بیٹا جس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ بہنوں کے پاس چلا گیا تھا۔ باقی دونوں بیٹوں

کے ساتھ بشن ہری کی حویلی میں رہتے تھے۔

"چل مجھے گھر لے چل.........." کنہیا لال نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"آیئے مہاراج۔" دیال چند نے کنہیا لال کو سہارا دے کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ انہوں نے اپنے بدن کا بوجھ جوشی پر ڈال رکھا تھا۔ جوشی سخت حیران تھا۔ یہ انہونی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد ٹھاکر صاحب نے کہا۔

"تو نے مجھے ٹھاکر کہہ کر پکارا ہے۔"

"ایں۔ جی ٹھاکر صاحب۔"

"پورا نام کیا ہے میرا؟"

"ہم آپ کو اچھی جانتے ہیں مہاراج۔ آپ ٹھاکر کنہیا لال ہیں۔"

"اچھا.........." ٹھاکر صاحب کراہتے ہوئے بولے۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

"داس ہوں مہاراج کا۔ دیال چند جوشی ہے میرا نام۔ منوہر لال جوشی کا بیٹا ہوں۔ بڑے چوک میں پتاجی کی کپڑے کی دکان تھی۔ اس دکان پر بیٹھتا ہوں۔"

"ہاں اچھا' ٹھیک ہے۔ میری ایک بات سنو۔"

"جی مہاراج۔"

"ایک حادثہ ہوا ہے میرے ساتھ' سب کچھ بھول چکا ہوں۔ تو مجھے اپنے گھر لے چل کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی مجھے۔ تیرے اوپر بوجھ نہیں بنوں گا۔"

"جو آگیا مہاراج اور بھلا آپ ہم پر بوجھ کیوں بنیں گے۔ ارے ہمارے تو بھاگ جاگ اٹھیں گے اگر آپ نے غریب کے گھر میں قدم رکھا۔ پر مہاراج بات کیا ہوگئی ہے۔" جوشی نے پوچھا اور کنہیا لال نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"باؤلا ہی ہوا ہے بالکل' ہم بتا رہے ہیں تجھے کہ ایک حادثہ ہوا ہے ہمارے ساتھ اور سب کچھ ہمارے دماغ سے نکل گیا ہے۔ پھر بھی پوچھ رہا ہے کہ بات کیا ہوئی ہے۔"

"ارے رام' رام' رام' بس عقل ہی کی تو کمی ہے مہاراج ورنہ وارے نیارے نہ ہوتے۔ آپ چنتا نہ کریں غریب کی کٹیا آپ کے چرنوں سے آباد ہو جائے گی تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

پھر بقیہ راستہ بھی طے ہو گیا اور دیال چند اور کنہیا لال اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کنڈی بجائی تو پاروتی نے دروازہ کھولا اور کلکلاتی آواز سے بولی۔

"شکر ہے بھگوان کا تم گھر تو آئے۔ ارے بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں گھر سے

بھاگے بھاگے پھرتے ہو۔ کوئی کلموہی نظر آگئی ہے کیا۔ بہانہ کر کے جاتے ہو کہ منڈی جا رہا ہوں اور راتوں کو واپس آتے ہو۔ تین تین مسٹنڈیاں گھر میں بیٹھی ہیں۔ بھگوان تمہارا ستیاناس کرے کم از کم جوان بیٹیوں کا تو خیال کیا کرو۔" جوشی کا منہ بار بار کھل رہا تھا اور بند ہو رہا تھا۔ وہ بیوی کو بتانا چاہتا تھا کہ باہر کوئی موجود ہے لیکن پاروتی کی یہی عادت تھی کہ خاموش رہی تو خاموش رہی اور بکنا شروع ہوئی تو آنکھیں بند کر کے بکنے لگتی تھی۔

"اب اندر بھی آنے دے گی یا نہیں؟"

"آجاؤ' آجاؤ سب کچھ پکا رکھا ہے۔ تین تین ہیں پر جوانی ٹوٹی پڑ رہی ہے ان پر جوانی کے بوجھ سے تھک گئی ہیں۔ میں کہتی ہوں ان کا ہوگا کیا آخر۔"

"دروازے پر ہی پوچھ لے گی کیا؟ اندر تو مر۔" دیال چند کو بھی غصہ آگیا اور اچانک ہی پاروتی کو یوں محسوس ہوا جیسے دیال چند کے پیچھے بھی کوئی ہے۔ چھوٹے قد کی مالک تھی پھر ویسے بھی باہر تاریکیاں پھیل چکی تھیں۔ پاؤں اچکا کر دیال چند کے پیچھے جھانکا اور ایک دم سے شرمندہ سی ہو گئی۔

"ہرے رام ہرے رام۔ کون ہے ساتھ؟"

"تو اندر جا کر مرے گی یا میں تجھے دھکا دوں۔" دیال چند غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ پاروتی کو پھر جوش چڑھا تھا لیکن کسی کی موجودگی کا خیال کر کے پیچھے ہٹ گئی اور دیال چند ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"اس کی چنتا نہ کریں مہاراج پاگل ہے سسری۔ بولنے کا مرض ہے بولتی ہے تو اس کی بک بک رکتی ہی نہیں۔ آپ آئیے........ آئیے۔" کنہیا لال اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس نے ان دونوں کی باتوں پر غور نہیں کیا تھا۔ کہنے لگا۔

"تیرا گھر کتنا بڑا ہے دیال چند! مجھے ایک ایسی جگہ دے جہاں میں تھوڑا وقت اکیلے گزار سکوں۔"

"آئیے مہاراج آئیے۔ اری او پشپا! چندرا! چھوٹا کمرہ خالی کر دو مہاراج کے لئے چلو بیٹا جلدی کرو۔" پشپا اور چندرا دونوں دیال چند کی بیٹیاں تھیں۔ چھوٹا کمرہ انہی تینوں کے لئے تھا اور وہ یہاں زمین پر بستر بچھا کر سویا کرتی تھیں۔ دیال چند نے پھر کہا۔

"چندرا وہ بڑا پلنگ اندر ڈال دے اور اس پر بستر کر دے۔ آئیے مہاراج آپ تھوڑی دیر یہاں بیٹھئے۔"

کنہیا لال تجسس بھری نگاہوں سے گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ لمحے کے بعد چندرا نے

آکر کہا۔

"بستر بچھا دیا ہے پتا جی۔"

"آیئے آیئے۔" دیال چند نے کہا۔ کنہیا لال نے نگاہ اٹھا کر بھی چندرا کو نہیں دیکھا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے کہا۔

"سنو دیال چند! ایک بات تمہیں خاص طور سے بتا دوں۔ مہمان بنا کر لائے ہو گھر میں' مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے برت رکھا ہوا ہے جو مہینوں کا ہے۔ نہ کھانا چاہئے نہ پانی۔ مجھے پریشان مت کرنا۔ میں جتنے دن بھی تمہارے گھر میں رہا' رہوں گا اور اس کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا' خاص طور سے یہ بات کہے دیتا ہوں کہ باہر میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا جب تک میں نہ کہوں۔ اگر تم میری عزت کرتے ہو تو میرا یہ مان رکھنا۔ دوسری بات بھی میں تمہیں بتا دوں۔ اگر تم نے میرے کہے کے خلاف کچھ کیا تو سمجھ لو اپنے نقصان کے ذمے دار خود ہو گے۔"

"آپ کا حکم ہی کافی ہے مہاراج! آپ چنتا نہ کریں ہم کسی کو آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ پر یہ آپ نے بڑی عجیب کہی مہاراج کہ آپ نے اتنا لمبا برت رکھا ہوا ہے۔ آپ کو نقصان نہیں پہنچے گا؟"

"اگر ہم مر جائیں تو خاموشی سے ہماری لاش باہر پھنکوا دینا۔ مرنے سے پہلے ہم سے بہت زیادہ ہمدردی کا اظہار مت کرو اور اچھے لوگ وہی ہوتے ہیں اور فائدہ انہیں ہی ہوتا ہے جو بات مانیں۔"

"جی مہاراج' جی مہاراج۔" دیال چند نے کہا۔

"بس اب جاؤ۔ ہم دروازہ اندر سے بند کریں گے۔ کنڈی لگی ہے نا؟"

"جی مہاراج۔"

"بہت بہت دھن واد اب تم جاؤ۔" کنہیا لال نے کہا اور دیال چند گردن لٹکائے باہر نکل آیا۔ پاروتی باہر ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دیال چند نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے باہر صحن میں آنے کا اشارہ کیا۔ صحن بڑا وسیع اور کشادہ تھا اور اس میں کئی املی کے درخت لگے ہوئے تھے جن کی گھنی چھاؤں نے پورے صحن کو ڈھکا ہوا تھا۔ دیال چند اس چھوٹے کمرے سے کافی دور آ گیا۔ بڑے کمرے میں تینوں لڑکیاں گھر پھر کر رہی تھیں۔ ایک اور کمرہ تھا جسے ضرورت کی چیزوں کے لئے بنایا گیا تھا۔ املی کے آخری درخت کے پاس پہنچ کر دیال چند نے کہا۔

"تیری بہت زیادہ بولنے کی عادت نے مجھے تو ادھ مرا کر دیا ہے۔"

"زہر نہیں ملتا تمہیں' کہیں سے لا کر دے دو چھٹی ہو جائے گی۔ آرام سے جینا۔"

"یہ بھی نہیں سوچتی کہ کوئی ساتھ ہے۔"

"ارے سوچنے کو تو بہت کچھ سوچتی ہوں میں' کون جواب دے مجھے' کسے پکڑ لائے ہو' اور لا کے کمرے میں گھسا لیا ہے۔ عقل نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ کیا ہمارے گھر میں اتنی ہی فراغت ہے کہ مہمان لا کر رکھے جائیں۔ میں تو بس صبح سے اٹھی ہوں تو بھگوان ہی کو یاد کر رہی ہوں کہ ہے بھگوان! کیا ہو گا ہمارا' جینا حرام ہو گیا ہے۔ ہر وقت خوف میں ڈوبی رہتی ہوں۔ جوان بچیوں کا گھر ہے۔ آج تک کہیں سے کوئی رشتہ نہیں آیا۔ غریب کے گھر میں کون جھانکے اور لڑکیاں ہیں کہ ستا رہی ہیں۔ رام' رام' رام۔"

"یہ ساری باتیں اسی وقت کرنے کو رہ گئی ہیں' پہچانتی ہے کہ کون ہے یہ جو ہمارے ساتھ آیا ہے؟"

"دن تک میں کم نظر آنے لگا ہے مجھے۔ آنکھوں کی روشنی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ بھلا رات کے اندھیرے میں کسی کو پہچانوں گی؟"

"بیوقوف! ٹھاکر کنہیا لال ہیں یہ۔ تجھے پتہ ہے نا بہت بڑے زمیندار ہیں۔"

"تو یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"بس تُو ایک کام کر۔ تیری تو زبان چلتی ہے تو رکنے کا نام نہیں لیتی۔ ذرا اپنی زبان کو قابو میں رکھ۔ دو چار دن رہیں گے ہمارے پاس۔ کچھ بیمار ہو گئے ہیں بیچارے' پھر اس کے بعد چلے جائیں گے۔ مگر بابا تیرے ساتھ اپنی عزت کو قائم رکھنا سنسار کا سب سے مشکل کام ہے۔"

"عزت' عزت' عزت۔ پتہ نہیں کہاں کی عزت ہے تمہاری اور کون کرتا ہے تمہاری عزت۔ دو کوڑی کا سمجھتے ہیں لوگ' ارے ان دنوں جس کی جیب میں رقم ہوتی ہے اس کی عزت ہوتی ہے۔ باقی کون کسی کو پوچھنے والا ہے۔"

"اب زبان بند بھی رکھے گی یا بھونکے جائے گی؟"

"بند رکھتی ہوں زبان' مجھے کیا کرنا ہے جو دل چاہے کرو۔ اب کیا چاہئے ان کے لئے؟"

"جلدی سے کچھ کھانے پینے کو ہو تو کر دے۔ مگر سن' ضرورت نہیں ہے اس کی ایک بار پھر جا کر پوچھتا ہوں مہاراج سے۔ کھانے پینے کے لئے تو منع کر رہے تھے۔

کہہ رہے تھے کہ لمبا برت رکھا ہے۔ کچھ کھائیں گے پئیں گے نہیں۔ اتنا لمبا برت کہاں ہوتا ہے۔ چلو دیکھتا ہوں جاکر پر تُو بچیوں کو سنبھال کر رکھ۔ بہت بڑے آدمی ہیں یہ۔ بڑی ذمے داری ہے۔ سندر لال ٹھاکر کا نام سنا ہے نا؟"

"ہاں' ہاں سنا ہے۔"

"پتا ہیں ان کے' سندر لال اور مہندر لال دونوں کے پتا ہیں۔ بڑی بات ہے بھائی ان کی۔"

"مگر تم یہاں کیوں لے آئے انہیں اور یہ اپنی حویلی چھوڑ کر ہمارے جھونپڑے میں کیسے آگئے؟"

"بس ہوسکتا ہے بھگوان کو کچھ سوجھی ہو ہم پر نظر کرنے کی۔"

"کیا مطلب؟"

"اب مطلب وطلب سب بعد میں بتاؤں گا۔ ٹھہر' پوچھ کر آتا ہوں ان سے کھانے پینے کے لئے۔ تُو اندر جا۔ کم از کم میرے لئے تو کھانا بنانا ہی ہوگا۔"

"بھاجی ترکاری بنی رکھی ہے۔ پہلے ہو آؤ۔ کوشش کرنا اس وقت بات ٹل ہی جائے۔ زیادہ کچھ نہیں پکایا میں نے۔ صرف تمہارے حصے کا ہے ہم لوگ تو کھا چکے ہیں۔"

"اور یہ تُو کیا فضول باتیں کرتی ہے کہ کوئی ٹل گئی ہوگی۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ جوان بیٹوں کی موجودگی میں ایسی باتیں کرتی ہے اور اب اس عمر میں بھلا ایسی کوئی فضول بات میں سوچ سکتا ہوں۔"

"مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ آخری عمر میں بھی بہک سکتے ہیں۔" پاروتی نے منہ بنا کر کہا اور پاؤں پٹخ کر ایک طرف چلی گئی۔ دیال چند اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہری مرچ ہے سسری' ہری مرچ۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور پھر اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جس میں اس نے کنہیا لال کو پہنچایا تھا۔

کنہیا لال نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ دیال چند نے دو تین بار دستک دی لیکن دروازہ نہیں کھلا تھا۔ وہ خاصی دیر وہاں کھڑا رہا اور اندر کی آہٹیں لینے لگا لیکن اندر بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے شانے ہلائے اور واپس آگیا۔ پھر دوسرے دن صبح کو وہ وہاں پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دیال چند اندر چلا گیا۔ کنہیا لال پلنگ پر پاؤں سکوڑے بیٹھا ہوا تھا۔ دیال چند نے دونوں ہاتھ جوڑے تو کنہیا لال چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"بڑی مہربانی بھئی تیری۔"

"مہاراج ناشتہ نہیں کریں گے؟"

"ہم نے جو کچھ کہا ہے بالکل ٹھیک کہا ہے تجھ سے۔ لمبا برت رکھا ہوا ہے میں نے جب تک ہم خود تجھ سے کھانے پینے کے لئے نہ مانگیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصل میں کوئی ایسا ہی چکر چل گیا ہے۔ معلوم کرے گا تو پتہ چل جائے گا۔ ہم بیمار ہوگئے تھے۔ وہ سسرے سمجھے کہ ہم مرگئے ہیں۔ سب ارتھی بنا کر لے گئے ہماری شمشان گھاٹ اور اگر ہم ارتھی سے کود کر چپ چاپ بھاگ نہ جاتے تو انہوں نے تو ہمیں جلا ہی دیا تھا۔"

"نہیں۔" دیال چند کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں رے۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پر ایک بات سن اب بھی ہم تجھ سے یہی کہیں گے کہ بتانا نہیں کسی کو کہ ہم تیرے پاس یہاں موجود ہیں۔ من چاہے تو خاموشی سے جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لینا۔"

"مگر مہاراج.........."

"بھول گئے ہیں۔ ہم سب کچھ بھول گئے ہیں۔ اب تُو نے ہی ہمیں کنہیا لال کہہ کر پکارا ہے تو ہمیں یاد آگیا کہ ہمارا نام کنہیا لال ہے۔ اس سے آگے کچھ یاد نہیں ہے۔ تو ہمیں بتا کنہیا لال کون ہے۔ ہمارا مطلب ہے کہ ہم کون ہیں۔ بیٹھ جا اگر تجھے جلدی نہیں اور اگر کہیں جارہا ہے تو جا لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے ویسا ہی کرنا اور یہ بات ہم تجھ سے کہے دے رہے ہیں کہ تُو نے ہمارے کہے کے خلاف کیا تو سمجھ لے کہ جان سے گیا۔ وہ نحوست آئے گی تیرے گھر پر کہ تیرے لئے رونے والے نہیں ملیں گے۔"

"نہیں۔ مہاراج آپ نے مجھے جو حکم دے دیا تو بس میں اسی کے مطابق کروں گا۔ بھلا مجھے کیا پڑی ہے جو آپ کے کہے کو ٹالوں۔ پر کبھی کبھی یہ خیال آجاتا ہے آپ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"یہی تو ہم تجھ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ بڑے آدمی ہیں ہم۔ ذرا ہمیں ہمارے بارے میں بتا اور سن' نہ منہ پھاڑنے کی ضرورت ہے نہ پلکیں جھپکانے کی۔ جو کچھ کہہ رہے ہیں اگر کر سکتا ہے تو وہ کر ہمیں ہمارے بارے میں بتا۔"

"جو آگیا مہاراج کی۔ آپ کا نام کنہیا لال ہے۔ بڑی حویلی کے رہنے والے ہیں' آپ کے پرکھوں سے یہ حویلی آپ کی ہے۔ آپ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ چار بچوں کی شادی کر چکے ہیں آپ۔ چھوٹا بیٹا جوگندر لال ملک سے باہر ہے آپ کی دونوں

بیٹیوں کے ساتھ۔ باقی سندر لال اور مہندر لال آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ ہمیں حویلی کے حالات اور نہیں معلوم۔"

"اچھا تیری دکان ہے نا کپڑے کی؟"

"جی مہاراج۔"

"کس وقت جاتا ہے اور کس وقت چھٹی کرتا ہے؟"

"بس مہاراج یہاں کے بازار تو شام کو چھ بجے بند ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد تو چھٹی ہی چھٹی ہے۔"

"اکیلا بیٹھتا ہے دکان پر یا کوئی اور بھی ساتھ ہے؟"

"بس تین بیٹیاں ہیں مہاراج بیٹا کوئی بھی نہیں ہے۔ چھوٹی موٹی سی آمدنی ہے۔ گھر والی لڑتی رہتی ہے ہمیشہ کہ بیٹیوں کو بیاہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے ہمارے پاس۔ دیکھو بھگوان کیا بندوبست کرتا ہے۔"

"آج تجھے ایک کام کرنا ہے۔"

"آپ حکم دیں۔"

"جب دکان بند کرے تو اس کے بعد ذرا حویلی کی طرف چلے جانا اور معلومات کرنا لوگوں سے کہ کنہیا لال کا کیا ہوا؟"

"ٹھیک ہے مہاراج جیسا آپ حکم دیں۔"

"بس جو کچھ تجھ سے کہہ رہا ہوں وہ کر لینا۔ ہو سکتا ہے اس میں تیرا فائدہ ہی ہو۔"

"جی۔"

"جا۔ گھر والی سے کہہ دینا کہ اگر ہمارا دروازہ بند ہو تو دروازہ بجانے کی کوشش نہ کرے۔"

"میں کہہ دوں گا مہاراج۔" دیال چند نے کہا اور پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆======☆======☆

حویلی ہنگاموں کا گھر بنی ہوئی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ سندر لال کو وید جی سے یہ پتہ چل چکا تھا کہ بڑے مہاراج کو زہر دیا گیا ہے۔ تھوڑے ہی دن پہلے کی بات تھی کہ ٹھاکر کنہیا لال نے سندر لال سے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا تھا اور کہا تھا۔

"سندر بیٹا! انسان کا جیون اس پر کب بھاری پڑتا ہے؟"

سندر لال نے چونک کر باپ کو دیکھا اور بولا۔ "جیون تو کبھی بھاری نہیں ہوتا پتا جی!

کیوں' آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟"

"بیٹا! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میری ذات سے تم لوگوں کو کیا تکلیف پہنچتی ہے؟ میں تو ایک کونے میں پڑا رام نام جپتا ہوں' اس کے باوجود سنسار والے مجھے جینا نہیں دیکھنا چاہتے۔"

"وہ کون ہیں پتا جی؟" سندر لال نے پوچھا اور کنہیا لال کے چہرے پر عجیب سے غم کے تاثرات پیدا ہو گئے۔ بہت دیر تک وہ سوچتا رہا پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"برا ہوتا ہے بیٹا انسان کے ساتھ بوڑھی عمر میں۔ کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا وہ' پتہ نہیں باہر سے آنے والوں کے من میں اندر رہنے والوں کی عداوت کیوں جاگ اٹھتی ہے۔ بیٹا میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اور مہندر بھی مجھے یہ بتا دو کہ میری ذات سے تمہیں کیا تکلیف پہنچتی ہے۔ اپنی اپنی دھرم پتنیوں سے بھی پوچھو۔ وہ مجھے صرف بتا دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ انہیں تکلیف نہ پہنچے۔ جو سازشیں یہ لوگ کرتے ہیں وہ مجھے دکھ دیتی ہیں۔ بھگوان کی سوگند! اگر تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں تو تم ایسا کرو میرے لئے بندوبست کر دو۔ میں کہیں چلا جاؤں گا۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں پتا جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ہمارے سر کا تاج ہیں۔ آپ ایک بار صرف یہ بتا دیجئے کہ وہ کون لوگ ہیں یا آپ کو کس کی طرف سے شبہ ہے؟"

"میں تمہیں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں سندر لال! ہو سکتا ہے مجھے اس سنسار سے ہٹانے کی کوشش کی جائے۔"

سندر لال نے باپ کو دیکھا تھا اور سوچا تھا کہ پتا جی کی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ بعض لوگ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عجیب سے احساسات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے پتا جی کے من میں بھی ایسی ہی کوئی بات بیٹھ گئی ہو۔ ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ بہرحال وہ دلاسے دینے کے بعد خاموش ہو گیا تھا لیکن پھر یہ واقعہ ہو گیا۔ البتہ سندر لال ارتھی سے لاش کے غائب ہو جانے کے بعد بڑی عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ شمشان گھاٹ سے واپس آنے کے بعد بہت سے لوگوں کے ذہن میں بہت سے سوالات تھے۔ وہ سندر اور مہندر سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ بستی کے معززین بھی تھے کچھ رشتے دار بھی' لیکن بات سب کی آنکھوں کے سامنے کی تھی۔ ارتھی سب کے سامنے ہی تیار ہوئی تھی اور سب اصولوں کے مطابق اسے شمشان گھاٹ لے گئے تھے لیکن اس کے بعد لاش کا اچانک

غائب ہوجانا کیا معنی رکھتا ہے۔ البتہ وہاں سے واپس آتے ہوئے ایک ایک لمحے اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ پتہ تو چلایا جائے کہ آخر راستے میں لاش کہاں غائب ہوگئی لیکن بھلا کوئی نشان ملتا ہے۔ حویلی واپس آگئے اور اس کے بعد سندر لال اور مہندر نے اپنے آپ کو روپوش کرلیا۔ لوگوں کے سوالوں کے جواب میں دونوں نے ایک ہی بات کہی تھی۔

"بھائیو! آپ لوگوں کو علم ہے جو کچھ ہوا ہے وہ بھگوان ہی جانتا ہے۔ آپ لوگ بھی دماغ لڑائیے ہم تو ویسے ہی دماغی طور پر ختم ہوگئے ہیں۔ کوئی ایک بات جو سمجھ میں آرہی ہو۔ اول تو مہاراج کی موت اور پھر یہ عجیب وغریب واقعہ۔ ہم پر تو غشی طاری ہورہی ہے۔ بھگوان کے لئے آپ لوگ اس وقت ہمیں سوالات کا نشانہ نہ بنائیں۔ ہاں اگر ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم ہوسکا تو ہم آپ کو ضرور بتائیں گے۔"

البتہ رات کو سندر لال نے وید جی کو بلوا لیا تھا۔ ہری لال جی ان لوگوں کے پرانے ساتھی تھے۔ ہر اچھے برے کے شریک اور ایک طرح کے مشیر۔ ہری لال جی خود بھی اتنے ہی پریشان تھے جتنے یہ لوگ۔ وہ سندر لال کے کمرے میں پہنچ گئے۔ سندر لال نے اس وقت مہندر کو بھی نہیں بلایا تھا۔ جو کچھ اس کے دل میں تھا وہ بڑا عجیب سا تھا اور وہ اس سلسلے میں ہری لال جی سے ہی بات کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی بیوی کوشل کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ وید جی سے کیا باتیں کرنے والا ہے۔ ویسے گھر کی عورتوں کو بھی ساری صورت حال معلوم ہوگئی تھی اور وہ تھوڑی سی خوفزدہ ہوگئی تھیں۔ جب وید جی کمرے میں پہنچ گئے تو سندر لال نے دروازہ بند کرلیا۔ وید جی کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"کوئی خاص بات معلوم ہوتی ہے سندر جی۔"

"نہیں وید جی خاص بات بس یہ ہے کہ اب میرا دماغ ہی پھٹ جائے گا۔ کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ کوئی پتہ نہیں چلا ہے۔ بس ایسے ہی دیوانگی طاری ہوگئی ہے مجھ پر۔ وید جی! میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں حاضر ہوں چھوٹے مالک۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟ اس واقعہ سے آپ کس طرح واقفیت کا اظہار کرسکتے ہیں؟ اچھا چلئے چھوڑیئے یہ بتائیے مجھے۔ آپ نے پوری طرح پتا جی کو چیک کیا تھا۔ آپ پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ان کی موت واقع ہوگئی تھی؟"

"مہاراج! پوری ارتھی بھی آپ کے سامنے ہی تیار ہوئی ہے۔ اور پھر یہ تو بڑی

ذمے داری کی بات ہوتی ہے کہ کسی کی موت کی تصدیق یا تردید کی جائے۔ میں اپنی ساری عمر کے تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ مہاراج کنہیا لال کا دیہانت ہوچکا تھا اور ان میں کوئی جیون جوت باقی نہیں تھی۔"

"تو پھر آخر لاش کہاں گئی اور وہ بھی اتنے سارے لوگوں کے سامنے' بس وید جی! یوں سمجھئے کہ دماغ کی رگیں پھٹنے کو ہیں۔"

"واقعہ تو ایسا ہی ہے پر ایک بات اب بھی میرے من میں سوال بنی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے اسی بات سے لاش کی گمشدگی کا بھی تعلق ہو۔"

"کیا؟" سندر لال نے گہری نگاہوں سے وید جی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بات میری پہنچ سے اونچی ہے۔ پر ہمدرد ہوں آپ کا' جیون میں آپ کے ساتھ بہت کچھ کھایا پیا ہے۔ اپنی محبت سے یہ بات کر رہا ہوں۔ پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ مہاراج کنہیا لال کو زہر کس نے دیا۔"

"وید جی! آپ سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دن پہلے پتا جی نے مجھ سے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔"

"تو پھر دوسری بات آپ مجھ سے بھی سن لیجئے۔ انہیں چھوٹی بہو رانی کے بھائیوں پر شک تھا۔ راج شری جی کے دونوں بھائی آخر یہاں حویلی میں کیوں رہتے ہیں اور پھر آپ نے انہیں دیکھا بھی ہوگا۔ حلیے سے ہی لفنگے معلوم ہوتے ہیں۔ کسی کام کے نہ کاج کے۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہ کرتے کیا ہیں یہاں۔ معاف کرنا چھوٹے مالک! اپنی اوقات سے بڑھ کر بول رہا ہوں۔ پر ایک دفعہ کنہیا لال مہاراج نے کہا تھا کہ ہری لال انسان کبھی کبھی اپنے ہی گھر میں بے بس ہوکر رہ جاتا ہے۔ مالک کہہ رہے تھے کہ دو تین بار انہوں نے ان لوگوں کو چوروں کی طرح حویلی سے باہر جاتے ہوئے دیکھا ہے اور اس وقت حویلی کی بہت سی قیمتی چیزیں ان کے پاس ہوا کرتی ہیں۔ ایک بار مالک نے انہیں پکڑ بھی لیا تھا اور وہ کوئی مناسب جواب نہیں دے پائے تھے۔ پر مالک بڑے دل والے تھے۔ انہوں نے راج شری جی کو بھی اس بارے میں نہیں بتایا اور ان لوگوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ پاگلو! یہ دھن دولت تھوڑے دن ساتھ رہتا ہے اور اس کے بعد منش کے پاس کچھ نہیں رہ جاتا۔ عزت بڑی چیز ہے میں یہ بات کسی سے نہیں کہوں گا لیکن تم ایسا نہ کرو۔ بہو بیٹیوں کی مانند ہوتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی کو میری کسی بات سے دکھ پہنچے۔ تم اسے کیوں دکھ پہنچا رہے ہو۔ پھر ایک بار بڑے مالک نے دوبارہ مجھ سے اس موضوع پر بات کی

اور کہا کہ ہری لال راج شری کو اس کے بھائیوں نے یہ تفصیل بتا دی ہے اور ان لوگوں کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت کے نقوش پیدا ہو گئے ہیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

سندر لال کے چہرے پر غیض و غضب کے آثار پھیل گئے تھے۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بھگوان کی سوگند! اگر یہ بات ہے تو میں ان دونوں کتوں کو زندہ جلا دوں گا۔"

"ایسے نہیں۔ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے یہ تو پتہ چلے کہ مہاراج کی لاش کہاں گئی۔"

"سمجھ میں نہیں آتا یہ کیسے پتہ چلے گا۔" سندر لال نے گہری سانس لے کر کہا پھر وہ ہری لال سے بولا۔

"ہری لال جی۔ آپ اس سلسلے میں مجھے اکیلا نہ چھوڑیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ میں اس وقت کس کیفیت کا شکار ہوں۔"

"میرے لائق جو بھی کام ہو اس میں آپ چنتا نہ کریں۔" ہری لال نے دلسوزی سے کہا۔

"نہیں ہری لال جی۔ آپ یہ نہ کہیں کہ آپ کے لائق جو کام ہو میں آپ کو وہ بتاؤں اور آپ اسے کریں۔ دیکھئے ہری لال جی! میں کوئی بڑی بات نہیں کہنا چاہتا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنے آپ کو بڑا اکیلا محسوس کرتا ہوں۔ بے شمار لوگ ہیں آپ کو خود پتہ ہے لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس سے میں کھل کر دل کی بات کہہ سکوں۔ آپ سے میرا ایسا ہی سمبندھ ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے آپ چنتا نہ کریں میں اپنی بھرپور کوشش کروں گا کہ ان پُراسرار واقعات کا سراغ لگاؤں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" ہری لال چلا گیا تو سندر لال خواب گاہ میں واپس آ گیا۔ یہاں اس کی بیوی کوشل اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سرخ و سفید رنگت کی مالک کوشل کے چہرے پر بھی پیلاہٹ بکھری ہوئی تھی۔ سندر لال اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ اس نے کوشل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟ تم کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہی ہو۔" کوشل نے محبت بھری نگاہوں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! میرے سر کا تاج تو آپ ہی ہیں اگر آپ پریشان ہوں گے تو آپ کا خیال کیا ہے کیا مجھے اطمینان ہو گا؟"

"کوشل! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پتا جی کا اچانک ہی دیہانت ہوا اور اس کے بعد ارتھی سے ان کی لاش غائب ہو گئی۔ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ اتنے سارے لوگوں کے بیچ لاش کا غائب ہو جانا ہی بڑی عجیب بات ہے۔ لوگ نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں ہمارے بارے میں۔ پتا بھی نہیں چل رہا۔ بہرحال دیکھنا تو پڑتا ہی ہے۔"

"برا تو نہیں مانیں گے ایک بات کہوں؟"

"بالکل برا نہیں مانوں گا۔ اس وقت مجھے ہمدردوں اور ساتھیوں کی ضرورت ہے۔"

"آپ اتنے پریشان ہیں۔ کیا آپ مندر کو بھی اتنا ہی پریشان دیکھ رہے ہیں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے راج شری' اس کے دونوں بھائی گووند اور چوکھا کو ہنس بول کر باتیں کرتے دیکھا ہے۔ جیسے انہیں کسی چیز کی پرواہ ہی نہ ہو' اور تھوڑی دیر کے بعد دیور جی بھی آ گئے اور ان کے ساتھ ہنسی خوشی میں شریک ہو گئے۔ آپ مجھے بتائیں کیا سارے جہان کا درد آپ ہی نے اپنے سینے میں سمیٹ لیا ہے؟"

"میرے پتا جی کی بات ہے۔ اگر وہ لوگ بے حس اور پتھر ہو گئے ہیں تو میں تو نہیں پتھرایا۔ میرے من میں تو ان تمام واقعات کا بڑا خیال ہے۔ بتاؤ تم ہونا چاہئے یا نہیں؟"

"بالکل ہونا چاہئے۔ پر کوئی اوپائے ہے اس کا؟"

"کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے اگر پتا جی کی ارتھی اپنے ہاتھوں سے جلا دیتا تو یہ سکون تو ہو جاتا کہ چلو' بن باپ کے ہو گیا ہوں۔ اب تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔" سندر لال کے چہرے پر غم کے آثار پیدا ہو گئے اور کوشل نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک بیوی کی جانب سے محبت کا بس اتنا ہی اظہار ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے بات ایسی انوکھی تھی کہ کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆-------☆-------☆

"تیرا ستیاناس منٹھڑی ہتھیاری' پھول پھول کر کپا ہوئی جا رہی ہے۔ جوانی ہے کہ کمان میں چڑھے تیر کی طرح نکل پڑنے کو تیار۔ باپ کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے کہ تیرا منہ کالا کر دے۔ ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے جان جاتی ہے تیری' اٹھ رہی ہے صبح سے بستر پر۔ ابھی وہ جاگیں گے اور چیخنا شروع کر دیں گے کہ ناشتہ لاؤ۔ ناشتے میں کوکلے دوں گی ان انھیں۔ نہ آٹا ہے نہ گھی اور ادھر وہ شور مچائیں گے۔ اری میں کہتی ہوں

اٹھتی ہے یا نہیں۔ آٹا تیرا خصم پیسے گا آکر۔ اٹھتی ہے یا دوں کمر پر لات۔" پاروتی نے ایک ہی سانس میں ساری کہانی سنا ڈالی اور اوشا نے ایک بھرپور انگڑائی لی' پاروتی نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس انگڑائی میں جو طوفان امنڈ رہے تھے اس کی آنکھیں انہیں دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ اوشا پرسکون انداز میں منہ چلانے لگی اور بولی۔

"صبح ہوگئی ماتا جی؟"

"صبح ہوگئی ماتا جی۔" پاروتی دیوی منہ ٹیڑھا کرکے بولی۔ "اری موت پڑی سورج سر پر چمک رہا ہے اور تو صبح کو رو رہی ہے۔ اٹھ جا آٹا پیس لے' اناج چکی کے پاس رکھا ہوا ہے۔ جلدی کر میں چولہا جھونک لوں۔ گیلی لکڑیاں لاکر رکھ دی تیرے باوا نے میرے سر پر۔ ایسے مردوں کو تو سنسار میں آنا ہی نہیں چاہئے اور آ بھی مرے تو میرے ہی سر پر مصیبت آنی تھی۔ کہیں اور جا مرتے پگڑ باندھ کر۔ کالک لگے ان ترکیبوں کے منہ پر جو بر کی تلاش میں میرے ہی گھر پر آکر مرے تھے۔ اور ستیاناس ہو جائے میرے ماتا پتا کا جنہوں نے آنکھیں بند کرکے مجھے ایسے نکھٹو کے پلو سے باندھ دیا۔ ارے کیا کروں کیا نہ کروں۔ دن بھر کپڑا پھاڑتے اور بیچتے ہیں اور ملتے ہیں اناج کے چند دانے کہ تن پر ہے تو پیٹ میں نہیں اور پیٹ میں ہے تو تن ڈھکنے کے لالے پڑے ہیں۔"

اوشا اس پوری کہانی سے بے خبر دونوں بہنوں کو جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی' بالوں میں کنگھی کی' دیوار پر لگے ہوئے چھوٹے سے شیشے میں خود کو دیکھا اور مطمئن ہوکر کونے میں رکھی چکی کی طرف بڑھ گئی۔ چکی کے پاس پڑی پیڑھی پر بیٹھ کر اس نے اناج کے دانے چکی میں ڈالے اور چکی چلانے لگی۔ چکی کے دونوں پاٹ بج رہے تھے اور رسوئی سے پاروتی کی بڑبڑاہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ ساری رسوئی میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ یہ تو روزانہ کا معمول تھا۔ صبح کو مرغے کی اذان کے بجائے پاروتی دیوی کی یہ رام کہانی سنائی دیا کرتی تھی اور مرغا تو ادھر دور دور تک نہیں تھا لیکن پاروتی دیوی کی یہ کہانی احساس دلاتی تھی کہ صبح ہوگئی۔ اگر کبھی اتفاق سے پاروتی دیوی کی یہ تقریر نہیں ہوتی تو کم از کم اس گھر میں تو صبح نہیں ہوتی تھی۔ چکی کے دونوں پاٹ گنگنا رہے تھے اور اوشا کی چوڑیاں بج رہی تھیں۔ سفید سفید آٹا پیتل کی پرات میں جمع ہو رہا تھا کہ اچانک اوشا کے ہاتھ رک گئے۔ وہ ایک دم خوفزدہ ہوگئی۔ دروازے میں کنہیا لال نظر آیا تھا۔

"آٹا پیس رہی ہو بیٹی!" کنہیا لال کی نرم آواز ابھری اور اوشا نے جلدی سے دوپٹے کا پلو سر پر ڈال لیا۔

"ج.........جی' جی مہاراج۔" وہ دہشت بھری آواز میں بولی۔

"نہیں نہیں بیٹا! تم اپنا کام کرو۔ بس ایسے ہی چکی کی یہ آواز مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ اس لئے اٹھ کر تمہارے پاس آ گیا۔" کنہیا لال واپسی کے لئے مڑ گئے لیکن پیچھے دیال چند کھڑا ہوا نظر آیا۔ کنہیا لال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تو دیال چند دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"جے رام جی کی مہاراج۔ جاگ گئے آپ' ضرور چکی کی آواز نے آپ کو جگا دیا ہوگا۔"

"ارے نہیں' دیال چند ہم تو صبح بہت جلدی جاگ گئے تھے۔ اپنے کمرے میں پڑے سوچ رہے تھے کہ تم لوگوں کو تو ہماری وجہ سے بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔"

"نہیں مہاراج یہ تو ہمارے بھاگ ہیں کہ آپ جیسے مہان پرش نے ہم لوگوں کو عزت دی ہوئی ہے۔ ورنہ ہم اس قابل کہاں۔"

"ہوں۔ دیکھو تمہیں تھوڑے دن تک ہمیں برداشت کرنا ہوگا۔ کچھ ایسے کام ہیں ہمارے جو ہم کرلیں تو یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"مہاراج آپ ایسی باتیں بار بار نہ کریں۔ میں تو بس یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ نے اتنا لمبا برت رکھا ہوا ہے۔ نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں کہیں کوئی تکلیف نہ ہوجائے آپ کو بھگوان نہ کرے۔"

"تم بالکل چنتا نہ کرو۔ ہم اپنے ذمے دار خود ہیں بس ہم تم سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری سوچیں کہاں چلی گئیں۔ آؤ بیٹھو اگر ابھی دکان پر نہیں جارہے ہو تو تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھو۔ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں ہم۔"

"جی مہاراج۔"

"آؤ۔ باہر کھلے علاقے میں بیٹھتے ہیں۔"

اور پھر دونوں وہاں سے نکل کر اسی جگہ چلے گئے جہاں ایک درخت گھنی چھاؤں کر رہا تھا۔ اس کے نیچے چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ کنہیا لال جی چارپائی پر بیٹھے تو دیال چند جوشی زمین پر بیٹھنے لگا۔

"یہ کیا؟"

"نہیں مہاراج! ہر شخص کی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ آپ کے ساتھ بیٹھ کر میں.........."

"تمہیں دیال چند ہمارے پاس بیٹھو۔"

"نہیں مہاراج! بھگوان کے لئے مجھے اس پر مجبور نہ کریں۔" دیال چند نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ دیال چند تم ہمیں کنہیا لال مہاراج کہہ کر پکار رہے ہو۔ جبکہ ہم اپنا سب کچھ بھول گئے ہیں۔ کچھ بھی یاد نہیں رہا ہے ہمیں۔ ہماری یادداشت نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں یاد دلاؤ ممکن ہے ہمیں ساری باتیں یاد آجائیں۔"

"میں تو بڑی مشکل سے ضبط کئے ہوئے ہوں مہاراج ورنہ میرا من تو چاہ رہا ہے کہ جلدی سے آپ کے گھر جاکر آپ کے بیٹوں کو آپ کے بارے میں اطلاع دوں۔ پر یہ سوچتا ہوں کہ آپ یہ نہ سوچیں کہ میں آپ کو اپنے آپ پر بھاری سمجھ رہا ہوں۔ ارے میں کیا میری اوقات کیا۔ اتنا غریب ہوں مہاراج کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"ہمیں یاد دلاؤ۔ ہمیں ہمارے بارے میں یاد دلاؤ۔ ہمیں بتاؤ اگر ہم کنہیا لال ہیں تو کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں ایک بار پھر ہمیں ہمارے بارے میں تفصیلات بتاؤ۔ دیال چند ہو سکتا ہے ہم تمہارے لئے بھی کار آمد ہوں۔" دیال چند نے یہ آخری آواز سنی یا نہیں سنی لیکن بہرحال وہ معصومیت سے کنہیا لال کو اس گھر کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا اور کنہیا لال خاموشی سے یہ سب کچھ سنتا رہا۔ جب دیال چند خاموش ہوگیا تو کنہیا لال نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں کیوں، پتہ نہیں کیوں ہمیں کچھ یاد نہیں آتا۔ خیر آجائے گا۔ ہم تمہیں پریشان تو نہیں کر رہے۔ تمہاری دھرم پتنی ہماری وجہ سے خاصی پریشان معلوم ہوتی ہے۔"

"آپ اس کی چنتا نہ کریں مہاراج آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ عورت میں عقل کم ہوتی ہے۔ بس اسی طرح بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہے۔ پر آپ اس کی چنتا نہ کریں۔"

کنہیا لال خاموش ہوگیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس چلا گیا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ دیال چند دکان پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ جب وہ تیار ہوگیا تو پاروتی اس کے سامنے پہنچ گئی۔

"سنو۔ آخر یہ مصیبت کب تک ہم پر نازل رہے گی۔ ایک کمرہ گھر گیا ہے۔ جوان لڑکیاں گھر میں موجود ہیں۔ ایک آدمی کا اس طرح گھر میں گھسے رہنا کیا اچھی بات ہے۔"

"بھگوان تجھے عقل دے۔ بھگوان تجھے عقل دے اور کیا کہوں میں تیرے لئے

ایسی بے عقل عورت میں نے جیون بھر نہیں دیکھی۔ کتنی بار سمجھا چکا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ بوڑھا آدمی ہے کسی بھی طرح تم لوگوں کے لئے نقصان دہ نہیں ہو سکتا دوسری بات یہ کہ اتنا بڑا آدمی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ کیا سمجھیں ہوش میں رہو میں نے آج تک تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی لیکن اگر تم نے اتنا زیادہ میرے معاملے میں گھسنے کی کوشش کی تو مجبوراً مجھے تمہارے ساتھ برا سلوک کرنا پڑے گا۔ یہ آخری بات ہے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ چلتا ہوں۔"

دوپہر کو دیال چند دکان سے گھر کھانا کھانے کے لئے آیا تو یہاں اس نے تماشا ہی نیا دیکھا۔ پاروتی زمین پر بیٹھی کراہ رہی تھی اور تینوں لڑکیاں اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دیال چند دوڑ کر پاروتی کے پاس پہنچ گیا اور اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"کیا ہوا، کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں پتا جی۔ کمر میں موچ آگئی ہے۔ پاؤں پھسل گیا تھا گر گئیں۔ کمر میں موچ آگئی۔"

"ارے، ارے، یہ تو برا ہوا۔" دیال چند نے بیوی کو اٹھایا۔ پاروتی ہائے ہائے کرتی رہی۔ شام تک اس کی ہائے ہائے نہیں رکی تھی۔ دیال چند بھی کافی دیر میں دکان پر گیا تھا اور جلدی دکان بند کر کے واپس آگیا تھا۔ کنہیا لال بدستور اپنے کمرے میں موجود تھا اور اس نے اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ رات گزر گئی دوسرا دن بھی گزر گیا لیکن پاروتی کی کمر کی تکلیف دور نہ ہوئی۔ کمر میں چک آگئی تھی۔ پھر پڑوس کی عورت پاروتی کو دیکھنے آئی تو اس نے کہا۔

"پاروتی۔ جو کچھ بھی علاج کر رہی ہو وہ تو کرو ہی مگر تم ایسا کرو غلام شیر کو بلا لو کمر پر لات مارے گا تو چک ٹھیک ہوجائے گی۔ وہ پائیل ہے۔"

"لو اب کمر پر لات بھی لگواؤں گی جانکی بہن! ویسے ہی سسری کی کمر ٹیڑھی ہو رہی ہے۔" دیال چند نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے بھیا دیال چند! سچ کہہ رہی ہوں۔ ایک لات مار دیتا ہے ہلکی سی، کمر ٹھیک ہوجاتی ہے۔ محلے میں کسی سے پوچھ لو اور پھر یہ تو بڑکھوں کی کہی ہوئی بات ہے۔ الٹے پیدا ہونے والے بڑی انوکھی صفتوں کے مالک ہوتے ہیں۔"

"تو ذرا بلا لاؤ جاکر خود ہی کریم شیر کے بیٹے کو۔" دیال چند نے کہا اور جانکی دیوی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں لاتی ہوں بلا کر۔ کریم شیر تو بڑا اچھا ہے۔ سارے محلے والوں کے کام آتا ہے۔ کوئی ایک بات کہہ دو اس سے تو سمجھ لو کہ پیچھے لگ جاتا ہے۔"

"پر لالچی بھی بہت ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ خیر ہمیں اس سے کیا۔ تم ذرا جاکر اس کے بیٹے غلام شیر کو بلا لاؤ۔"

غلام شیر کی عمر تقریباً تیرہ چودہ سال تھی۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ بہترین شکل و صورت کا تندرست اور توانا لڑکا تھا۔ کریم شیر کی اولاد تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اکثر لوگ ہنس کر کریم شیر سے کہا کرتے تھے۔

"کریم شیر! لڑکا کہاں سے اغوا کیا ہے بتا تو دے کم از کم؟"

"ارے بھیا........ بس تمہاری محبت ہے۔ سسرا دو کوڑی کا ہے۔ نہ پڑھ کر دیتا ہے نہ لکھ کر۔ کتنی کوشش کی کہ پڑھ لکھ دے۔ پر بھیا کسی کے قابو میں آنے والا کہاں ہے۔ کہتا ہے ابا میں پڑھا لکھا ہوں تم میرا امتحان لے لو۔ اب بتاؤ میں کیا امتحان لوں گا۔"

بہرحال جانکی دیوی غلام شیر کو بلا لائی اور غلام شیر نے پاروتی کی کمر پر ہلکی ہلکی تین بار لات ماری۔ پاروتی کو ایک دم یوں لگا جیسے درد غائب ہوگیا ہو۔ اس نے حیرت سے غلام شیر کو دیکھا تھا۔

"بتاؤ چاچی اب دو چار لاتیں اور کھاؤ گی؟" غلام شیر نے شرارت سے کہا۔ پاروتی کی تکلیف میں اگر کوئی کمی نہ ہوئی ہوتی تو اس بات پر چڑ کر عادت کے مطابق نہ جانے کیا کیا سنا دیتی لیکن حیرت انگیز بات ہوئی تھی۔ ہنس کر بولی۔

"ہاں اور کیا کرے گا لاتیں ہی تو مارے گا تو چاچی کو۔"

"تو اور کیا کرے گا ماتا جی! شکل سے ہی گدھا لگتا ہے۔" پشپا مسکرا کر بولی۔

"گدھا نہیں گھوڑا۔" چندرا نے بھی ہنس کر کہا اور غلام شیر وہاں سے چلا گیا۔ کمرے کے دروازے پر کنہیا لال کھڑا عجیب سی نگاہوں سے جاتے ہوئے غلام شیر کو دیکھ رہا تھا۔ جب پاروتی اٹھ کر کھڑی ہوگئی تو دیال چند نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے بھائی! ایسی بھی دوائیں ہوا کرتی ہیں۔"

لیکن رات کو جب دیال چند کھانے پینے سے فراغت حاصل کرکے صحن میں درخت کے نیچے بیٹھا حقہ پی رہا تھا' کنہیا لال اس کے پاس پہنچ گیا اور دیال چند جلدی سے چارپائی سے اٹھ گیا۔

"بیٹھے رہو دیال چند بیٹھے رہو۔"

"آپ آیئے مہاراج! مہاراج کچھ کھا پی لیجئے آپ کو بھگوان کا واسطہ۔"

"دیکھو دیال چند مجھ سے ایسی بیکار باتیں مت کیا کرو۔ بھگوان کا واسطہ۔ مجھے بھگوان سے کیا واسطہ۔" کنہیا لال کے لہجے میں ایک عجیب سی نفرت رچی ہوئی تھی لیکن دیال چند سیدھا سادہ آدمی تھا کنہیا لال کے لہجے میں چھپی ہوئی نفرت کو نہ سمجھ سکا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں تو صرف اس لئے کہتا ہوں........."

"اب میں یہاں سے چلا جاؤں گا دیال چند میرا خیال ہے تم مجھے اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتے۔"

"نہیں مہاراج! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

"تو پھر یہ بیکار باتیں مت کیا کرو مجھ سے۔ کہو کیا حویلی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟"

"نہیں مالک! ہم تو دکان پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ آپ کہیں تو جاکر معلومات حاصل کریں۔"

"نہیں ایسے نہیں۔ جیسے میں تمہیں بتاؤں گا ویسا کرنا۔ ویسے آج میں نے یہ عجیب تماشا دیکھا ہے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا تماشا میری نگاہوں کے سامنے نہیں آسکا۔"

"کون سا تماشا مہاراج؟"

"اس لڑکے نے تمہاری دھرم پتنی کی کمر پر لاتیں ماریں اور وہ سیدھی کھڑی ہوگئی جب کہ اس سے پہلے وہ ہائے ہائے کرکے سارا گھر سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔"

"مہاراج! وہ پاگل ہے اور محلے بھر کے لوگوں کی اس طرح مدد کرتا رہتا ہے۔"

"کون ہے وہ' کس کا لڑکا ہے' کیا کرتا ہے؟"

"مہاراج! اس کے پتا کا نام کریم شیر ہے۔ مسلمان لوگ ہیں۔ بشن بیری میں مسلمان زیادہ ہیں۔ پہلے کسی زمانے میں جب ہندوستان پاکستان نہیں بنا تھا۔ تو یہ علاقہ مکمل طور پر ہمارا تھا لیکن پاکستان بننے کے بعد یہاں کے زیادہ تر ہندو ہندوستان چلے گئے اور اب ہم بہت تھوڑے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ پر مہاراج ان لوگوں سے ہمیں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ کریم شیر بذات خود ایک بہت اچھا آدمی ہے۔ اب یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ ہماری آبادیوں میں بارش وغیرہ نہیں ہوتی۔ سوکھے ریگستان چٹیل زمینیں پڑی ہیں چنانچہ

یہاں غریب بہت زیادہ ہیں اور اگر بدنصیبی سے کسی کے چار چھ بچے زیادہ ہوں تو سمجھ لیں مہاراج اس کے ہاں تو بھوک کا ڈیرا ہے۔ بیچارہ کریم شیر بھی محنت مزدوری کرتا ہے۔ مگر وہی بات ہے کہ تن کو ہے تو پیٹ کو نہیں اور پیٹ کو ہے تو تن کو نہیں ہے۔ چار بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں اس کے۔ آٹھ بچوں کا ساتھ ایک بیوی اور ایک وہ خود۔ آپ بتائیے کہاں سے پہنے کہاں سے کھائے۔ یہ ہے اس بیچارے کی کیفیت۔"

"لڑکے کا نام کیا ہے؟"

"غلام شیر۔"

"اس کا نمبر کون سا ہے بہن بھائیوں میں؟"

"سب سے بڑے دو بھائی ہیں پھر ایک بہن ہے اس کے بعد چوتھے نمبر کا ہے وہ باقی بھائی بہنوں میں۔"

"ہوں۔ بہت غربت ہے ان کے ہاں؟"

"ہاں مہاراج۔"

"ٹھیک۔ تم سے کچھ بات کریں گے مگر ابھی نہیں۔ تمہاری پریشانی دور کرنا چاہتا ہوں میں۔"

"مہاراج بس آپ کی دیا چاہیے۔ محبت کی نگاہوں سے دیکھ لیں ہمیں۔ سمجھ لیں سب کچھ مل گیا۔"

"ہوں۔ اب میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جو کہہ رہا ہوں میری بات سنو اور جیسا میں کہہ رہا ہوں ہوشیاری سے ویسا ہی کرنا۔"

"جی مہاراج! ٹھیک ہے۔"

"تو پھر سنو اور غور سے سنو۔" کنہیا لال دیال چند کو مدھم لہجے میں کچھ سمجھاتا رہا اور دیال چند گہری گہری سانسیں لے کر سنتا رہا۔ پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر گردن ہلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج! جیسا آپ کا حکم۔"

☆======☆======☆

سندر لال کے دل میں یہ بات نہ جانے کیوں جڑ پکڑ چکی تھی کہ گووند اور چوکھا اس کے باپ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور وہی کوئی ایسی سازش کر رہے ہیں جو بعد میں ان لوگوں کے لئے خطرناک ثابت ہوگی لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انہیں یہ

نہیں پتا چل سکا تھا کہ کنہیا لال جی کی لاش کہاں غائب ہوگئی۔ پھر اس دن سندر لال حویلی سے اپنی موٹر میں نکلا تھا کہ تھوڑے فاصلے پر اسے ایک شخص ہاتھ اٹھائے کھڑا نظر آیا۔ سیدھا سادہ مقامی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور سندر لال نے گاڑی رکوا دی۔

"کیا بات ہے بھائی! مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہو کیا؟ مجھ سے کوئی کام ہے؟"

"جی مہاراج۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"بولو کیا کام ہے؟"

"آپ کا تھوڑا سمے لیں گے مہاراج!"

"اس وقت تو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم اگر چاہو تو شام کو میرے پاس آسکتے ہو۔ حویلی میں آجانا۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"نام ہمارا دیال چند جوشی ہے مہاراج! پر بات ایسی ہے کہ آپ کو ابھی ہماری بات سن لینی چاہیے۔"

"تو پھر بتاؤ۔ ایسی کیا بات ہے؟"

"مہاراج! اکیلے میں بات کرنی ہے آپ سے۔"

"اچھا بھئی ٹھیک ہے۔ چلو ڈرائیور تم ذرا گاڑی بند کر کے یہاں سے دور چلے جاؤ اور دیکھو دیال چند ذرا جلدی سے مجھے بتا دو کہ کیا بات ہے۔ مجھے ایک ضروری جگہ پہنچنا ہے۔"

ڈرائیور اتر کر دور چلا گیا تو دیال چند نے قریب آکر کہا۔ "مہاراج! ہم بزاز ہیں۔ کپڑے کا بیوپار کرتے ہیں۔ منڈی پر ہماری دکان ہے۔"

"ٹھیک۔ پھر؟"

"مہاراج! بات ایسی اہم ہے کہ ہم آپ کو فوراً بتائے دیتے ہیں۔ آپ جانے کی جلدی جلدی کر رہے ہیں۔ اگر ہماری بتائی ہوئی بات سے زیادہ ضروری کوئی کام ہے آپ کو تو بے شک آپ چلے جائیے۔"

"بھائی! بات تو بتاؤ۔" سندر لال نے کہا۔

"مہاراج کنہیا لال ہمارے پاس ہیں۔" دیال چند کی آواز بم دھماکے سے کم نہیں تھی۔ سندر لال شدید سنسنی کا شکار ہوگیا۔ ایک لمحے تک تو دیال چند کے الفاظ ہی اس کی سمجھ میں نہیں آسکے لیکن جب اس نے دیال چند کے الفاظ پر غور کیا تو کانپ کر بولا۔

"کیا کہا تم نے پھر سے کہو۔ کیا کہہ رہے تھے؟"

"مہاراج کنہیا لال ہمارے پاس ہیں۔ ہمارے گھر میں رہ رہے ہیں وہ آج کل۔"

"کک.......... کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"کمال ہے مہاراج! آپ اسے بکواس کہہ رہے ہیں۔ آپ دیکھ لیجئے اگر یہ بکواس ہے تو بکواس ہی سہی۔"

سندر لال جلدی سے گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا۔ اس نے ایک نگاہ ڈرائیور پر ڈالی اور پھر دیال چند کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف بڑھتا ہوا بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو جوشی مجھے ایک بار پھر سے بتاؤ۔ تمہارے الفاظ اس قدر سنسنی خیز ہیں کہ میرا پورا وجود کپکپا کر رہ گیا ہے۔ بھگوان کے لئے مجھے بتاؤ تم کہہ کیا رہے ہو؟"

"کنہیا لال آپ کے پتا جی ہیں ناں سندر لال جی۔ آپ ہمیں نہیں جانتے پر ہم تو آپ کو جانتے ہیں اور ہم مہاراج کنہیا لال کو بھی جانتے ہیں۔ کنہیا لال جی اس وقت ہمارے گھر میں ہیں۔ دو دن سے وہیں ہیں۔ آج تیسرا دن ہے اور ہم آپ کو ان کے بارے میں بتانے آئے ہیں۔"

"مگر.......... وہ.......... میرا مطلب ہے کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان کا دیہانت ہو چکا ہے؟"

"ایں۔" دیال چند کے بدن میں بھی کپکپی دوڑ گئی۔ ایک لمحے کے اندر اندر اسے گزرے ہوئے تمام واقعات یاد آ گئے۔ کنہیا لال اسے مرگھٹ کے کنارے بیٹھا ہوا ملا تھا اور اس کے بعد اس نے عجیب وغریب باتیں کی تھیں اور اس کے ساتھ آ گیا تھا لیکن پھر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ کنہیا لال تو اس کے پاس موجود ہے۔ سندر لال کو ضرور کوئی دھوکا ہوا ہے۔

"آپ عجیب باتیں کر رہے ہیں مہاراج! ہم آپ سے کہہ رہے ہیں ناں کہ وہ ہمارے پاس موجود ہیں آپ چاہیں تو چل کر دیکھ سکتے ہیں۔"

"کہاں ہے تمہارا گھر؟" سندر لال نے پوچھا۔

"بس وہ برگد والی پلیا کے پیچھے ہمارا چھوٹا سا جھونپڑا ہے سرکار۔"

"مگر بتاؤ تو سہی کنہیا لال تمہیں کہاں ملے تھے؟"

"مہاراج! بس ایسے ہی ہم اپنی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے تو وہ ٹہلتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے اور ہم نے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ ہم انہیں پہچانتے تھے مہاراج۔ اتنے بڑے

ٹھاکر کنہیا لال کو بھلا کون نہ پہچانتا۔ ہم نے ان سے جل پانی کے لئے پوچھا تو کہنے لگے کہ نہیں بھائی میں ایک مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ جل پانی نہیں چاہئے۔ بس تھوڑے دن کے لئے اپنے گھر میں پناہ دے دو۔ ہم نے ان کے چرن چھو کر کہا کہ مہاراج اتنے بڑے آدمی ہیں آپ۔ ہمارا جیون حاضر ہے آپ کے لئے' آپ پناہ کی بات کر رہے ہیں۔ بس ہم انہیں اپنے گھر لے آئے اور اس وقت سے ان کی سیوا کر رہے ہیں۔"

"اچھا۔ اس وقت بھی وہ تمہارے گھر میں موجود ہیں؟"

"ہاں مہاراج۔"

"اور تم نے دو دن سے مجھے اطلاع نہیں دی۔"

"مہاراج ان کی سیوا کرنا چاہتے تھے ہم۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو مجھے اپنے گھر لے چلو لیکن ایک بات سمجھ لینا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں پستول کی چھ گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔"

"ارے نہیں مہاراج! ہم کیا گڑبڑ کریں گے؟ غریب آدمی ہیں بس محبت سے مہاراج کی سیوا کی تھی۔"

"آؤ آؤ بیٹھو گاڑی میں۔" سندر لال نے کہا اور پھر وہ ڈرائیور کو اشارہ کرنے لگا۔ یہ بات سننے کے بعد باقی ضروری کام ختم ہو جاتے تھے۔ دیال چند' سندر لال کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا۔ ویسے یہ تھوڑا سا جھوٹ اس نے کنہیا لال کے کہنے پر بولا تھا۔ کنہیا لال نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے یہ نہ بتائے کہ وہ اسے مرگھٹ پر ملا تھا اور بس یہ کہہ دے کہ وہ اس کی دکان پر آیا تھا۔ بہرحال دیال چند نے اپنا یہ کام بخوبی سرانجام دیا تھا اور سندر لال کے ذہن میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یقینی طور پر کوئی بہت ہی پُراسرار معمہ حل ہونے والا ہے۔ ہلکے سے خوف کا احساس بھی اس کے دل میں تھا۔ اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس ساری پُراسرار کہانی کا پس منظر کیا ہے۔ ٹھاکر صاحب کو اگر زہر دے کر مار دیا گیا تھا تو کیا وہ زندہ بچ گئے تھے اور اگر بچ گئے تھے تو اپنی زندگی کا اعلان کرنے کے بجائے انہوں نے ارتھی پر سے فرار ہونا کیوں ضروری سمجھا تھا۔ یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں اور اس وقت وہ شدید ذہنی بحران کا شکار ہو کر اس شخص کے ساتھ اس کے گھر جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ راستے سے ہری لال کو اپنے ساتھ لے لے' لیکن گھر کے معاملات جس قدر کم لوگوں کی زبان تک پہنچیں' زیادہ اچھا ہے۔ اس وقت جو ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا' وہ اس کا وفادار

اور اہم ساتھی تھا اور پھر ویسے بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ چنانچہ اس نے ڈرائیور کا رسک لے لیا تھا لیکن اس کا ذہن شدید ہیجان کا شکار تھا۔ یہ سارا معمہ سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں دیال چند جوشی کا مکان تھا۔ گاڑی رک گئی۔ دیال چند جوشی نے سندر لال کو اپنے ساتھ لیا اور گھر کے اندر پہنچ گیا۔ باہر درخت کے نیچے چارپائی پر کنہیا لال بیٹھا ہوا تھا۔ سندر لال نے اسے دیکھا اور دوسرے لمحے اس کے حلق سے درد بھری چیخ نکلی۔

"پتا جی مہاراج' پتا جی مہاراج۔" یہ کہہ کر وہ دوڑا اور کنہیا لال سے جا کر لپٹ گیا' وہ زارو قطار رو رہا تھا۔ کنہیا لال کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ سندر لال روتا رہا۔ دیال چند کافی فاصلے پر منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جب سندر لال کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو اس نے کہا۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ پتا جی! کیوں چلے گئے تھے' کیا ہوا تھا آپ کو؟ پتا جی آپ تو......... آپ تو' مارے گئے تھے آپ تو' کس نے زہر دیا تھا آپ کو' بتایئے تو سہی۔ پتا جی میرے پتا جی بتایئے!" سندر لال باپ کے سینے سے سر رگڑنے لگا لیکن کنہیا لال خاموشی سے بیٹھا سندر لال کو دیکھ رہا تھا۔ خاصی دیر اس انداز میں گزر گئی تو سندر لال نے باپ کا چہرہ دیکھا۔ کنہیا لال اسے حیران سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم سندر لال ہو نا؟" سندر لال چونک پڑا۔ کنہیا لال کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے سندر لال روتا ہوا بولا۔

"آپ مجھے نہیں پہچان رہے پتا جی! آپ کا سندر ہوں میں سندرا کہتے ہیں آپ مجھے۔"

"ہاں۔ سندرا! ہم......... مگر میں کون ہوں؟ کون ہوں میں؟ تم سندرا ہو اور وہ ایک اور ہے نا۔ کیا نام ہے اس کا' مہندرا۔ مگر میں کون ہوں؟"

"کیا ہو گیا ہے پتا جی آپ کو۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا۔ جوشی ادھر آؤ۔ میرے پاس آؤ جوشی۔" سندر لال نے دور کھڑے ہوئے دیال چند کو آواز دی اور دیال چند دوڑتا ہوا ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔

"دیکھو پتا جی تو کچھ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ مجھے بھی پہچانتے ہیں مہندرا کو بھی جانتے ہیں۔ پر اپنے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ خود کون ہیں؟"

"بس مہاراج! میں نے آپ کو شاید بتایا تو تھا۔ اگر نہیں بتایا تو میں بھول گیا ہوں گا۔

ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ پوچھ رہے تھے کہ یہ کون سی بستی ہے۔ بستی کا کیا نام ہے' ان کا اپنا کیا نام ہے۔ بس مہاراج ہم تو پہچانتے تھے اپنے مہاراج کو' بڑی مشکل سے ہم نے سنبھال کر رکھا ہے۔"

"اوہ بھگوان' ان کے دماغ پر اثر ہوا ہے۔ دیال چند میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔ تم نے بڑی مدد کی ہے میری۔ میرے پتا جی کو تم نے اتنا سنبھال کر رکھا ہے۔ تمہارا یہ اپکار میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ لے جا رہا ہوں میں اپنے پتا جی کو یہاں سے لے جا رہا ہوں۔"

"مہاراج! ہم تو آپ کے داس ہیں۔ جیسا آپ کا حکم۔" سندر لال نے جیب سے چند نوٹ نکال کر دیال چند کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خرچہ ہوا ہو گا پتا جی پر۔"

"نہیں مہاراج! آپ کی دیا ہے۔ نہیں' ہر چیز کا مول نہیں دیتے مہاراج برا لگتا ہے۔ آپ بھی ایسا نہ کریں۔"

"بہت بہت شکریہ تمہارا۔ بہت بہت شکریہ۔" سندر لال نے کنہیا لال کو سہارا دیا اور اس کے بعد وہ کنہیا لال کو باہر لایا۔ گاڑی میں بٹھایا اور اسے لے کر چل پڑا لیکن راستے میں اسے ایک خیال آیا تو اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"ایسا کرو وید جی کی طرف گاڑی لے چلو۔" تھوڑی دیر کے بعد گاڑی ہری لال کے گھر کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور ہری لال کو بلانے کے لئے چلا گیا اور ذرا سی دیر میں ہری لال ہانپتا کانپتا ہوا آ گیا۔ وہ ایسے ہی پوچھتا چلا آیا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے لیکن جیسے ہی اس کی نگاہ کنہیا لال پر پڑی وہ حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا۔ پھر اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

"بڑے بڑے' بڑے مہاراج۔"

"اندر آؤ وید جی! اندر آ جاؤ۔" سندر لال نے کہا اور ہری لال اس کے پاس آ بیٹھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کنہیا لال کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"مگر مہاراج یہ......... یہ........."

"عجیب و غریب بات ہوئی ہے۔ میں انہیں ایک شخص دیال چند جوشی کے ہاں سے لا رہا ہوں۔" سندر لال نے مختصر الفاظ میں وید جی کو ساری تفصیل بتا دی اور ہری لال کا منہ [illegible] حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"اور کوئی بات کی بڑے مہاراج نے راستے میں؟"

"نہیں بالکل خاموش سے ہیں۔ اپنے بارے میں پوچھتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ ہری لال کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ میں انہیں سیدھا گھر لے جاؤں۔ یہ بات تو میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کے دلوں کو دھچکے لگیں گے۔ مجھے تو بالکل نہیں پتا چل سکا ہے ابھی تک کہ آخر یہ ارتھی سے کیسے غائب ہوگئے۔ سارے کریا کرم کرے تھے ہم نے۔ نہلایا دھلایا تھا انہیں' اور اس سمے ان کے اندر زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔"

"لو میں خود شریک تھا۔ اس کام میں پھر بھگوان کی لیلا بھگوان ہی جانتا ہے۔" ہری لال کی آوز لرز سی گئی۔ شاید کوئی اور خیال اس کے دل میں آیا تھا اور اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے کنہیا لال کو دیکھا تھا اور پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کہیں کوئی بری آتما نہ ہو جو کنہیا لال کے وجود میں سرایت کر گئی ہو لیکن سندر لال جس طرح جذباتی نظر آرہا تھا اس کے تحت اس بات کا اظہار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا ورنہ شامت ہی آجاتی۔ ادھر سندر لال اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں تم سے یہی مشورہ کرنے آیا ہوں ہری لال کہ میں انہیں سیدھا گھر لے جاؤں یا کہیں اور لے جاکر رکھوں؟"

"کہیں اور لے جاکر رکھنے کی ضرورت نہیں ہے مہاراج! پر ایک بات ہے آپ ان پر پہرہ رکھئے۔ کہیں ان کے دشمن انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ کسی کو ان سے نہ ملنے دیجئے۔ کسی کو بھول کر بھی یہ نہ بتایئے کہ ان کا دماغی توازن کچھ خراب ہوگیا ہے۔"

"ایسا کرو ہری لال تم میرے ساتھ چلو۔"

"نہ........ نہ مہاراج! نہیں' بالکل نہیں اگر میں اس سمے آپ کے ساتھ جاؤں گا تو آپ کو تو خیر کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن ہوسکتا ہے لوگ مجھے دیکھ کر پکڑ لیں۔ میرا مطلب ہے وہ جنہوں نے کنہیا لال مہاراج کو زہر دیا تھا۔ میری گردن تو آسانی سے ناپی جاسکتی ہے وہ لوگ میری گردن پکڑ کر مجھے یہ بتانے پر مجبور کریں گے کہ بڑے مہاراج کہاں سے حاصل کئے گئے۔ آپ سوچ لیں جیسا آپ کا حکم ہو۔"

"نہیں........ یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہے۔ تو پھر میں انہیں لے کر چلتا ہوں' باقی تو خیر کوئی فکر کی بات نہیں ہے تم تھوڑی دیر کے بعد آجانا۔"

"ہاں۔ وہ میں آجاؤں گا۔" ہری لال نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد ہری لال اتر کر اندر چلا گیا اور سندر لال کنہیا لال کو لے کر حویلی کی طرف چل پڑا۔ اس کی نگاہیں بار بار

کنہیا لال کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ بیٹے باپ سے بہت محبت کرتے تھے اور جو کچھ بیتی تھی اس پر وہ بڑے حواس باختہ تھے لیکن بہرحال اب کنہیا لال مل گیا تھا۔ راستے میں بہت سی باتیں سندر لال نے سوچی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ حویلی میں داخل ہوگیا۔ پھر حویلی میں جس نے کنہیا لال کو سندر لال کے ساتھ نیچے اترتے دیکھا' اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار پھیل گئے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے اس کا کریا کرم کرکے اسے شمشان پہنچایا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا وہ ناقابل یقین تھا اور اب ایک بار پھر کنہیا لال حویلی واپس آگیا تھا۔ چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی۔ جو محبت کرنے والے تھے وہ دیوانوں کی طرح دوڑ پڑے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے حیرانی سے دور دور سے دیکھنے پر ہی اکتفا کیا اور کچھ ایسے بھی تھے جن کی حالت خراب ہوگئی۔ بہرحال سارے کے سارے جمع ہوگئے تھے۔ سندر لال کی بیوی کوشل تو آکر لپٹ ہی گئی تھی۔ البتہ راج شری ذرا دور دور سے دیکھتی رہی تھی۔ سوالات کی بوچھاڑ بھی ہوگئی تھی۔ مہندر لال بھی تھوڑی دیر کے بعد کہیں سے آیا تھا اور یہاں اس نے اپنی محبت کا اظہار بھی کیا تھا۔ بے شک سندر لال مہندر لال سے زیادہ باپ کا شیدائی تھا۔ بہرحال سندر لال سے طرح طرح کے سوالات کئے گئے۔ سندر لال نے صرف ایک ہی جواب دیا۔

"اصلیت تو بھگوان ہی جانتا ہے لیکن میں نے پتا جی کو راستے میں سڑک پر جاتے ہوئے پایا اور انہیں پہچان لیا۔ یہ اپنی یادداشت کھو چکے ہیں۔ پوچھتے ہیں میں کون ہوں؟ بہرحال میں نے ہری لال کے پاس آدمی دوڑا دیا ہے۔ وہ پہنچتا ہی ہوگا۔"

"ارے چھوڑو بھیا جی! آپ کیسی بات کرتے ہو۔ ہری لال معمولی سا وید ہے وہ کیا پتا جی کی بیماری کا پتہ چلا سکے گا۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں۔ شہر لے چلتے ہیں پتا جی کو۔"

"بات سنو' مہندر! ہری لال معمولی سا وید ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ہمارے سارے پریوار کا علاج کرتا رہا ہے۔ مجھے اس پر اعتبار ہے۔"

"لیکن مجھے اس پر اعتبار نہیں ہے بھیا جی۔"

"میں اس سلسلے میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کروں گا۔" سندر لال نے آخری لہجے میں کہا اور مہندر لال خاموش ہوگیا۔ البتہ تنہائی میں راج شری نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"کیا ہے یہ سب کچھ؟ بڑے بھیا ہماری بات کو تو ایسے ٹال دیتے ہیں جیسے ہمارا اس

گھر سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ کس بری طرح سے وید جی کے معاملے میں تمہیں جھڑک دیا۔ صحیح طرح سے یہ تک نہیں بتایا کہ آخر پتا جی ملے کہاں سے ہیں۔ کیا ہم لوگ اتنے ہی گئے گزرے ہیں۔ یہ تو بری بات ہے۔" مندر لال خاموش ہوگیا تھا۔ بہرحال ہری لال بھی آگیا اور اس کے بعد وہ لوگ کنہیا لال کا جائزہ لینے لگے۔ کنہیا لال اپنے بارے میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ کسی کو کیا بتاتا۔ وید جی نے اپنے طور پر الٹے سیدھے علاج شروع کر دیئے تھے۔ یہ بات مکمل طور پر خفیہ راز میں تھی کہ پہلی بات تو یہ کہ کنہیا لال کو ہوا کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ وہ کہاں غائب ہوگیا تھا۔ کون بتاتا یہ سب کچھ چنانچہ خاموشی اختیار کرلی گئی۔ تین چار دن کے اندر اندر گھر کے معمولات معمول پر آگئے تھے۔ جو بات سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ ابھی تک نہیں سمجھی جا سکی تھی۔ کنہیا لال کھوئی ہوئی یادداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اکثر وہ اپنے کمرے سے نکل آتا اور پوری حویلی میں بھٹکتا پھرتا۔ بعض اوقات یہ لوگ اس کا تعاقب کرتے اور یہ دیکھتے کہ وہ کیا کرتا ہے کہاں جاتا ہے۔ البتہ سندر لال نے ہری لال کے مشورے پر پوری حویلی کے ایک ایک فرد پر نظر رکھنا شروع کر دی تھی۔ اپنے بہت ہی قابل اعتماد ملازموں کو اس نے ہدایات کی تھیں کہ بالکل خفیہ طریقے سے کنہیا لال جی کا جائزہ لیتے رہیں اور ان کے اطراف میں آتے جاتے والوں پر بھی نظر رکھیں۔ ہو سکتا ہے کوئی کنہیا لال جی کو دوبارہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ بہرطور یہ ساری کی ساری باتیں اپنی جگہ تھیں۔ کنہیا لال اپنے طور پر وقت گزار رہا تھا۔ پھر اس شام تھوڑی سی تبدیلی ہوئی۔ ہوا یہ تھا کہ ایک درخت کی آڑ میں مندر لال خاموش بیٹھا ہوا سوچوں میں گھرا تھا کہ اسے درخت کے دوسری سمت آہٹیں سنائی دیں اور وہ چونک پڑا۔ اس نے ہلکی سی گردن اٹھا کر دیکھا تو اس کے دونوں سالے گووند اور چوکھا اس طرف آ رہے تھے۔ درخت کے اس طرف ایک بینچ پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس بینچ پر بیٹھ گئے۔ چوکھا نے گووند سے کہا۔

"مگر میں کہتا ہوں تو مرا کیوں جا رہا ہے؟"

"دیکھو چوکھا بھیا۔ زندگی کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہوں۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اس گھر کی دولت اور جائیداد ہماری نہیں ہو جائے گی۔ ہمارا تو بس یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے کام کر کے جو بھی حاصل کر سکتے ہیں وہ حاصل کرلیں۔ آخر ایک دن ہمیں یہاں سے نکل جانا ہوگا لیکن تم یقین کرو میری حالت خراب ہے۔"

"کیوں آخر کیوں؟"

"یار تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ اس بڈھے کھوسٹ کے بارے میں کیا کہتے ہو تم۔ ارے ہم نے اپنے ہاتھوں سے اسے زہر دیا تھا' اور زہر بھی معمولی نہیں تھا۔ جہاں سے ہم یہ لائے تھے' دینے والے نے یہ کہہ کر ہمیں یہ زہر دیا تھا کہ گھوڑے کو بھی پلا دو گے تو مر جائے گا۔ جیتا نہیں بچے گا۔ اس کی ہر بات سچ ثابت ہوئی۔ بظاہر کوئی پتہ نہیں لگ سکا کہ بڈھے کو زہر دیا گیا ہے لیکن بڈھا جیتا بچ گیا اور اب وہ کبھی کبھی ہمیں ایسی نظروں سے گھورتا ہے کہ مانو اب بتانے ہی والا ہے کہ اس کو ہم نے زہر دیا تھا۔ بھیا! میری تو جان ہی نکل جاتی ہے۔ خون سوکھ جاتا ہے میری رگوں میں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں کسی وقت مجھے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اب تو تم سے ایک بات کہوں گا میں اگر تم یہاں رہنا چاہتے ہو تو بے شک رہو۔ تمہاری اپنی مرضی ہے لیکن میں کسی وقت یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ یہاں سے تو اب بھاگ جانا ہی اچھا ہے۔"

"مجھے بھی ڈرا رہا ہے تُو چوکھے۔ میں نے تو کبھی محسوس نہیں کیا کہ بڈھا ہمیں گھور رہا ہے۔"

"اب کوئی کام ایسا ہے کہ تم کرو یا نہ کرو۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"مگر ہم اس کے بعد کہاں جائیں گے؟"

"سنسار بہت بڑا ہے۔ بس ایک بات بتا سکتا ہوں میں تمہیں۔"

"کیا؟"

"میں نے پتا لگایا ہے کہ چھوٹی دیدی کے زیورات کہاں رکھے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہ سارا پتہ لگایا ہے میں نے۔ انہیں لے کر اڑ جاتے ہیں۔ اگر تم ساتھ نہیں دو گے تو تمہاری مرضی ہے۔ میں تو اب بھی یہی بات کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے نکل جانا زیادہ بہتر ہے۔"

"چھوٹی دیدی کے زیورات کا پتہ لگا لیا ہے تُو نے؟"

"تبھی تو ہمت کری ہے۔ کچھ لے کر ہی جائیں گے۔"

"مگر جائے گا کہاں؟"

"یہ یہاں سے نکل جانے کے بعد سوچا جائے گا۔ ایسے جائیں گے کہ کوئی ہمارا پتہ نہ لگا سکے۔ ویسے زیورات بھی لاکھوں روپے کے ہیں۔ کہیں بھی چھوٹی موٹی جگہ جا کر اپنا جیون شروع کر سکتے ہیں ہم۔"

"ہاں۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر تو سوچا جا سکتا ہے یہاں سے جانے کے بارے میں۔"

"تو کیا پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے' میں تو مکمل طور پر اس چکر میں پڑا ہوا ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کب چلو گے یہاں سے؟"

"میں تو کہتا ہوں آج ہی رات۔"

"ٹھیک ہے۔ زیورات کہاں ہیں؟"

"وہ جو مسہری کے نیچے ایک جگہ بنی ہوئی ہے وہاں بڑا سا صندوقچہ رکھا ہوا ہے۔ زیور ہی زیور بھرے ہوئے ہیں اس میں۔"

"کرو گے کیا؟"

"ایسا کرتے ہیں کہ میں شام کے کھانے سے پہلے ہی جا کر مسہری کے نیچے چھپ جاتا ہوں۔ تم حویلی کے پچھلے حصے میں ٹوٹے دروازے کے پاس میرا انتظار کرنا۔ زیورات کا صندوقچہ لے کر میں پہنچ جاؤں گا اور بس تم تیاری کر لینا۔ دونوں نکل چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا کروں گا کہ باہر تانگہ کر لوں گا۔ تانگہ ہمیں یہاں سے لے کر راموگڑھ پہنچا دے گا۔ راموگڑھ کے کوئی سات میل کے فاصلے پر چھوٹا ریلوے اسٹیشن ہے۔ وہاں سے کسی ریل میں بیٹھ کر چل پڑیں گے۔"

"بالکل ٹھیک۔ تانگے کا بندوبست کر لینا تم۔"

"میں کر لوں گا تو پرواہ مت کر۔"

"بس ذرا ہوشیاری سے سارے کام کرنا۔"

"میں نے کہا تم چنتا ہی مت کرو۔" مہندر لال یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس کے پورے بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ اس بات کا شبہ ایک بار سندر لال نے ظاہر کیا تھا کہ یہ دونوں حرام خور چھوٹی موٹی چوریاں کرتے ہیں اور ضرور ان کے ہاتھوں کوئی بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا لیکن مہندر لال نے بھائی سے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ اگر ایسا ہوا تو تمام ہرجانہ وہ خود بھرے گا۔ صاف ظاہر تھا کہ مہندر لال برا مان گیا تھا اس لئے سندر لال بھی خاموش ہو گیا تھا لیکن آج جو کچھ سامنے آیا تھا اس نے مہندر لال کے تن بدن کو دہکا کر رکھ دیا تھا۔ ان کتوں نے کنہیا لال کو زہر دے دیا۔ آخر کیوں؟ اس کی وجہ بھی تو معلوم ہونی چاہئے اور اس کے لئے مہندر لال اپنے ذہن میں بہت سے منصوبے ترتیب دینے لگا۔ سارا پروگرام اس کے علم میں تھا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے کھسک گیا اور ان دونوں کو یہ اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ ان کی شامت اس طرح آ گئی ہے۔ مہندر لال نے اپنے دو خاص آدمیوں کو جو بڑے ہٹے کٹے تھے۔ اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے مخصوص کیا اور ان

سے کہا کہ انہیں ایک اہم کام کرنا ہے لیکن ابھی کچھ اس کے بارے میں بتایا نہیں جا سکتا۔ منصوبہ چونکہ مہندر لال کے علم میں تھا چنانچہ اس نے اپنی منصوبہ بندی الگ سے کر لی۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت جب سب لوگ کھانے کے لئے کھانے کے کمرے میں پہنچ جائیں گے۔ اس وقت گووند یا چوکھا ان کے بیڈ روم میں مسہری کے نیچے چھپ جائیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے اسی وقت ان میں سے کوئی راج شری کے زیورات پر بھی ہاتھ صاف کر دے۔ چنانچہ مہندر لال نے اپنے طور پر ایک موثر منصوبہ بنا لیا تھا اور اپنے دونوں آدمیوں کو خاص ہدایت دے کر مستعد کر دیا تھا۔ غرض یہ کہ رات کے معمول کے مطابق سب کھانے کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ اس وقت گووند موجود نہیں تھا اور چوکھا وہاں تھا۔ راج شری نے چوکھا سے گووند کے بارے میں پوچھا تو چوکھا نے کہا۔

"باہر گیا ہوا ہے دیدی! کہہ رہا تھا کہ کچھ پیٹ میں گڑبڑ ہے کھانا نہیں کھائے گا۔ ذرا لمبا چکر لے کر آتا ہے۔" راج شری خاموش ہو گئی۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مہندر لال نے کہا۔

"راج شری ذرا آؤ میرے ساتھ تم سے کچھ کام ہے۔" رات گئے دس گیارہ بجے تک سب ساتھ ہوا کرتے تھے لیکن آج مہندر بیوی کو لے کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس نے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے لاک کر دیا۔ راج شری سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مہندر لال نے کہا۔

"وہ............ راج شری ذرا سارے زیورات تو نکال کر دو مجھے' جو تم گھر میں پہنتی ہو۔"

"ہیں............ کیا کریں گے آپ ان کا؟"

"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ انہیں دھلوا دوں۔ اصل میں میرا دوست جوہری ہے وہ بڑی اچھی صفائی کرتا ہے زیورات کی۔ جاؤ ذرا نکالو دیکھیں تو سہی کون کون سا زیور میلا ہے۔" راج شری خاموشی سے اس جگہ پہنچ گئی جہاں الماری کے پیچھے ایک چھوٹی سی تجوری بنی ہوئی تھی۔ یہ تجوری خاص طور سے زیورات کے لئے بنائی گئی تھی۔ راج شری نے ایک مخصوص جگہ سے چابی نکالی اور تجوری کھول لی لیکن دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکل گئی۔ اس نے تجوری میں ہاتھ گھمایا لیکن تجوری خالی تھی۔ مہندر لال دور سے بیوی کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ راج شری کی چیخ کی آواز پر

[illegible] نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہ مہندر لال' اس میں تو ایک بھی زیور نہیں ہے۔ بھگوان کی سوگند! کل تو سارے یہیں تھے۔ ہائے رام میرے زیور کہاں گئے؟" راج شری کی آواز بری طرح بھرا گئی پھر وہ باقاعدہ رونے لگی۔

"میں نے یہیں رکھے تھے۔ کل تک سارے زیورات تھے میرے' کون لے گیا' کہاں گئے میرے زیور؟"

"راج شری! تمہارے خیال میں کون لے جا سکتا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم' ہائے رام میرے زیور۔" راج شری بری طرح بلک رہی تھی۔

"چپ ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں آخر زیور کہاں چلے گئے؟"

"میں کہہ رہی ہوں مجھے کیا معلوم۔"

"لیکن۔ مجھے معلوم ہے۔" مہندر لال نے کہا۔

"معلوم ہے۔ کہاں گئے بتایئے۔ کیا آپ ہی نے کہیں چھپا رکھے ہیں۔ ورنہ آپ مجھ سے زیورات کے بارے میں اس طرح پوچھتے کیوں؟"

"ہاں۔ میں نے چھپا دیئے ہیں۔ بتاتا ہوں تمہیں۔" مہندر لال نے کہا اور الماری کی جانب بڑھ گیا۔ پھر الماری کھول کر اس نے پستول نکالا تو راج شری چونک پڑی۔

"یہ.......... یہ پپ.......... پستول' آپ نے کس کے لئے نکالا ہے؟"

"بتاتا ہوں۔" مہندر لال بھرائی ہوئی آواز میں بولا پھر کہا۔ "اتنے عرصے سے مہندر لال کہہ رہے تھے کہ تمہارے یہ دونوں بھائی چور ہیں اور چیزیں چرا کر لے جاتے ہیں' کیا سمجھیں؟ آج مجھے پتہ چلا کہ تم خود ان کی مدد کرتی ہو۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ' شرم نہیں آتی آپ کو' آنکھوں سے دیکھا ہے کسی کو آپ نے؟ الزام لگا رہے ہیں میرے بھائیوں پر۔"

"اور اب تم مجھے بتاؤ گی کہ زیورات کس نے لئے ہیں۔" مہندر لال نے پستول راج شری پر تانتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ میں اپنے ہی گھر میں چوری کروں گی کیا؟ مجھے کیا معلوم کس نے لئے ہیں زیورات۔"

"معلوم ہے تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔ سب ملی بھگت ہے تمہاری۔ اگر نہیں ہے تو بتاؤ مجھے کہ یہ دو مسٹنڈے یہاں کیوں رہتے ہیں؟"

"تو یوں کہئے میرے بھائیوں سے پرخاش ہے آپ کو۔ انہیں یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں صاف صاف کہہ دیتے۔ بھلا کوئی زبردستی کسی کے گھر رہتا ہے۔ وہ تو دونوں میری محبت میں یہاں رہتے ہیں ورنہ کون کسی کے گھر رہتا ہے۔"

"انہیں صرف تم سے ہی محبت ہے راج شری اور کسی سے نہیں۔ جہاں جس گھر میں وہ خود رہتے تھے۔"

"ہاں۔ وہ بچپن ہی سے مجھے زیادہ چاہتے ہیں۔"

"بس اسی لئے میں بھی یہ بات کہہ رہا ہوں کہ چونکہ وہ بچپن سے تمہیں سب سے زیادہ چاہتے تھے اس لئے تم بھی انہیں سب سے زیادہ ہی چاہتی ہو اور ان کی مدد کرنے کے لئے تم نے وہ زیورات خود ان کے حوالے کر دیئے ہیں۔"

"اب میں سر پھوڑ لوں گی اپنا سمجھے آپ' آتما ہتھیا کر لوں گی۔ الزام لگائے جا رہے ہیں مجھ پر۔ میں کہتی ہوں کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟"

"ثبوت اس مسہری کے نیچے ہے۔" آخر کار مہندر لال نے صحیح بات کر ڈالی۔

"کیا مطلب؟"

"چل باہر نکل آ نہیں تو نیچے ہاتھ ڈال کر گولیوں کی بارش کر دوں گا۔ میں نہیں جانتا کہ تو یہاں موجود ہے یا نہیں۔ پر سمجھ کہ اندھا ہو کر گولیاں چلاؤں گا اور اس کے بعد میرا قصور نہیں ہو گا۔" مہندر لال غرائی ہوئی آواز میں بولا اور راج شری تعجب سے اس کی صورت دیکھنے لگی پھر بولی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"گولی چلاتا ہوں میں۔" مہندر لال نے کہا اور مسہری کے نیچے ہاتھ ڈال کر پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

"نکلتا ہوں۔ نکلتا ہوں۔" گووند کی آواز سنائی دی اور راج شری اس طرح اچھل پڑی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نیچے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آ رہے تھے۔

"کک.......... کون ہے' کون ہے؟"

"دو۔" مہندر لال نے گنتی گنی۔

"آ رہا ہوں جیجا جی آ رہا ہوں۔" گووند کی آواز پھر سنائی دی اور اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ مسہری کے نیچے سے نکل آیا۔ پہلے اس کے پاؤں نمودار ہوئے تھے۔ راج شری

دہشت سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ آخر کار گووند نیچے سے نکل آیا۔ راج شری تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گووند کے چہرے پر شدید دہشت کے آثار تھے۔ ایک بار اس نے دروازے کی جانب دیکھا تو مہندر لال نے کہا۔

"ایک قدم دروازے کی طرف بڑھایا تو نے تو تیری ریڑھ کی ہڈی چھ ٹکڑوں میں تقسیم کردوں گا۔"

"ارے دیا رے دیا۔" گووند جلدی سے پلٹ کر دیوار سے جا لگا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور راج شری حیرت سے سکتے میں رہ گئی تھی۔

"کہاں ہے زیور؟"

"پپ......... پلنگ کے نیچے۔" گووند نے جواب دیا اور راج شری پھر اچھل پڑی۔

"چلو بہت زیادہ دہشت زدہ ہونے کی اداکاری مت کرو۔ مسہری کے نیچے گھس کر زیور نکالو' کیا سمجھیں؟" راج شری اپنی جگہ سے نہیں ہلی تو مہندر لال نے پھر پستول کو جنبش دے کر کہا۔

"چل......... زیور کیا اپنے باپ کے لئے رکھ کر آیا ہے وہاں' نکال کر لا۔" آخر کار گووند نے مسہری کے نیچے سے زیور کی پوٹلی نکال لی اور مہندر لال کے اشارے پر اسے خود ہی کھول بھی دیا۔

"یہ ہے ثبوت اور کوئی ثبوت چاہئے۔" راج شری پر غشی طاری ہوگئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی اور پھر وہیں گر کر بے ہوش ہوگئی۔ مہندر لال نے نفرت بھری نگاہوں سے گووند کو دیکھا اور بولا۔

"اور چوکھا تیرا انتظار کر رہا ہوگا۔ کیوں؟"

"مم......... مہاراج' جج......... جیجا جی معاف کر دیجئے آپ کو بھگوان کا واسطہ مجھے معاف کر دیجئے۔" جواب میں مہندر لال ہنس پڑا تھا پھر اس نے کہا۔

"معاف تو تجھے کرہی دوں گا۔ جورو کا بھائی ہے نا' چل خاموشی سے میرے ساتھ باہر نکل۔" اور پھر مہندر لال نے پستول جیب میں رکھا اور گووند سے کہا۔ "میری جیب میں رکھے پستول کی نال کا رخ تیری طرف ہے۔ ذرا بھی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو فائر کردوں گا۔ جس کا ذمے دار تو خود ہوگا۔"

"نن......... نہیں مہاراج آپ چنتا نہ کریں۔ میں اب سیدھا ہوگیا ہوں۔"

پھر مہندر لال گووند کو لے کر وہاں سے چل پڑا۔ ساتھ میں اس نے دو ملازم بھی

لے لئے تھے اور آخر کار وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں چوکھا گووند کا انتظار کر رہا تھا۔ چوکھا کو بھی پستول کے زور پر قابو میں کر لیا گیا اور اس کے بعد مہندر لال نے کہا۔

"اب تم دونوں کو میں ڈاکہ زنی کے الزام میں کم از کم پانچ سال کی سزا کراؤں گا۔"

دونوں مہندر لال کے پیروں پر گر گئے اور رو رو کر اس سے معافی مانگنے لگے۔

"جیجا جی' پانچ سال میں تو ہم مر جائیں گے۔ آپ کو بھگوان کا واسطہ ہمیں معاف کر دیجئے۔"

بہت دیر تک مہندر لال انہیں ڈراتا رہا' ان سے پوچھتا رہا کہ انہوں نے حویلی میں کیا کیا چوری کیا ہے اور بہت سی چوریاں ان کے علم میں آگئیں۔ بہرحال اس کے بعد مہندر لال نے کہا۔

"اب تم دونوں ریل میں بیٹھو اور یہاں سے اتنی دور دفع ہو جاؤ کہ مجھے تمہارا نام و نشان نہ ملے۔ اگر دوبارہ کبھی تمہاری جھلک نظر آگئی تو پھر میرا غصہ بڑھ جائے گا اور اس کے بعد میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔"

"جیجا جی آپ' آپ' آپ ایک بار بس ہمیں معاف کر دیں اس کے بعد دیکھیں کہ کہاں جاتے ہیں۔ نظر نہیں آئیں گے آپ کو۔"

اور اس کے بعد وہ دونوں چلے گئے تھے۔

☆------☆------☆

کنہیا لال اڑے اڑے انداز میں اس گھر میں زندگی گزار رہا تھا۔ سندر لال بہرطور ایک اچھا بیٹا تھا۔ باپ کی اس طرح خبرگیری کر رہا تھا کہ جیسے لوگ اپنے بچوں کی کرتے ہیں۔ ہر طرح کا خیال رکھتا تھا وہ' کئی بار اس نے اس سلسلے میں ہری لال سے بات کی تھی۔ ہری لال یہی کہتا تھا کہ کسی ذہنی حادثے نے کنہیا لال سے اس کی یادداشت چھین لی ہے۔ اگر سندر لال چاہے تو کسی بڑے ڈاکٹر کو انہیں دکھا سکتا ہے لیکن ایسے واقعات میں یہی ہوتا ہے کہ یادداشت خودبخود واپس آجاتی ہے۔ یہ مسئلہ آج تک حل نہیں ہوسکا تھا کہ کنہیا لال کے ساتھ واقعہ کیا پیش آیا۔ مہندر لال سے بھی غلطی ہوئی تھی۔ اس نے ان دونوں لڑکوں سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ انہوں نے کنہیا لال کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی یا نہیں۔ اس کے بعد مہندر لال نے سارا معاملہ ہی گول کر دیا تھا۔ راج شری کے علاوہ کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہوسکی تھی کہ گووند اور چوکھا یہاں کیا کیا کرتے رہے ہیں۔ بس گھر والوں سے یہی کہہ دیا گیا تھا کہ وہ دونوں چلے گئے ہیں۔ اب جب ان کا دل

چاہے گا واپس آجائیں گے۔ بہرحال اس طرح کنہیا لال کا وقت یہاں گزر رہا تھا۔ کنہیا لال کی سرگرمیاں بڑی عجیب سی تھیں۔ اکثر وہ راتوں کو اٹھ کر پوری حویلی کے چکر لگایا کرتا تھا۔ گھر کے کمروں میں گھستا پھرتا تھا۔ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے گھر میں چکر لگانے کے اوقات ہی ایسے ہوا کرتے تھے جب سب گہری نیند سو رہے ہوں۔ پھر ایک دن اس نے سندر لال سے کہا۔

"سندر! میں وہاں جانا چاہتا ہوں جہاں سے تو مجھے لایا تھا۔"

"دیال چند جوشی کے ہاں؟"

"ہاں۔ وہیں جانا چاہتا ہوں میں' تجھے نہیں معلوم وہ میرا کتنا بڑا محسن ہے۔ اس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے تم لوگ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ بتا سندر لال کسی کو اس کے احسانوں کا بدلہ دیا جاتا ہے یا نہیں؟"

"اوش دیا جاتا ہے پتا جی! آپ نے کبھی اشارہ ہی نہیں کیا۔"

"بہت ساری رقم لے کر اس کے گھر چل۔ میں اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"میں انتظام کر دوں گا۔ مہاراج! آپ چنتا ہی نہ کریں۔" سندر لال نے محبت بھرے انداز میں باپ سے کہا۔ پھر کنہیا لال کی ہدایت کے مطابق وہ ایک بہت بڑی رقم لے کر کنہیا لال کو ساتھ لے کر دیال چند جوشی کے گھر چل پڑا۔ دیال چند جوشی سیدھا سادہ آدمی تھا۔ کنہیا لال کو اس کے گھر پہنچانے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا تھا چنانچہ جب کنہیا لال اس طرح اس کے گھر پہنچا تو جوشی خوشی سے کھل اٹھا۔

"ارے بڑے مہاراج! یاد ہیں ہم آپ کو؟ بڑے دیالو ہیں آپ کہ غریب کے جھونپڑے کو یاد رکھا آپ نے۔"

کنہیا لال نے جوشی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیسے بھول سکتے ہیں ہم تجھے جوشی! تو نے خود ہمارے ساتھ بڑے اپکار کئے ہیں۔"

"ارے میں کیا' میری بساط کیا مہاراج آیئے نا۔"

درختوں کے نیچے پڑی ہوئی چارپائیوں پر خود سندر لال بھی بیٹھ گیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جوشی مہاراج! میرے پتا جی تو آپ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ بس یہ اتنے دن ذرا ضروری کاموں میں گزرے اس کے بعد پتا جی بولے کہ چلو جوشی کے ہاں۔"

"ہاں۔ جوشی کی تین بیٹیاں ہیں اور ساری کی ساری جوان ہو چکی ہیں۔ میرے

دوست کے پاس اتنی دولت نہیں ہے کہ وہ ان بچیوں کا ٹھیک سے بیاہ کر سکے۔ یہ انتظام تجھے کرنا ہے سندر لال! یہ تینوں بچیاں تیری بہنیں ہیں۔ انہیں بہن سمجھ کر ان کے رشتے کا بندوبست کر اور یہ رقم لے لو دیال چند جوشی۔ اس سے تم اپنے گھر کے حالات بہتر بناؤ۔ اس کی مرمت وغیرہ کراؤ تاکہ جب بیٹیوں کے رشتے گھر میں آئیں تو انہیں یہ احساس نہ ہو کہ یہ کسی غریب کا گھر ہے۔"

بہت بڑی رقم تھی۔ دیال چند جوشی نے تو کبھی زندگی میں اتنی بڑی رقم خود نہیں کمائی تھی۔ یہ رقم دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ کنہیا لال کے پیروں میں پڑ گیا۔

"مہاراج' مہاراج! اتنا بڑا اپکار نہ کریں مجھ پر۔ ہم غریب لوگ اس کا کیا صلہ دے سکیں گے؟"

"ارے صلہ تو تم نے پہلے ہی دے دیا ہے جوشی! چلو رکھ لو اور اپنی بیٹیوں کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ بلکہ ایسا کر سندر لال! دیال چند جوشی کو ایک ایک بیٹی کے نام پر ایک ایک لاکھ روپیہ دے دے۔ یہ خود بیٹیوں کی شادیوں کا بندوبست کرے گا۔" دیال چند پر تو بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ سندر لال نے کہا کہ وہ یہ رقم پہنچا دے گا۔ کافی دیر تک یہاں بیٹھنے کے بعد کنہیا لال دیال چند جوشی سے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تھا اور جوشی پر موت کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا اور جب اس نے اپنی دھرم پتنی کو یہ ساری کہانی سنائی تو وہ بھی خوشی سے دیوانی ہو گئی۔

"میں نہ کہتا تھا پاروتی' بھگوان جب سنتا ہے تو ایسی سنتا ہے کہ انسان سوچ بھی نہ سکے۔ دیکھ روتی رہی ہے جیون بھر اب سارے آنسو صاف ہو گئے ہیں۔ ارے اتنی بڑی رقم اس میں تو ہمارا پورا گھر ہی بن جائے گا۔" دونوں میاں بیوی خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے اور دیال چند جوشی اس وقت کا شکر گزار تھا جب کنہیا لال اسے ملا تھا۔ بہرحال اس گھر کو خوشیاں نصیب ہو گئی تھیں۔ سندر لال کے لئے تین لاکھ روپے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ دوسری بار جب وہ آیا تو کنہیا لال اس کے ساتھ ہی تھا۔ یہ رقم اس نے جوشی کو دیتے ہوئے کہا۔

"جوشی جی مہاراج! یہ مت سوچنا کہ بس اس پر بات ختم ہو جاتی ہے۔ آپ نے میرے پتا جی کی سہائتا کی ہے۔ ان کا جیون بچایا ہے آپ نے' آپ سمجھ لیجئے کہ میں جیون بھر آپ کا یہ احسان مانوں گا۔"

کنہیا لال نے کہا۔ ”دیال چند جوشی! میرا دوست ہے۔ وہ چار دن کے بعد گھر آجاؤں گا۔ تم مجھے یہیں سے لے لینا۔“

”جو آگیا پتا جی۔“ سندر لال نے کہا پھر کنہیا لال کو یہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ جوشی اور اس کے گھر والے بہت خوش تھے۔ تینوں لڑکیوں کو پتا چل چکا تھا کہ کنہیا لال نے کتنا بڑا احسان کیا ہے ان پر۔ زندگی بن گئی تھی ان کی چنانچہ وہ بھی کنہیا لال کی بڑی خدمت کر رہی تھیں اور چاچاجی چاچاجی کہہ کر اس سے مخاطب ہو رہی تھیں۔ کنہیا لال نے ایک دن ہنسی خوشی وہاں گزارا اس کے بعد وہ دوسرے دن دیال چند سے بولا۔

”دیال چند ایک دفعہ جب میں یہاں موجود تھا تو تیری گھر والی کی کمر میں درد ہو گیا تھا اور تو نے پڑوس کے کسی مسلمان لڑکے کو بلایا تھا اور اس لڑکے نے تیری گھر والی کی کمر پر لات ماری تھی پھر تو نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پاگل ہے اور اس کے لات مارنے سے کمر ٹھیک ہو جاتی ہے۔“

”جی مہاراج۔“

”میری کمر میں کچھ تکلیف ہے لگتا ہے مچک چلی گئی ہے۔ وہ لڑکا مل سکے گا دوبارہ؟“

”پڑوس میں تو رہتا ہے مہاراج۔ میں ابھی بلائے دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تو اسے بلا لا۔“ دیال چند خود ہی باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد غلام شیر، دیال چند کے ساتھ اندر آگیا۔ چہرے ہی سے شریر اور نٹ کھٹ معلوم ہوتا تھا۔ دیال چند نے اس سے کہا۔

”غلام شیر ہمارے مہاراج کی کمر میں چک آگئی ہے تو ذرا لگا ہلکی ہلکی دو لاتیں۔“

”یہ تو کنہیا لال مہاراج ہیں نا؟“ غلام شیر بولا۔

”ہاں۔“

”دیکھو اللہ میاں نے مجھے کتنی بڑی دولت دی ہے۔ بڑے بڑوں کو لاتوں سے اُڑا دیا کرتا ہوں۔“ دیال چند نے جلدی سے دانتوں کے نیچے زبان دبائی اور بولا۔

”ارے بیوقوف! یہ ہمارے بڑے مہاراج ہیں۔ تجھے اندازہ نہیں ہے ان کے بارے میں۔ ان سے ایسی باتیں کر رہا ہے تو۔“

”لو چاچاجی، میں نے کیا کہا ہے۔ میں تو بس ایک بات کر رہا ہوں۔“

کنہیا لال ہنس کر بولا۔ ”ہاں۔ یہ سچ کہہ رہا ہے بھگوان نے اسے یہ دولت دی ہے۔

چل بیٹا تو اپنا کام کر۔ بھگوان کسی کو کوئی دولت دیتا ہے کسی کو کوئی۔ دیال چند تو میرے لئے اپنی دھرم پتنی سے چائے بنوا لے ذرا اچھی سی۔“ دیال چند اندر چلا گیا۔ تو کنہیا لال نے غلام شیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! تو نے کبھی آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے؟“

”ضرورت ہی نہیں پیش آئی چاچاجی، اماں کہتی ہے کہ میں چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہوں اور پوری بستی میں میری شکل کا کوئی بھی نہیں ہے۔ بس میں آئینہ نہیں دیکھتا۔“

کنہیا لال ہنس پڑا پھر بولا۔ ”تیری ماں بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ راج کمار لگتا ہے تو۔ پر بیٹے! راج کماروں جیسا جیون نہیں بتا رہا تو۔“

”کیا کروں چاچاجی، ابا کے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ چھوٹے موٹے کام دھندے کر لیتا ہے اور تھوڑے سے پیسے لے آتا ہے۔ چار دن گھر میں روٹی پکتی ہے۔ تین دن فاقہ ہوتا ہے۔“

”ہیں۔ تو نے بتایا نہیں مجھے کتنے بہن بھائی ہو تم؟“

”بہت ہیں چاچاجی بہت ہیں۔ ابا کو جب باہر کوئی کام نہیں ہوتا تو بیچارہ گھر میں ہی رہتا ہے اور گھر میں رہنے کا نتیجہ آپ جانتے ہو۔“

”ارے ارے۔ بڑا بے شرم ہے رے تو۔ ماں باپ کا مذاق اڑاتا ہے نٹ کھٹ شریر کہیں کا۔“ کنہیا لال ہنس کر بولا۔

”لو چاچاجی اس میں میرا کیا قصور ہے! آپ نے پوچھا میں نے بتا دیا۔“

”تو تیری جیب تو خالی رہتی ہوگی عام طور سے۔“

”ہاں چاچاجی! بس ابھی تو اپنی زندگی شروع ہی نہیں ہوئی۔ آپ یہ سمجھ لو کہ بس خواب دیکھتے ہیں زندگی میں بڑا آدمی بننے کے۔“

”خواب دیکھتا ہے تو۔“

”تو اور کیا چاچاجی! ویسے ایک بات کہیں آپ سے۔ یہ خواب ہوتے بڑے اچھے ہیں۔ انسان کو اگر کچھ مل نہیں سکتا تو وہ خوابوں میں اپنے آپ کو جو دل چاہے دے لے۔ خوب بڑا آدمی بن جائے۔ گاڑیاں، موٹریں، بنگلے، کاریں، گھوڑے، دولت ہی دولت۔“

”پاگل ہے رے تو بالک پاگل ہے۔ اچھا یہ بتا اس سنسار میں جن لوگوں کے پاس یہ سب کچھ ہوتا ہے وہ انسان ہوتے ہیں یا جانور؟“

"ہوتے تو انسان ہی ہیں چاچاجی۔ پر نہ جانے کیسے انسان ہوتے ہیں۔ ایک بات تو بتاؤ چاچاجی۔"

"ہاں پوچھ۔"

"اپنا ابا انسان نہیں ہے کیا؟"

"ہوگا تو انسان ہی پر اس نے جدوجہد نہیں کی ہوگی' محنت نہیں کی ہوگی۔"

"سارے لوگ کہتے ہیں بڑا محنتی ہے میرا باپ' پر بیچارے کی تقدیر اچھی نہیں ہے۔"

"ایک بات اور کہوں تجھ سے' تقدیر اپنے ہاتھوں سے بنائی جاتی ہے۔ ویسے اگر تجھے کبھی تقدیر بنانے کا شوق ہو تو مجھ سے بات ضرور کرنا۔"

جواب میں غلام شیر ہنس پڑا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "چاچاجی۔ پھر تم نے تو اپنی تقدیر بڑی اچھی بنالی ہوگی۔"

"ہاں۔ ذرا پوچھ دیال چند سے میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟"

"بڑے آدمی ہو کیا؟"

"بس کنہیا لال ہے میرا نام اور بستی میں بڑی عزت ہے میری۔ لوگ کہتے ہیں میں دولت مند بھی ہوں۔"

"یہ آخری بات تم نے بڑی اچھی کہی چاچاجی! اگر تم دولت مند ہو تو ذرا نکالنا سو روپے کا ایک نوٹ۔" غلام شیر شرارت سے بولا لیکن کنہیا لال نے ایک کے بجائے دو نوٹ نکال کر اس کے آگے کر دیئے۔

"یہ لے اور یہ دونوں تیرے۔" غلام شیر ایک لمحے کے لئے تو دہشت زدہ رہ گیا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے نوٹ پکڑے اور بولا۔ "مذاق تو نہیں کر رہے چاچاجی۔"

"جیب میں رکھ لے چپ چاپ۔ ابھی میں تین چار دن تک یہاں ہوں۔ روزانہ آجایا کر میرے پاس روزانہ اتنے پیسے دیا کروں گا۔"

"ارے باپ رے باپ اتنے پیسے تو میرا ابا مہینے بھر میں نہیں کماتا۔"

"بات یہیں تک نہیں ہے۔ میں تجھے بتاؤں گا کہ میں دولت مند کیسے بنا جبکہ میں تجھ سے بھی زیادہ غریب تھا لیکن دیکھ لے خود جا کر۔ حویلی ہے پوری میری' کنہیا لال کی حویلی کے بارے میں تو سنا ہوگا تُو نے۔"

"تت.......... تو تم وہ کنہیا لال ہو جو تھوڑے دن پہلے مر گئے تھے۔"

"بالکل وہی ہوں۔"

"ارے باپ رے باپ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔" دور سے دیال چند جوشی آتا ہوا نظر آیا تو کنہیا لال نے کہا۔

"اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میری کمر پہ دو لاتیں مار اور پھر چلا جا۔"

"ٹھیک ہے۔" غلام شیر نے ہلکی ہلکی دو لاتیں کنہیا لال کی کمر پر ماریں۔ اتنی دیر میں دیال چند قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہوگیا کام' چل چائے پی لے۔"

"نہیں چاچاجی! چلتا ہوں۔ کل پھر آؤں گا۔" غلام شیر کی جیب میں رکھے ہوئے سو سو کے دو نوٹ اس کے سینے میں چبھ رہے تھے۔ وہ پہلے یہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ یہ نوٹ اصلی ہیں اور کنہیا لال انہیں واپس تو نہیں مانگ لے گا چنانچہ وہ پھرتی سے باہر نکل گیا۔ کنہیا لال اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"حیرت انگیز لڑکا ہے۔ کمر پہ مارنے سے تو یہ سمجھ لو کمر کا درد ہی جاتا رہا ہے۔"

"ہاں۔ بس بھگوان کی رلیلا ہے۔ پتہ نہیں کس کے اندر کیا چیز بھر دیتا ہے وہ۔ اس کے خزانے ہیں جسے من چاہے جو دے دے۔ بڑے غریب گھرانے کا بچہ ہے بیچارہ۔ بہت سے بہن بھائی ہیں۔۔ نہ پیٹ بھر کھانے کو نہ تن ڈھکنے کو۔ باپ محنت مزدوری کرتے مرا جا رہا ہے اور بڑی مشکل سے بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔ تنگ دستی اور فاقہ کشی گھر میں بھری ہوئی ہے۔ بڑے بے بس اور مظلوم ہیں بیچارے۔"

"ہوں۔ ویسے یہ لڑکا مجھے بڑا اچھا لگا ہے دیال چند۔ گھر میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ میرا مطلب ہے کہ گھر والے اس سے محبت تو کرتے ہوں گے۔"

"ایک بات کہیں مہاراج! سنسار بڑی عجیب جگہ ہے۔ محبت کون اپنے بچوں سے نہیں کرتا۔ پر مہاراج! جب گھر میں فاقہ کشی اور بے بسی ہوتی ہے تو محبت قبر کی گہرائیوں میں جا سوتی ہے۔ نہ کھلانے کو کچھ ہوتا ہے نہ پہنانے کو کچھ ہوتا ہے۔ خالی محبت سے تو جیون نہیں گزر جاتا۔"

"ٹھیک کہتا ہے۔ ویسے تُو نے جس انداز میں اس لڑکے کے بارے میں کہا ہے کیا نام ہے اس کا؟"

"غلام شیر۔"

"باپ کا نام کیا ہے؟" کنہیا لال نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کریم شیر۔"

"ہوں۔ ایک بات بتا اگر اس لڑکے کو ہم اپنے پاس رکھنا چاہیں تو؟"

"مہاراج! میرا خیال تو یہ ہے کہ کریم شیر بڑی خوشی سے تیار ہو جائے گا۔"

"تو پھر سن اس سے بات کر۔ اس سے کہہ ہم اسے بیس ہزار روپے دیں گے' وہ اس بچے کو ہمیں دے۔ ہم اسے یہاں سے لے جائیں گے اور اسے سنسار میں کام کا آدمی بنائیں گے۔"

"وہ تو پاگل ہو جائے گا بیس ہزار کی بات سنتے ہی۔ بیس روپے نہیں ہیں اس کے پاس اور نہ جانے کب سے غربت کی یہ زندگی گزار رہا ہے۔"

"تو پھر تو بات کر۔"

"آج ہی بلا لیتے ہیں اسے۔"

"ہاں' بلا لے یہیں پر۔ یہ بات طے ہو جائے۔"

دیال چند نے کریم شیر کو اپنے گھر بلا لیا اور کنہیا لال نے دور ہی سے اسے دیکھا۔ چہرے سے غربت ٹپکتی تھی۔ میلا کچیلا لباس' آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے۔ ہونٹوں پر خشکی جمی ہوئی۔ کنہیا لال کو وہ کسی طرح پہچانتا تھا۔ قریب آکر دونوں ہاتھ جوڑے اور بولا۔

"ارے مہاراج کنہیا لال جی۔ آپ اور یہاں؟"

"تم جانتے ہو کنہیا لال مہاراج کو؟"

"اتنے بڑے آدمی ہیں بھلا انہیں کون نہیں جانتا ہوگا۔ دو ایک بار دیکھا ہے بستی میں۔ بڑی شان و شوکت والے ہیں یہ تو۔"

"بس بس ہماری اتنی تعریف نہ کرو کریم شیر! ابھی تھوڑی دیر پہلے دیال چند سے تمہارے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ دیال چند واقعی دیالو ہے۔ بڑی محبت کرتا ہے یہ تم سے اور بڑا دکھی ہے تمہاری غربت پر۔ تھوڑی دیر پہلے تمہارا بیٹا ہمارے پاس آیا تھا۔ اس نے میری کمر میں لات مار کر میری چک ٹھیک کر دی تو میں نے دیال چند سے پوچھا کہ یہ کس کا بیٹا ہے۔ تب دیال چند نے تمہارے بارے میں بتایا۔ کریم شیر تمہارے بہت سے بچے ہیں۔ تم اپنا یہ بیٹا ہمیں گود دے دو۔"

"میرا کیا ہے مہاراج! آپ ہی کا ہے۔ آپ جیسے آپ کا من چاہے کریں۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ میرا بیٹا آپ کے چرنوں میں رہے۔" کریم شیر نے عاجزی سے کہا۔

"نہیں کریم شیر! ہم تمہاری مشکل کو سمجھتے ہیں۔ بے شک کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا لیکن ہم کوشش کریں گے کہ سنسار میں اسے بڑا آدمی بنا سکیں۔ ہمارے جیون کا اور کوئی مقصد تو ہے نہیں۔ کچھ بھی نہیں کیا ہے اس جیون میں ہم نے۔ پر اس بچے کے لئے ہم بہت کچھ کریں گے۔ سوچ لو تمہاری اجازت ہے۔ ہم اسے لے جائیں گے یہاں سے۔"

"جیسی مہاراج کی مرضی۔ دیال چند بھائی میرے حالات جانتے ہیں اور پھر ویسے بھی ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔ اگر اپنی محبت ہی میں گرفتار ہو کر رہ جائیں تو بچوں کو بھوک پیاس دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے دیال چند وہ رقم کریم شیر کو دے دو۔" کنہیا لال نے دیال چند سے کہا اور دیال چند نے وہ بیس ہزار روپے جو کنہیا لال نے اسے دے دیئے تھے' کریم شیر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بیس ہزار روپے ہیں کریم شیر بھیا! تمہارے بڑے کام آئیں گے۔ اپنا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لینا۔"

ایک غریب آدمی کی جو حالت اتنی بڑی رقم دیکھ کر ہو سکتی تھی' وہی کریم شیر کی ہوئی تھی۔ لرزتا رہا تھا بیچارہ' پھر اس نے بڑا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد کچھ ضروری باتیں کر کے وہاں سے اپنے گھر واپس چل پڑا۔ غلام شیر اس وقت گھر پر ہی تھا۔ جب اس نے بیٹے کو بلا کر اس سے بات کی اور کہا۔

"بیٹا غلام شیر' دیال چند کے گھر میں کنہیا لال مہاراج آئے ہوئے ہیں' جانتے ہو انہیں؟"

"ہاں۔ بڑے میاں بڑی اونچی اونچی چھوڑتے ہیں۔ کیا ہوا ابا؟"

"بیٹا تمہیں گود لینے کے لئے کہہ رہے تھے۔ کیا تم ان کے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟"

"ان کے باپ بھی مل کر مجھے گود نہیں لے سکتے۔ میرا وزن کتنا ہے ابا یہ معلوم ہے تمہیں؟"

"مذاق کی بات نہیں کر رہا بیٹا ہمارے پاس تجھے کیا ملے گا۔ غریب لوگ ہیں۔ وہاں حویلی میں رہے گا تو۔ نوکر چاکر ہوں گے تیرے آگے پیچھے۔ کنہیا لال کو اگر تو نہیں جانتا تو یہ جان لے بڑی حویلی کے مالک ہیں۔ لاکھوں روپے ان کے قدموں میں پڑے رہتے

ہیں۔"

"اچھا۔ بڑے میاں شکل سے تو ایسے نہیں لگتے۔"

"مگر میں انہیں جانتا ہوں بیٹا۔"

"مگر ابا یہ چکر ہے کیا گود لینے کا؟"

"بس تو انہیں پسند آگیا ہے۔ تجھے اپنے ساتھ حویلی میں رکھنا چاہتے ہیں۔"

"خیر یہ خواب تو ہم نے ہزاروں بار دیکھے ہیں ابا۔ نوکر چاکر، عیش، گاڑی۔ یہ ساری چیزیں خواب میں تو نظر آتی ہیں۔ ویسے ابا! آج یہ مذاق کرنے کو دل کیوں چاہ رہا ہے تمہارا؟"

"یقین کر غلام شیر انہوں نے خود مجھے بلایا ہے اور یہ دیکھ بیس ہزار روپے دیئے ہیں انہوں نے۔"

"کیا مطلب۔ کیا بیس ہزار روپوں میں انہوں نے مجھے خرید لیا ہے؟"

"ارے نہیں بیٹا! وہ تو میری مالی مدد کی ہے انہوں نے مگر اس سے تو یہ اندازہ لگا لے کہ تیرے کیا عیش ہوں گے۔"

غلام شیر کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ "بات تو سچ کہہ رہے ہو ابا! اگر واقعی اتنی بڑی حویلی میں مجھے لے جاکر رکھا جائے گا اور یہ عیش ہوں گے میرے تو پھر بھلا کیا میرا دماغ خراب ہے جو ان کے پاس جانا نہیں چاہوں گا۔"

"تو تو تیار ہے؟"

"پکا تیار ہوں ابا۔ جب دل چاہے گا بھاگ آؤں گا وہاں سے۔"

غلام شیر کی ماں بلبلا کر قریب پہنچ گئی تھی۔ "کیا کہہ رہے ہو تم کریم شیر، اولاد کو بیچ رہے ہو؟"

"ہاں بیچ رہا ہوں اور اس لئے بیچ رہا ہوں کہ ایک کو دوسرے کے حوالے کرکے باقیوں کو پال لوں۔ بیس ہزار روپے دیئے ہیں کنہیا لال نے۔ اپنا بیٹا بنانا چاہتے ہیں وہ اسے۔"

"کچھ شرم و حیا ہے تمہارے پاس کریم شیر! جو نام تم لے رہے ہو کسی مسلمان کا نہیں ہندو کا ہے۔"

"بدزبانی کرے گی مجھ سے۔ زندگی بھر میرا حکم مانتی رہی ہے، اب بدزبانی کرے گی مجھ سے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ غربت نے ہمارے گھر میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں،

کچھ کرکے نہیں دے سکا ہوں تجھے۔"

"کہاں مانگ رہی ہوں تم سے۔ بولو، کبھی پیشانی پر بل ڈالا ہے۔ تین تین دن تک فاقے کیئے ہیں، کبھی مانگا ہے تم سے کچھ، اولاد کے بدلے اپنی زندگی تو دے سکتی ہوں۔ دولت نہیں لے سکتی۔ یہ بیس ہزار روپے پھینک آؤ اس ہندو کے منہ پر جو میرے بیٹے کو خریدنا چاہتا ہے۔"

"اماں میری بات تو سن لے۔ کیا کہہ رہی ہو تم مجال ہے کسی کی کہ میرے بیٹے کو خریدے۔ ارے وہ تو میں اسے بیوقوف بنا کر اور بڑی بڑی رقمیں گھسیٹوں گا اس سے اور تیرے پاس پہنچا دوں گا۔ میں رہوں گا کوئی اس کے پاس۔ ایک بیوقوف ہاتھ لگ رہا ہے تو اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔"

"تجھ سے زیادہ سمجھدار ہے یہ، ننھا سا بچہ نہیں ہے۔" کریم شیر نے اپنی بیوی سے کہا اور بیوی دونوں باپ بیٹوں کو دیکھنے لگی پھر بولی۔

"مگر یہ بھی تو اچھا نہیں ہے کہ اسے دھوکہ دیا جائے۔"

"بس بس۔ کافی ہے، تو اپنے گھر کے معاملات دیکھ۔ باہر کے معاملات ہم باپ بیٹوں کو دیکھنے دے۔ اسے بتا غلام شیر کہ اس عمر میں نہ تو بچے خریدے جاتے ہیں نہ انہیں گود لیا جاتا ہے۔ کنہیا لال اپنی زندگی کا بہت سا وقت گزار چکا ہے۔ دولت خوب کمائی ہے اس نے۔ اب اگر ایک شوق اس کے دل میں آیا ہے تو پورا ہو جانے دو اس شوق کو۔ ہمارے بھی کچھ دن پھر جائیں گے۔" باپ بیٹوں نے اس طرح ماں کو قائل کیا کہ بیچاری عورت مجبور ہو گئی۔

غلام شیر بولا۔ "تو پھر اب تم کب مجھے اس کی گود میں دے رہے ہو؟"

"بس بیٹا! بات مجھ پر چھوڑ دی گئی ہے۔"

"تو پھر جلدی کرو اب تو میری آنکھوں میں بھی حویلی کے خواب ناچنے لگے ہیں۔" غلام شیر نے کہا۔ کریم شیر غلام شیر کو لے کر دیال چند جوشی کے پاس پہنچ گیا۔ کنہیا لال مسکرانے لگا تھا پھر اس نے کہا۔

"ہاں۔ بھئی غلام شیر تمہارے پتا نے تمہیں ساری تفصیل بتا دی ہوگی؟"

"ہاں۔ مگر میں تو آپ کی یہیں سیوا کر سکتا تھا مہاراج! آپ نے مجھے اس طرح اپنے ساتھ رکھنے کی کیوں بات کی ہے؟"

"بات سیوا کی نہیں ہے بیٹا! ہماری کمر پر تو نے دو لاتیں مار دیں۔ ہم تو ٹھیک ہو گئے

لیکن تُو ہمیں اتنا پسند آیا ہے کہ ہم تجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ سنسار میں وہ دینا چاہتے ہیں تجھے جو تیرا اصل مقام ہوگا۔ دولت کی ریل پیل' نوکر چاکر' گاڑیاں' کوٹھیاں یہ سب تیرے چرنوں میں ڈھیر ہوں گی۔"

غلام شیر کی آنکھوں میں خواب ناچنے لگے اس نے کہا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔ میں آپ کو کیا کہوں۔"

"جو تیرا من چاہے۔ کہنے سننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دادا جی مہاراج کہہ لے ہمیں۔"

"ٹھیک ہے دادا جی مہاراج۔"

"تو پھر آج سے تجھے ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کہاں لے چلیں گے؟ حویلی!"

"بس تُو اس کی چنتا نہ کر۔ ابھی تو ایک دو دن ہم دیال چند کے ہاں ہیں۔ اس کے بعد تجھے لے چلیں گے۔"

"جیسا آپ کا حکم۔" غلام شیر ایک چالاک لڑکا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس وقت کنہیا لال جی کو اپنی مٹھی میں لیا جائے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ دنیا کا اسے کوئی خاص تجربہ تو نہیں تھا لیکن پھر بھی موقع کی نزاکت کو سمجھتا تھا۔ رات کو کنہیا لال نے دیال چند سے کہا۔

"دیال چند میری اور اس کی چارپائی یہیں درخت کے نیچے ڈال دینا۔ ہم یہیں سوؤں گا۔"

"جو حکم مہاراج۔" دیال چند کا تو رواں رواں کنہیا لال کا احسان مند تھا۔ اس کی کہی ہوئی بات دیال چند کے لئے پتھر کی لکیر ہوا کرتی تھی۔ رات کو کنہیا لال اور غلام شیر برابر برابر کی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ کنہیا لال نے کہا۔

"غلام شیر تُو اچھا خاصا بڑا لڑکا ہے۔ ابھی تک تُو نے کوئی کام دھندا کیوں نہیں کیا اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے کے لئے؟"

"دادا جی مہاراج! سچ بتاؤں آپ کو' پتا نہیں کون سی عمر میں' میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ سفید رنگ کے گھوڑے پر سوار ہوں اور زمین سے خوب اونچا اُڑا جا رہا ہوں۔ میرے بدن پر شہزادوں جیسا لباس ہے اور شان ہی کچھ اور ہے۔ بس اس دن سے من کو یہ چڑھ گئی کہ میرا ٹھکانہ تو بہت بڑی جگہ ہے۔ اب اس کے بعد سے آج تک تو یوں سمجھ

لیجئے دادا جی مہاراج کہ جب کبھی دل چاہتا ہے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور پہنچ جاتا ہوں خوابوں کے نگر میں جہاں دنیا کے سارے عیش و عشرت میرے منتظر ہوتے ہیں۔ محل' کوٹھی' باندیاں' حکم ماننے والے۔ سارے کے سارے' ایک سے ایک اعلیٰ۔"

"ہوں۔ تو تیرا دل یہ بھی چاہتا ہوگا کہ یہ سب کچھ حقیقت بن جائے؟"

"کس کا دل نہیں چاہتا دادا جی مہاراج! سب کا دل یہی چاہتا ہے۔ میں کوئی اکیلا تو نہیں ہوں۔"

"ہوں۔ اگر یہ سب کچھ تجھے مل جائے تو؟"

"ارے موجیں ہی موجیں ہو جائیں' پر ایسا ہوتا کہاں ہے۔"

"اب تو ہو گیا۔"

"کیسے؟" غلام شیر نے کنہیا لال کے دل کی بات معلوم کرتے ہوئے کہا۔

"تجھے میرے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ بہت بڑی حویلی ہے میری اور میرے پاس بہت کچھ ہے۔"

"ابا کو تم نے بیس ہزار روپے دیئے ہیں اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے دادا جی مہاراج کہ تمہارے پاس بہت پیسہ ہے۔ پر میرے خواب تو اس سے بھی کہیں اونچے ہیں۔"

"میں تیرے سارے اونچے خوابوں کی تکمیل کر دوں گا اگر تُو صرف میری بات مانتا رہے۔"

"تو لاؤ ہاتھ قول کا۔" غلام شیر نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور کنہیا لال نے ہنس کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے میرے اور تیرے درمیان یہ بات طے ہو گئی۔"

"ہاں۔ دادا جی مہاراج! پر قول نبھایئے گا۔ دیکھتے ہیں آپ بھی کیسے یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔"

"تو فکر ہی مت کر۔ بس میں تجھے جو بتاؤں وہ کرتا رہ۔"

"مجھے منظور ہے۔" پھر کافی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد غلام شیر کو نیند آ گئی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ کنہیا لال خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور جوشی کے گھر کا دروازہ کھول کر تاریک رات میں باہر نکل گیا۔

☆=====☆=====☆

غلام شیر جاگ گیا۔ ناک میں کوئی چیز سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ اسے ایک دم سے چھینک آئی اور اس چھینک سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے برابر ہی ایک شوخ سی لڑکی بیٹھی ہوئی ایک رنگین پر سے اس کی ناک میں گدگدی کر رہی تھی۔ سلک کے سفید لباس میں ملبوس اس حسین لڑکی کو دیکھ کر غلام شیر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو زور سے جھٹکا پھر آنکھیں کھولیں لیکن لڑکی اس کے قریب ہی بیٹھی رہی۔ بلکہ اس کے خوبصورت ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ غلام شیر ہڑبڑا کر اٹھ گیا لیکن اٹھتے ہی اسے ایک اور عجیب سا احساس ہوا۔ اس کے بدن کے نیچے ایک اتنا موٹا گدا تھا کہ اٹھنے کے بعد وہ پھر گر پڑا۔ لڑکی کی کھنکتی ہوئی ہنسی اسے سنائی دی تھی۔ یہ موٹا سا گدا کہاں سے آگیا اور یہ......... یہ میرے بدن کا لباس ایک بہت ہی خوبصورت لباس اس کے بدن پر تھا۔ وہ آنکھیں بھینچ کر گردن جھٹکنے لگا اور پھر اس نے بڑے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"پتہ نہیں یہ خواب میرا کیا حال کریں گے؟؟"

"اب آپ اٹھ جائیے چھوٹے سرکار۔ صبح ہو گئی۔ ناشتے پر آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔"

"چچھ......... چھوٹے سرکار یار دیکھو تم جو کوئی بھی ہو پری خانم ایسا کرو ذرا کوئی چیز میرے زور سے چبھا دو تاکہ میں ہوش میں آ جاؤں۔ ورنہ یہ خواب کباڑہ کر دیں گے میرا۔ اماں......... اے اماں کہاں ہو بھئی۔ ذرا آنا میرے پاس۔"

"چھوٹے سرکار! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ اٹھئے تو سہی۔ غسل کیجیے' ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"یار یہ خواب تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی گڑبڑ معلوم ہوتا ہے۔ اب اٹھ بھی جاؤں اب بھی خواب دیکھتا رہوں گا۔ ذرا اٹھا مجھے۔" غلام شیر نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو لڑکی جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے غلام شیر کا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھ میں لے لیا اور پھر اسے اٹھانے کے لیے زور لگانے لگی۔

"ہو گیا کباڑہ بھائی آج تو۔ یہ خواب تو سب سے ہی زیادہ ٹچن ناک ہے۔ چلو ٹھیک ہے ایک بات بتا دو بڑی آپا! چکر کیا ہے' اور یہ اس خواب کا وقت کتنا ہو گا؟؟"

لڑکی ہنس پڑی تھی پھر اس نے کہا۔ "وہ سامنے غسل خانہ ہے۔ آپ جائیے کپڑے وہیں غسل خانے میں موجود ہیں۔ خوب اچھی طرح ٹھنڈے پانی سے نہائیے اور پھر

آئیے۔ پھر میں بتاؤں گی آپ کو کہ خواب کی ڈیوریشن کیا ہے۔" لڑکی بولی۔ غلام شیر اس دوران کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے دونوں شانے اچکا کر اس کی طرف دیکھا جہاں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا اور اس کے اوپر انگلش میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

"وہ ہے غسل خانہ۔"

"جی جی یہ آپ ہی کا بیڈ روم ہے۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو آج؟ آئیے۔"

"تو کیا غسل خانے میں بھی میرے ساتھ چلو گی بڑی آپا؟"

"یہ کیا آپ نے بڑی آپا' بڑی آپا لگا رکھا ہے۔ میں شکیلہ ہوں۔"

"بی بی! تم حسینہ ہو' شکیلہ ہو' جمیلہ ہو میری تو کھوپڑی سنٹر میں نہیں ہے۔" پھر وہ غسل خانے کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا اور اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ارے باپ رے باپ یہ خوابوں میں غسل خانے بھی کمال کے ہوتے ہیں۔ یہ تو سنگ مرمر کا معلوم ہوتا ہے' اور یہ سب کچھ۔ ارے بھائی میں اندر سے بڑا گندا ہوں۔ مجھے کہیں دوسری جگہ بٹھا دو' ایک بالٹی میں پانی بھر کر ایک صابن اور ایک مگ دے دو بس۔" مگر یہ الفاظ سننے والا یہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ نل کھول کھول کر دیکھنے لگا۔ ایک نل کھولا تو ساری چھت میں سوراخ ہو گئے اور پانی کی تیز اور چبھنے والی دھاریں چھت سے چھوٹ پڑیں۔ غلام شیر نے جلدی سے وہ نل بند کر دیا' بدن کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ چاروں طرف سے تو پانی ابل پڑا تھا۔ پھر اس نے دروازہ اندر سے بند کر کے لباس اتارا اور ایک بار پھر اس ناب کو چھیڑا۔ پانی کی پھواریں پہلے چھت سے پھر دیواروں سے ابلنے لگیں۔ بہت بڑا غسل خانہ تھا لیکن پانی کی تیز دھاریں طوفان کی طرح پہلے چھت اور پھر چاروں طرف کی دیواروں سے نکلنے لگیں اور غلام شیر کے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔ پھر اس نے زور سے چیخ کر کہا۔

"یہ خواب چار چھ دن تک ضرور دکھا دینا ورنہ آنکھ کھلنے کے بعد کباڑا ہو جائے گا۔" وہ نہاتا رہا اور جب خوب سیر ہو گیا تو اس نے وہ بٹن بند کر دیا اور اس کے بعد ایک دم سے اسے خیال آیا کہ کپڑے کہاں ہیں۔ لڑکی نے تو کہا تھا کہ کپڑے اندر موجود ہیں اور اسی وقت اس کی نظر ایک طرف بنی الماری کی طرف اٹھ گئی۔ الماری کے قریب پہنچا تو کسی خاص طریقے سے الماری کا دروازہ درمیان سے کھل گیا۔ اندر ایک بہت ہی خوبصورت لباس لٹکا ہوا تھا۔ غلام شیر نے گردن ہلائی اور آہستہ سے بولا۔

"یہ خواب واقعی باؤلا کر دے گا۔ اس کے بعد ہوش میں آنے کو کس کا دل چاہے گا۔" اس نے کپڑے اتارے اور انہیں پہننے لگا۔ پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک تصور ابھرا۔ کیا خواب ایسے ہوتے ہیں؟ کیا خوابوں میں اتنا سوچا جا سکتا ہے؟ میں تو مسلسل یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ خواب ہے۔ خواب ہے' خواب ہے۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے اور اگر ایسا ہے تو اس خواب سے جاگا کیسے جا سکتا ہے؟ تمام تر ہوش و حواس قائم ہیں۔ اس نے غسل خانے کی دیواروں پر ہاتھ مار کر اپنے ہاتھوں کی تکلیف محسوس کی۔ مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو پرکھتا رہا اور آخرکار یہ فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس بار وہ خواب نہیں دیکھ رہا بلکہ یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے۔ باہر ایک لڑکی موجود ہے جو اسے غلام شیر کہہ کر ہی پکار رہی ہے۔ یہ طلسم خانہ جو کچھ بھی ہے اس کی حقیقت تو معلوم ہونی چاہیے۔ ماضی کی ساری باتیں ذہن میں تازہ تھیں۔ آخری تصور کنہیا لال کا ہی تھا لیکن وہ تو دیال چند چاچا کے گھر کے صحن میں سویا تھا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ بات بے شک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن ضرورت سے زیادہ چالاک تھا اور زندگی کو خاصے مشکل حالات میں دیکھ چکا تھا۔ باپ کا احساس بھی تھا۔ پھر کیا کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر تک تو اسی سوچ میں ڈوبا رہا اور اس کے بعد لباس وغیرہ پہن کر خاموشی سے باہر نکل آیا۔ وہی لڑکی باہر موجود تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی اور پھر اپنی حسین آواز میں بولی۔

"آیئے مہاراج! اب ناشتے کے کمرے میں چلیے۔"

"ٹھیک ہے' چلو۔" غلام شیر نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ لڑکی اسے اس کمرے سے نکال لائی۔ باہر جو کوریڈور نظر آ رہا تھا اس میں موٹا قالین بچھا ہوا تھا۔ دونوں طرف دیواروں پر حسین و جمیل تصویریں آراستہ تھیں۔ کوریڈور زیادہ طویل نہیں تھا۔ اس کا اختتام ایک اور دروازے پر ہوتا تھا۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور غلام شیر اندر داخل ہو گیا۔ ایک بہت لمبی میز لگی ہوئی تھی جس پر طرح طرح کی چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام شیر کے منہ میں ان تمام چیزوں کو دیکھ کر پانی بھر آیا تھا۔ اعلیٰ درجے کے پھل اور ناشتے کی دوسری چیزیں جو واقعی اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ خواب میں بھی وہ نظر آتا ہے جو زندگی میں کبھی دیکھا ہو لیکن یہ جو نظر آ رہا تھا یہ تو کبھی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ پورے وسیع و عریض کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ لمبی چوڑی میز کے درمیانی حصے میں ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر کرسی کھسیٹی اور بولی۔

"بیٹھیے مہاراج۔"

"باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"کون لوگ؟"

"میرا مطلب ہے جو میرے ساتھ ناشتہ کریں گے۔"

"آپ تو اکیلے ہی ناشتہ کرتے ہیں۔"

"تو پھر یہ ساری چیزیں کون کھائے گا؟" غلام شیر نے سوال کیا اور لڑکی ہنس پڑی پھر بولی۔

"آپ کھائیں گے مہاراج۔"

"اتنی چیزیں تو بیس آدمی مل کر بھی نہیں کھا سکتے۔"

"آپ جتنا من چاہے کھائیں۔"

"ایک اور کرسی لے آؤ اور میرے ساتھ بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"مہاراج! ہم نوکر ہیں۔ نوکر مالک کے ساتھ نہیں بیٹھا کرتے۔ ہم تو آپ کی سیوا کے لیے یہاں موجود ہیں۔ آپ لیجیے' جو چیز پسند فرمائیں۔ آپ لیجیے' ہم آپ کی چاکری کریں گے۔" غلام شیر نے ایک گہری نگاہ سے لڑکی کو دیکھا پھر کندھے اچکا کر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ پلیٹ اٹھاؤ۔" اور اس کے بعد لڑکی غلام شیر کو ناشتہ کراتی رہی۔ جو چیز چکھی لاجواب تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"بڑی دیر سے پوچھا۔ پشپا ہے ہمارا نام۔"

"پشپا۔ مجھے جانتی ہو؟"

"اپنے مہاراج کو کون نہیں جانتا۔"

"مگر ہم تمہارے مہاراج نہیں ہیں۔ ہم نے تو یہ سب زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔"

"نہیں مہاراج کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ یہ آپ کی حویلی ہے یہاں سب آپ کے غلام ہیں۔"

"ہوں۔ لگتا ہے کسی لمبے جال میں پھنس گئے ہیں۔" غلام شیر نے اپنے آپ سے کہا۔ ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"اب یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"آیئے مہاراج! تھوڑی سی چہل قدمی کیجئے اس کے بعد جیسا آپ پسند کریں۔"

"ہاں۔ چلو۔" غلام شیر بولا۔ اب اس سے زیادہ بیوقوفی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو عالم خواب میں سمجھے۔ خواب نہ تو اتنے لمبے ہوتے ہیں اور نہ اس قدر مکمل کہ ہر کام کر لیا جائے۔ حویلی کی راہداریاں قدموں تلے آگئیں۔ کیا شان و شوکت تھی اس کی ایک سے ایک حسین کمرہ' بڑے بڑے ہال۔ پھر ایک راہداری سے گزر کر ایک وسیع و عریض لان پر آگیا۔ آسمان بھی ابر آلود تھا۔ چاروں طرف درخت جھول رہے تھے اور ان کے دامن میں پھولوں کے تختے جن پر پھول لہلہا رہے تھے۔ جگہ جگہ سفید بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ سنگ مرمر کا ایک حوض بنا ہوا تھا اور اس حوض میں رنگین مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ حوض کے کنارے بھی بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان تمام جگہوں سے گزرتے ہوئے غلام شیر پشپا کے ساتھ اندرونی حصے میں آگیا۔ ایک ایک چیز سے دولت اور امارت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے کہا۔

"پشپا ایک بات بتاؤ۔ ہم پوری کوٹھی گھوم لیے یہاں تمہارے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا۔"

"نہیں مہاراج ملازم ہیں لیکن آپ کے سامنے آنے سے کترا رہے تھے وہ۔"

"صرف ملازم ہیں' اور کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں مہاراج اور کوئی بھی نہیں ہے۔ بس میں ہوں نا۔ ساری ذمے داری میرے ہی اوپر تو ہے نا آپ کی دیکھ بھال کی۔"

"اچھا۔ چلو ٹھیک ہے۔ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ سیر و سیاحت کے لیے یہاں یہی حویلی ہے یا ہم یہاں سے باہر بھی جا سکتے ہیں۔"

"مہاراج! ہفتے میں ایک بار آپ کو یہاں سے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔"

"مگر یہ بتاؤ ہم مہاراج کہاں کے ہو گئے؟"

"ہمارے من کے مہاراج ہیں آپ۔"

"میرا مطلب ہے کہ ہمارے پتا کا کیا نام ہے؟"

"کریم شیر۔" پشپا نے فوراً جواب دیا۔

"خوب۔ یہ بات تو تمہیں یاد ہے مگر یہ کریم شیر صاحب ہیں کہاں؟"

"یہ ہمیں نہیں معلوم مہاراج۔"

"میری ایک والدہ صاحبہ اور بہت سارے بہن بھائی بھی ہوا کرتے تھے۔"

"افسوس ہمیں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔"

"میرے بارے میں کیا جانتی ہو تم؟"

"کہا نا بس اتنا کہ آپ ہمارے مہاراج ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" پھر اس کے بعد بقیہ دن پشپا کے ساتھ ہی گزرا تھا۔ غلام شیر ایک ایک لمحے کے بعد یہ سوچ رہا تھا کہ کیا ہے؟ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ آخر یہ سب کیسے ہو گیا؟ لیکن اس کا دماغ یہ معمہ حل نہیں کر سکا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد بھی پشپا دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی اور اس کے بعد غلام شیر سونے کے لئے اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ وہی عظیم الشان مسہری جس پر دس آدمی سو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کمرے کی ڈیکوریشن یہ ساری چیزیں اس کے ذہن میں آتی رہیں اور وہ ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ بہرحال نیند بھی بڑی پرسکون آئی تھی۔ بہت کچھ سوچتا رہا تھا وہ اپنے ماضی کے بارے میں یہ سب کچھ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا۔ پھر صبح کو سورج کی کرنوں نے اس کی آنکھوں میں گدگدی کی اور لیٹے ہی لیٹے اس نے آواز لگائی۔

"پشپا کہاں مر گئیں۔" لیکن کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اچانک ہی اس کے ہوش و حواس واپس آگئے اور اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر بندروں کی طرح اچک کر اٹھ گیا۔ ہر طرف بھوری بدنما چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ جس جگہ خود لیٹا ہوا تھا وہ کھردری زمین تھی جس میں چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوئے تھے اور یہ پتھر رات کو اس کے جسم میں چبھ کر اپنی جگہ بنا چکے تھے اور اٹھنے کے بعد بدن میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ وحشت زدہ انداز میں کھڑا ہو گیا اور اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک ہولناک ویرانہ تھا۔ تاحد نظر سنگلاخ زمین نظر آ رہی تھی۔ کہیں کہیں اس میں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ دور دور تک کسی انسانی وجود کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کے دل میں خوف بسیرا کرنے لگا۔ وحشت زدہ آواز میں اس نے پکارا۔

"کوئی ہے۔ کوئی ہے یہاں۔" لیکن اس کی آواز ہوا میں بہتی چلی گئی۔ کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ غلام شیر کے بدن پر ہلکی سی کپکپی طاری ہو گئی۔ کہاں گزرا ہوا دن اور کہاں اس ویران دن کا آغاز' مگر یہ سب کیسے ہوا؟ کیا یہ بھی کوئی خواب ہے؟ اس نے اپنے منہ پر زوردار تھپڑ لگایا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ خود اس کے گال پر جلن ہونے لگی اور وہ اپنا گال سہلانے لگا۔ پھر اس کے منہ سے خوف بھری آواز نکلی۔

"کیا ماجرا ہے یہ؟ کیا ہو گیا ہے یہ سب کچھ؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کچھ سمجھ میں تو آئے۔" لیکن سمجھانے والا کون ہوتا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا' کپڑے جھاڑے اور ایک دم اسے احساس ہوا یہ وہ کپڑے بھی نہیں ہیں جو وہ پچھلے دن پہنے ہوئے تھا۔ بلکہ یہ اس کا اپنا لباس ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر گزرا ہوا وقت عالم خواب کا تھا تو اس وقت کیا ہے۔ یہ ویرانہ۔ یہاں تو دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے ذہن پر زور دینے لگا۔ اپنی بستی کے قرب و جوار کے علاقے بھی اس نے اچھی طرح دیکھے ہوئے تھے لیکن ایسی کوئی جگہ میلوں دور تک نہیں تھی۔ کئی بار دوستوں کے ساتھ سائیکلوں پر دور دور تک کے علاقے چھان مارے تھے لیکن ایسی تو کوئی جگہ آس پاس کہیں بھی نہیں تھیں۔ پھر یہ کیا مصیبت نازل ہوئی ہے مجھ پر' بہرحال وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ اس کے بعد ظاہر ہے یہاں رکنا بیوقوفی تھی۔ چنانچہ وہ وہاں سے چل پڑا۔ دور دور بلند و بالا ٹیلوں پر چڑھ چڑھ کر وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں دور سے اس کی بستی کے آثار نظر آ جائیں لیکن جب بھی کسی ٹیلے پر چڑھ کر دور تک دیکھتا تو اس جیسے ہزاروں ٹیلے اسے بکھرے ہوئے نظر آتے۔ چلتا رہا۔ پیاس اور بھوک نے حالت بری کر دی۔ دوپہر تک وہ مختلف سمتوں میں چکراتا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ اسے ایک درخت نظر آیا اور وہ اس کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ سورج کافی تیز ہو گیا تھا۔ اب اس میں آگے چلنے ہمت نہ تھی۔ دلیر اور بہادر لڑکا تھا ورنہ اگر کچے دل کا مالک کوئی شخص ہوتا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ پریشان بے شک تھا لیکن ان پریشانیوں کا حل تلاش کرنا چاہتا تھا۔ سورج سر پر سے گزر گیا۔ یہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی۔ پیاس کی شدت بھوک پر غالب آ گئی تھی۔ پانی مل جاتا تو شاید اتنی پریشانی نہ ہوتی' پانی کہاں تلاش کیا جائے۔ جب بھوک کی ٹیس کم ہو گئی تو ایک بار پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک سمت اختیار کر کے چل پڑا۔ وہ تو شکر تھا کہ یہاں وحشی جانور نہیں تھے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا درندہ نکل آیا تو کیا ہو گا؟ یہاں تو ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لکڑی تک نہیں ہے۔
وہ چلتا رہا اور سورج اپنا سفر طے کرتا رہا۔ سورج نے اپنے سفر کا اختتام کیا اور آرام کے لیے اپنی کمیں گاہ میں چلا گیا۔ رات سر ابھارنے لگی' شام کی کچلاہٹیں ختم ہو گئیں لیکن پہاڑی چٹانوں کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا لگتا تھا جیسے ساری دنیا ویران ہو گئی ہو۔ کیا کروں یہ تو بہت بری ہوئی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہیں انہی چٹانوں میں زندگی ختم ہو جائے۔ جب رات خاصی گہری ہو گئی تو وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ بدن تھکن سے چور ہو گیا تھا اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دماغ ماؤف سا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بار پھر ایک درخت نظر

آیا۔ جو گھنا تو نہیں تھا لیکن ایسا تھا کہ اس کے نیچے پناہ لی جا سکتی تھی۔ یہ بھی انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ بے جان پہاڑی چٹانوں میں اس درخت کا نظر آ جانا ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی انسان اس کے پاس آ گیا ہو۔ وہ درخت کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دیا۔ سر چکرا رہا تھا اور دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دفعتاً ہی اسے ایک آہٹ کا سا احساس ہوا اور اس نے چونک کر گردن اٹھائی۔ دوسرے لمحے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ عقبی سمت میں کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ایک چھوٹا سا پتھر تھا جس کے اوپر وہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا لیکن چونکہ رات ہو چکی تھی اس لیے اس کے نقوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ البتہ یہ محسوس کر کے کہ کوئی انسان یہاں ہے وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے پاس پہنچ گیا اور دوسرے لمحے اس کے دماغ کے بے شمار خانے روشن ہو گئے۔ چہرہ تو اس کا جانا پہچانا تھا۔ آہ۔ یہ تو۔ یہ تو کنہیا لال تھا۔ کنہیا لال جو اسے اس دوران ایک بار بھی یاد نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔

"دادا جی مہاراج۔" اس نے کہا۔

"ہاں ہاں دادا جی مہاراج! بیٹھ جا' بیٹھ جا۔" کنہیا لال کی آواز عجیب سی تھی۔ وہ بیٹھ گیا۔

"دادا جی مہاراج' یہ سب' یہ سب کیا ہے؟ مم.......... میں کہاں ہوں اور' اور دادا جی مہاراج کل کا دن گزرا تھا وہ؟"

"رک جا' رک جا' رک جا۔" کنہیا لال نے کہا اور پھر اپنی بغل میں لٹکے ہوئے تھیلے کو نکال کر سامنے کر دیا۔ تھیلا کھولا تو اس میں کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں۔ پینے کے پانی کی بوتل بھی تھی۔ یہ چیزیں اس نے غلام شیر کی طرف بڑھائیں تو غلام شیر نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر انہیں اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر اس کے بعد اسے کوئی خبر نہیں رہی تھی کہ کون دادا جی مہاراج' کہاں کے دادا جی مہاراج۔ کھانے پینے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جب اس نے پیٹ بھر کر پانی پی لیا تو اسے بڑا سکون محسوس ہونے لگا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں پھاڑیں اور کنہیا لال کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر دادا جی مہاراج۔ خدا کے لیے مجھے بتائیے تو سہی یہ سب کچھ کیا ہے؟"

جواب میں کنہیا لال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ "زندگی کے دو رخ۔"

"میں سمجھا نہیں دادا جی مہاراج! بتایئے تو سہی۔"

"کل کا دن کیسا گزرا تھا تمہارا؟"

"بہت اچھا۔ کیا آپ کو میرے کل کے گزرے ہوئے دن کے بارے میں معلوم ہے؟"

"ہاں معلوم ہے۔ کیا وہی تمہاری خواہش نہیں تھی؟ عالیشان حویلی' عیش و عشرت کی زندگی' بتاؤ کیا وہ سب کچھ تمہاری خواہش کے مطابق نہیں تھا؟"

"آپ کو.......... آپ کو.......... کیسے معلوم دادا جی' دادا جی مہاراج؟"

"معلوم ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے۔ وہ تھا تمہارا گزرا ہوا دن تمہاری خواہش کے مطابق اور آج کا دن اس دن کا الٹ تھا۔ مصیبتوں اور تکلیفوں سے بھرا ہوا۔ ایک بات بتاؤ بیٹا! تمہیں ان میں سے کون سا دن پسند ہے؟"

"یہ تو آپ کسی بچے سے بھی پوچھیں گے دادا جی تو وہ آپ کو بتا دے گا کہ گزرے ہوئے دن کی بات ہی کیا تھی۔"

"ہاں۔ پر فیصلہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ اگر جدوجہد کرتا ہے' کسی کی بات مانتا ہے تو اسے اس کی پسند کی زندگی ملتی ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم ان دونوں میں سے کون سی زندگی پسند کرو گے؟"

"فیصلہ کرنے کے لیے بھلا کسی کا انتظار کرنا ہے دادا جی مہاراج! ظاہر ہے گزرا ہوا دن میری زندگی کا انوکھا اور خوبصورت ترین دن تھا۔ دادا جی مہاراج! میں وہ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"گزار سکتے ہو بالکل گزار سکتے ہو' میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔"

"مگر دادا جی مہاراج! کیسے؟"

"پہلے فیصلہ کرلو۔"

"فیصلہ تو کر لیا ہے میں نے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں نے دوسری بات کہی تھی وہ بھی سن لو۔"

"کیا دادا جی مہاراج؟"

"اپنی پسند کا جیون گزارنے کے لیے مشکلات اٹھانی پڑتی ہیں۔ پہلے ان کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ میں نے تمہیں دونوں رخ دکھا دیئے ہیں۔ ایک چیز ہوتی ہے اکال ساگر۔"

"وہ کیا ہوتی ہے دادا جی مہارج؟"

"وہ میں تمہیں بتاؤں گا۔ یہ تو جانتے ہو کہ دین دھرم مختلف قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔ سارے دھرم ایک ہی بات کا پرچار کرتے ہیں کہ بھگوان کی پوجا کرو۔ انسان کی سیوا کرو۔ یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں لیکن ایک چیز اور ہوتی ہے۔ ایک دھرم اور ہوتا ہے۔ اگر تم اس دھرم کے پجاری بن جاؤ' اس دھرم کے داس بن جاؤ تو سمجھ لو گزرے ہوئے دن کی ساری نعمتیں تمہارے لیے ہیں۔"

"وہ کون سا دھرم ہے دادا جی مہاراج؟"

"کالا دھرم جو اکال ساگر میں ملتا ہے۔"

"دادا جی مہاراج! اس اکال ساگر کے بارے میں' میں بھرپور جانکاری چاہتا ہوں۔"

"وہ میں تمہیں دوں گا بیٹا وہ میں تمہیں دوں گا۔ چنتا ہی نہ کرو۔ میں تمہیں اپنا شاگرد بنانا چاہتا ہوں۔ تمہیں بہت سی باتیں بتاؤں گا اور اس کے بعد اس سنسار میں تمہیں جو مقام حاصل ہو جائے گا تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ تھکن تو دور ہو گئی ہے نا۔ میں تمہیں وہاں لے چلوں۔ جہاں ہمارے دھرم کے سب سے بڑے دھرماتما سے تمہاری ملاقات ہو سکتی ہے لیکن ان سے ملنے کے لیے پہلے کچھ راستے طے کرنا ہوتے ہیں۔"

"مگر دادا جی مہاراج! میں.........."

"نہیں کچھ نہیں۔ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ فیصلہ کرو کہ کون سا جیون چاہتے ہو۔ اگر تمہیں گزرے ہوئے کل کا جیون پسند ہے تو پھر یوں سمجھ لو کہ اس سنسار میں ہر چیز تمہاری ہوگی۔ جو چاہو گے اسے حاصل کر لو گے۔ میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا۔ کیا سمجھے؟ اپنی کہانی سناؤں گا میں تمہیں اور اس کے بعد تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ تمہیں کون سا جیون پسند ہے۔"

"ٹھیک ہے دادا جی مہاراج! اب آپ مجھے میرے گھر سے یہاں تک لے ہی آئے ہیں اور یہ سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے آ چکا ہے تو پھر تو میں یہی چاہوں گا کہ مجھے آپ سے سب کچھ معلوم ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ آ جا چل چلتے ہیں یہاں سے۔" اور اس کے بعد وہ دونوں تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ غلام شیر کی نوجوانی کی عمر تھی' بدن طاقتور اور توانا تھا۔ دن بھر کی مشقت نے بے شک تھکا دیا تھا لیکن پیٹ بھر جانے کے بعد سب ٹھیک ہو گیا تھا اور اب وہ اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ اسے چلنے میں کوئی دقت نہیں ہو

رہی تھی۔ حالانکہ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھ لیا تھا اور اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ دور دور تک کسی ذی روح کا وجود نہیں ہے' لیکن کنہیا لال کے ساتھ تھوڑا سا ہی سفر طے کیا تھا کہ اسے کافی فاصلے پر ایک روشنی نظر آئی۔ تاروں کی چھاؤں کے پس منظر میں کسی عمارت کے آثار بھی نظر آ رہے تھے' روشنی اسی عمارت میں ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔

"دادا جی مہاراج وہ سامنے روشنی ہے۔"

"ہاں۔ ہم اسی کی طرف چل رہے ہیں۔" کنہیا لال نے کہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اس ٹوٹی پھوٹی عمارت کے پاس پہنچ گئے جس کا رنگ گہرا کالا تھا اور جو تاروں کی مدھم چھاؤں میں بے حد بھیانک نظر آ رہی تھی۔ دور دور تک کچھ بھی نہیں تھا۔ بس یہ عمارت تھی۔ اس کے دروازے پر پہنچ کنہیا لال رکا اور اس نے پلٹ کر غلام شیر کی طرف دیکھا۔

"ڈر تو نہیں رہا؟"

"نہیں دادا جی' میں بزدل نہیں ہوں۔"

"تو آ اندر۔" عمارت بظاہر ٹوٹی پھوٹی نظر آ رہی تھی لیکن چھ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد جب وہ بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو غلام شیر نے ایک عظیم الشان چبوترا دیکھا جو دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دونوں سمت در بنے ہوئے تھے اور سامنے کا حصہ ایک بہت ہی بڑے در کی شکل میں تھا۔ جس کے اندر ایک وسیع دالان اور دالان کے اندر تین چھوٹے چھوٹے دروازے نظر آ رہے تھے۔ کنہیا لال یہاں پہنچ کر رکا اور پھر اس نے ایک در کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ ادھر بیٹھتے ہیں۔"

"مگر دادا جی یہ جگہ کون سی ہے؟"

"بس تو اسے مایا کنڈ کہہ سکتا ہے۔" غلام شیر نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلائی۔ کالی دیواروں والی یہ عظیم الشان عمارت دل پر ایک عجیب سی ہیبت طاری کر رہی تھی۔ اگر یہاں تنہا آیا جاتا تو شاید ساری بہادری رکھی رہ جاتی۔ بھیانک ماحول' ہُو کا عالم' چاند بھی چھپا ہوا تھا' بس ستارے ٹمٹما رہے تھے اور ان کی مدھم چھاؤں میں یہ عمارت دنیا کی بھیانک ترین عمارت محسوس ہو رہی تھی۔ جس در کے پاس وہ بیٹھے ہوئے تھے اس کے پیچھے بھی چھوٹی سی راہداری بنی ہوئی تھی جو گرد و غبار اور چھوٹے موٹے پتھروں سے اٹی ہوئی تھی البتہ چبوترا بڑا شفاف تھا۔ غلام شیر کنہیا لال کے اشارے پر بیٹھ

گیا۔ اب اسے کنہیا لال بے حد پُراسرار معلوم ہو رہا تھا جبکہ اس سے پہلے وہ ایک سیدھی سادی شخصیت کا مالک بنا ہوا تھا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے اور جب اس ماحول کے عادی ہو گئے تو غلام شیر نے کہا۔

"دادا جی مہاراج! آپ مجھے اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔" کنہیا لال نے نظریں گھما کر اسے دیکھا۔ اس وقت غلام شیر کو اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کنہیا لال اس وقت کس کیفیت کا شکار ہے۔ ان آنکھوں میں ایسی روشنیاں سی چمک رہی تھیں جو ایک لمحے میں اس کو مسحور کر دیتی تھیں۔ کنہیا لال اسے دیکھتا رہا اور غلام شیر کے دل میں خوف کی لہریں اٹھتی رہیں۔ پھر کنہیا لال نے کہا۔

"اکال ساگر۔ اکال ساگر کا باسی سنسار میں جتنی بڑی قوتیں رکھتا ہے' تُو سوچ بھی نہیں سکتا۔ جو لوگ اس کے چرنوں میں جا کر اس کی بڑائی قبول کر لیتے ہیں تو سمجھ لے کہ سنسار ان کے چرنوں میں ہوتا ہے اور اگر تُو میری بات مان لے گا تو یوں سمجھ لے کہ یہ سنسار تیرے چرنوں میں ہو گا۔ مجھے تجھ سے بہت سے کام لینے ہیں۔ تُو مجھے ملا ہے تو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے میرے دل میں کہ میں جن محرومیوں کا شکار تھا وہ دور ہونے والی ہیں اور اب تک میں نے اس طرح سے نہیں سوچا تھا۔ سمجھا؟"

"سمجھا تو کچھ نہیں ہوں دادا جی مہاراج! مگر سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"سمجھاؤں گا تجھے ایک ایک لفظ کر کے سمجھاؤں گا۔ بلکہ میرے بارے میں یہ بہتر ہے کہ میں تجھے کچھ نہ سمجھاؤں بلکہ وقت ہی تجھے سمجھاتا رہے۔ غلام شیر کی سمجھ میں واقعی کنہیا لال کی کوئی بات نہیں آ رہی تھی لیکن بہرحال وہ اب خوفزدہ نہیں تھا۔ خوفزدہ تو وہ پہلے بھی نہیں تھا لیکن بدلے ہوئے ماحول نے اس کی کیفیت بڑی عجیب کر دی تھی۔ پھر وہ اس ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ خود کنہیا لال کے دل میں کیا ہے۔ گزرے ہوئے واقعات تو واقعی بڑے عجیب تھے ایسا کوئی واقعہ ہو جائے گا' یہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔ بہرحال وقت خاموشی سے گزرتا رہا۔ چاند ان دنوں ذرا دیر سے نکلتا تھا۔ ابھی تک چاند کے آثار آسمان پر نظر نہیں آئے تھے۔ کافی دیر بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"کیا یہیں بیٹھے رہو گے دادا جی؟"

"ایں۔" کنہیا لال چونک پڑا۔ پھر اس نے جھانک کر آسمان کو دیکھا پھر بولا۔ "بس

تھوڑا سا انتظار اور کر لے۔ ابھی چندرما نکلنے والا ہے۔ جیسے ہی چندرما نکلے گا ہم مہاسابلی کے چرنوں میں پہنچ جائیں۔"

"عجیب عجیب نام لے رہے ہو تم۔ اکال' مہاسابلی' کیا ہے یہ سب کچھ؟"

"وہ جو کچھ ہے میں اس کے بارے میں تجھے بتا چکا ہوں۔ ہم کو اس کے چرنوں میں بہت بڑی پناہ ملے گی۔" پھر تھوڑی دیر کے بعد چاند نکل آیا اور جیسے ہی چاندنی نے زمین پر پہلی کرن ڈالی' کنہیا لال اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور غلام شیر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آجا۔ دروازے کھل چکے ہیں۔" غلام شیر کچھ بھی نہیں سمجھا تھا کہ کون سے دروازے کھل چکے ہیں۔ اس نے کسی دروازے کے کھلنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ کنہیا لال اسے ساتھ لے کر اس بڑے در کی جانب چل پڑا اور وہاں سے اندر داخل ہو گیا۔ پھر وہ ان چھوٹے تین دروازوں میں سے ایک دروازے سے گزرا اور اس بڑے ہال میں داخل ہو گیا جہاں ایک عجیب و غریب منظر نظر آ رہا تھا۔ یہاں یقینی طور پر گہری تاریکی چھائی رہتی ہو گی لیکن چھت کے ایک سوراخ میں سے چاندنی اندر داخل ہو رہی تھی اور اس چاندنی نے جس چیز کا احاطہ کیا ہوا تھا' وہ کسی دھات کا بنا ہوا ایک قد آدم مجسمہ تھا۔ اس قدر ہیبت ناک کہ دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بند ہو جائیں۔ غلام شیر نے بھی اس مجسمے کو دیکھا اور ایک لمحے کے لئے اس کا دل لرز کر رہ گیا۔ کنہیا لال نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔ اچانک ہی غلام شیر کو اپنے قدموں کے قریب ایک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک پھنکار سنائی دی۔ غلام شیر سہم کر رک گیا تھا۔ چاند کی روشنی نے ماحول کو جس قدر منور کر دیا تھا اس میں سب قرب و جوار کی چیزیں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ چنانچہ غلام شیر سہم کر دو قدم پیچھے ہٹا کیونکہ اس نے ان ننھی ننھی باریک آنکھوں کو دیکھ لیا تھا جو سو فیصدی کسی سانپ کی آنکھیں ہی ہو سکتی تھیں۔ سرخ چمکدار آنکھیں۔ سانپ نے ایک بار پھر ایک پھنکار ماری اور غلام شیر کی جانب لپکا لیکن اسی لمحے کنہیا لال نے جھک کر اس کا پھن اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور اسے اونچا کرتا ہوا بولا۔

"پتا نہیں سسرے مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ اب سزا بھگت۔" وہ شاید اب سانپ کے پھن کو دبانے لگا تھا۔ سانپ شدید تکلیف کے عالم میں اینٹھنے لگا اور پھر اس نے کنہیا لال کے پورے ہاتھ پر ایک گرفت قائم کر لی۔ کنہیا لال دیر تک اسے دباتا رہا اور آہستہ آہستہ سانپ کے بدن کی جنبش ختم ہوتی چلی گئی۔ پھر کنہیا لال نے کسی کیچوے کی طرح اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھول دیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"مہاکال کے چرنوں میں تیری یہ اکال' ہمت کیسے ہوئی سسرے' آخر جیون کھونا پڑا نا۔" اس نے حقارت بھری نگاہ سانپ پر ڈالی اور اس کے بعد اس مجسمے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ غلام شیر کے دل پر وحشت کا بسیرا تھا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے اس مجسمے کو دیکھ رہا تھا لیکن چاند کی روشنی نے مجسمے کے قدموں کا ماحول اجاگر کیا تو غلام شیر نے ایک اور منظر وہاں دیکھا۔ مجسمے کے قدموں میں سوکھی ہوئی انسانی کھوپڑیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ بدن کی دوسری ہڈیاں موجود نہیں تھیں۔ یہ صرف کھوپڑیاں تھیں جو اب ہلکی ہلکی سفیدی خارج کر رہی تھیں۔ غلام شیر کا دل لرز کر رہ گیا تو کنہیا لال نے کہا۔

"جے مہاکال تیرے چرنوں میں تیرا داس آیا ہے۔ مجھے شکتی دے' مجھے آشیرواد دے' میں تیرے چرنوں میں ایک اور بلی دینے جا رہا ہوں۔ ایک ایسی بلی جو تجھے پسند ہے۔ مہاکال میری مشکل دور کر دے۔ مجھے اتنی شکتی دے دے کہ میں اپنے دشمنوں سے اپنے آپ کو چھین سکوں۔ مہاکال میں بے بدن پھر رہا ہوں۔ میرا اپنا کوئی شریر نہیں ہے۔ مہاکال وہ مسلمان تیری قوتوں پر حاوی ہو رہا ہے۔ تو تو کہتا تھا کہ تو نے ایک ہی بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ جتنے ایمان والے ہیں' انہیں کمزور کرے اور جو تیرے اپنے ہیں انہیں اتنا شکتی مان بنا دے کہ وہ سارے سنسار میں تیرا راج پھیلا دیں پر ایسا کیوں ہے۔ دیکھ میں تو تیرے نام پر بڑھ رہا تھا اس پاپی نے مجھ سے میرا شریر چھین لیا۔ مہاکال مجھے میرا شریر دلا دے۔ میں جھوٹے بدن لئے لئے پھر رہا ہوں۔ میری شکتی مجھے واپس دے دے۔ اسے میرے ہاتھوں نیست و نابود کرا دے۔ جے مہاکال۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور پھر غلام شیر کی جانب دیکھنے لگا۔ غلام شیر کو اس کی آنکھیں دو روشن چراغ محسوس ہو رہی تھیں۔ ننھے ننھے سرخ بلب جو بری طرح چمک رہے تھے' جل رہے تھے۔ غلام شیر کے پورے بدن میں کپکپی کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور وہ دہشت بھری نگاہوں سے اس سارے ماحول اور منظر کو دیکھ رہا تھا جو اس قدر خوفناک تھا کہ کمزور دل کا کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر دہشت سے بے ہوش ہو جائے۔ پھر اس نے زبان کھولی اور کہا۔

"دادا جی مہاراج مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔"

"بیٹے اس سے زیادہ محفوظ تو کوئی جگہ نہیں ہے۔ دیکھ مہاسابلی کو۔ سارا جیون اکٹھا کئے ہوئے یہاں پدھارے ہوئے ہیں۔ وہ کچھ دینا چاہتے ہیں تم لوگوں کو جو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے دادا جی مہاراج لیکن یہاں سے کب چلو گے؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو ہمیں وہ سارے کام پورے کرنے ہیں جن کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔"

"وہ کیا کام ہیں دادا جی مہاراج؟"

"میں مہاکال کے چرنوں میں تیری بلی دوں گا۔"

"بلی کیا ہوتی ہے مہاراج؟" غلام شیر نے معصومیت سے پوچھا۔

"پگلے بلی وہ ہوتی ہے جسے دینے کے بعد تُو امر ہو جائے گا اور جیسا کہ میں نے تجھ سے وعدہ کیا سنسار میں جو کچھ ہے وہ سب تیرے لئے ہو جائے گا۔ ابھی تو تُو بچہ ہے تھوڑے عرصے کے بعد جوان ہوگا۔ تیرے من میں بہت سے خیالات آئیں گے۔ جو چاہے گا ہو جائے گا۔ سندر سے سندر ناری کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا تو وہ تیرے لئے باؤلی ہو جائے گی۔ سنسار میں جو من چاہے گا وہ حاصل کر سکے گا۔"

اچھا ایک بات بتاؤ اگر میں اپنے ماں باپ کو ایک بہتر اور شاندار زندگی دینا چاہوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"تُو ان کے لئے راج محل بنا سکتا ہے۔ راج محل میں راج کرا سکتا ہے انہیں۔ یہ چھوٹی سی بات تُو نے کیا سوچی۔"

"مگر دادا جی مہاراج بلی کیسے دی جاتی ہے؟"

"وہ میں تجھے بتاتا ہوں۔" کنہیا لال نے کہا اور پھر غلام شیر کو وہیں چھوڑ کر وہ اس شیطانی مجسمے کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہاں نہ جانے کیا کرتا رہا کیونکہ پیچھے کا منظر تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آرہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چار بڑی بڑی لوہے کی کیلیں تھیں اور ایک وزنی ہتھوڑا۔ اس نے مجسمے کے قدموں میں ان کھوپڑیوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر پیچھے کیا۔ کھڑکھڑاہٹ کی ہولناک آوازیں بلند ہوئیں تو غلام شیر کا دل ایک بار پھر لرز گیا۔ اس نے وحشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ اب تو سہا بھی نہیں جارہا تھا۔ اگر تنہائی ہوتی اور کنہیا لال قریب نہ ہوتا تو نہ جانے کیا حالت ہوتی۔ کنہیا لال نے ایک کھونٹے کو زمین پر رکھا اور پھر اسے نیچے ٹھونکنے لگا۔ کوئی ایک ایک فٹ کے کھونٹے تھے۔ اس نے ان کھونٹوں کو چھ چھ انچ کے قریب زمین میں ٹھونکا اور چاروں طرف یہ کھونٹے ٹھونک دیئے گئے۔ اس کے بعد اس نے ہتھوڑا ایک طرف رکھا اور پھر پیچھے چلا گیا۔ اس بار وہ رسیوں کا ایک لچھا لایا تھا۔ پھر اس نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"آ......... میں تجھے بتاؤں بلی کیسے دی جاتی ہے۔" غلام شیر آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا تو وہ بولا۔

"لیٹ جا یہاں۔"

"یہاں؟"

"ارے ہاں لیٹ جا' کوئی بات نہیں ہے۔ اپنے دادا جی مہاراج پر بھروسہ نہیں ہے کیا؟"

"بھروسہ تو ہے۔"

"تو پھر لیٹ جا' میں نے کہا نا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں کرتا رہ۔ تماشا تو دیکھ ہوتا کیا ہے۔" وہ بولا اور غلام شیر سہمے ہوئے انداز میں آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر وہ سانپ مردہ پڑا ہوا تھا جسے کنہیا لال نے ہاتھوں کی قوت سے مار دیا تھا۔ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

"دادا جی وہ!"

"مرا ہوا ہے' مرا ہوا ہے' لے۔" یہ کہہ کر کنہیا لال آگے بڑھا اور اس نے سانپ کے بدن میں پاؤں ڈال کر اسے ایک طرف اچھال دیا۔ سانپ دیوار سے ٹکرا کر دیوار کے کنارے ہی گر پڑا تھا لیکن اب اس کا فاصلہ اچھا خاصا ہو گیا تھا اور وہ روشنی میں تھا۔ کنہیا لال پھر واپس آگیا۔

"آ......... لیٹ جا۔"

"مگر آپ تو بتا رہے تھے کہ بلی کیسے دی جاتی ہے۔"

"باؤلے۔ وہی تو بتا رہا ہوں پر دیر مت کر۔ تھوڑی دیر بعد چندرما اپنی جگہ بدل لے گا۔ جلدی کر۔"

غلام شیر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس خوفناک جگہ زمین پر لیٹ گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے لاتعداد کھوپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کھوپڑیوں کا سفید ڈھیر اس سے صرف ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر تھا اور وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے یہ کیسے کیسے لوگ ہوں گے جن کی کھوپڑیاں اس وقت یہاں اس ویران اور ہولناک جگہ پڑی ہوئی ہیں اور نہ جانے یہ کھوپڑیاں یہاں کہاں سے آگئیں۔ جب وہ لیٹ گیا تو کنہیا لال اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھوں میں دبے ہوئے رسیوں کے ٹکڑوں کو غلام شیر کے ہاتھوں میں باندھنا شروع کر دیا۔

"یہ........ یہ آپ کیا کر رہے ہیں دادا جی مہاراج؟"

"بلی دینے کا طریقہ بتا رہا ہوں پاگل۔ چپ نہیں بیٹھا جاتا تجھ سے۔ مجھے میرا کام کرنے دے۔" کنہیا لال کے لہجے میں ایک عجیب سی سختی آگئی تھی۔ اس نے غلام شیر کی کلائی کو مضبوطی سے رسی میں لپیٹا اور پھر رسی کھونٹے سے باندھ دی گئی۔ غلام شیر نے سہمے ہوئے انداز میں سوچا' اگر ایسے موقع پر کنہیا لال کوئی ظلم کرنے پر اتر آئے تو اسے کیسے روکا جاسکتا ہے۔ کنہیا لال نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اسی طرح باندھ دیا اور غلام شیر سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"دادا جی مہاراج مجھے کھول دیجیے۔"

"ارے کھول دوں گا' کھول دوں گا۔ بلکہ تم خود اپنی زبان سے کہنا کہ کھل جا تو رسیاں کھل جائیں گی۔"

"میرے کہنے سے؟"

"وہی تو تجھ سے کہہ رہا ہوں بیٹا۔ بولتے کم ہیں' پہلے کام ہوجاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ غلام شیر کے پیروں کے پاس آ بیٹھا اور پھر غلام شیر کے دونوں پاؤں بھی رسیوں سے باندھ دیئے۔ غلام شیر کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر وہ اب کھلنے کی کوشش کرے تو کھل نہیں سکے گا۔ پتہ نہیں یہ بوڑھا دادا جی کیا کرانا چاہتا تھا۔ ایک بار پھر وہ اس جگہ گیا جو مجسمے کے عقب میں تھی اور اس بار وہ واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں دو چمکدار خنجر تھے۔ مڑے ہوئے خوفناک خنجر جنہیں دیکھ کر غلام شیر کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے خوف سے بند ہوگئی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کیے کیے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"دادا جی مہاراج۔"

"آنکھیں کھول دے' آنکھیں کھول دے بیٹا!" کنہیا لال بولا اور غلام شیر نے وحشت زدہ نگاہوں سے کنہیا لال کو دیکھا۔ دفعتاً کنہیا لال نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور دوسرے لمحے اس کے بدن سے ایک انتہائی سفید دھواں خارج ہونے لگا۔ یہ دھواں ایک لکیر کی شکل میں بلند ہو رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک باقاعدہ انسانی جسم کی ہیئت اختیار کر گیا جبکہ کنہیا لال کا بدن نیچے گر پڑا تھا اور وہ سفید ہیولا جو صرف ایک دھوئیں کی شکل میں تھا' ایک لطیف اور چمکیلا دھواں جو اپنے پیروں پر چل پھر رہا تھا اور جس کے دونوں ہاتھوں میں خنجر چمک رہے تھے' چند قدم پیچھے ہٹا۔ غلام شیر کی تو گھگھی بندھ گئی تھی۔ اب اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ خوف سے اس کا بدن سرد پڑتا

جارہا تھا۔ دانت بج رہے تھے۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے اس ساری کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ ہیولے نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر کنہیا لال کے جسم کو ٹھوکر مار کر اسی طرح پیچھے کر دیا جس طرح خود کنہیا لال نے سانپ کے بدن کو ٹھوکر سے پیچھے کر دیا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ ہیولا رقص کرنے لگا۔ وہ غلام شیر کے چاروں طرف چکرا رہا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ خنجروں کو نچا رہے تھے۔ اس کے ناچنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اس پر نگاہیں نہیں جمائی جارہی تھیں۔ کبھی وہ خاصی چوڑائی میں پھیل جاتا کبھی سکڑ کر ایک لکیر کی شکل اختیار کر لیتا۔ غلام شیر کا سانس دہشت سے بند ہوا جارہا تھا۔ یہ بات تو اس کی عقل سے بالکل ہی باہر تھی کہ دادا جی مہاراج کا جسم اب بے جان پڑا ہوا تھا اور سانپ کے عین برابر تھا۔ اب اس پُراسرار جگہ پر اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔ غالباً چاند کسی ایسی جگہ آگیا تھا جہاں سے دوسرے سوراخ اس کی روشنی کو اندر پھینک رہے تھے۔ شیطانی مجسمہ چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ایک بار غلام شیر کی نگاہیں مجسمے پر پڑیں اور اس کے حلق سے دہشت بھری آواز نکل گئی۔ مجسمے کی سرخ آنکھیں اب چاروں طرف گردش کر رہی تھیں اور انتہائی بھیانک ماحول پیدا ہوگیا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے دو سرخ لکیریں اِدھر اُدھر سر سے پاؤں تک گزر رہی ہوں اور غلام شیر کا خون خشک ہوتا جارہا ہو۔ یہ بھیانک ماحول خاصی دیر تک جاری رہا۔ پھر اچانک ہی سفید ہیولا نیچے جھکا اور اس نے خنجر کی نوک غلام شیر کے حلق پر رکھ کر دبائی اور غلام شیر کے حلق سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ڈری ڈری آواز میں کہا۔

"دادا جی مہاراج! دادا جی مہاراج۔" لیکن دادا جی مہاراج ہوتے تو بولتے۔ اب تو صرف یہ ہولناک سایہ اس کے گرد گردش کر رہا تھا۔ غلام شیر کو اپنے حلق سے بہنے والے خون کی چپچپاہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔ خون کی لکیر آہستہ آہستہ نیچے گر رہی تھی۔ تھوڑی دیر رقص کرنے کے بعد سفید ہیولا پھر جھکا اور اس بار اس نے غلام شیر کے سینے پر ایک چرکہ لگایا اور غلام شیر حلق پھاڑ کر چیخ اٹھا۔

"کیا کر رہے ہو تم' یہ کیا کر رہے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ یہ کیا کر رہے ہو تم؟" اچانک غلام شیر کو محسوس ہوا جیسے کوئی ہنس رہا ہو۔ ایک مدہم سی ہنسی جو آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھی اور اس کے بعد یہ ہنسی شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے ہنسی تیز ہوتی جارہی تھی ہیولے کے رقص میں تیزی آتی جارہی تھی۔ اسی وقت باہر سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور پھر قدموں کی آواز۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سے لوگ

اس طرف چلے آرہے ہوں۔ اچانک ہی ہیولا رک گیا۔ بالکل کسی انسان کی طرح اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر پھرتی سے وہ دوڑ کر اس مجسمے کے عقب میں چلا گیا۔ اندر آنے والے لمبے چوڑے قدو قامت کے مالک تین چار افراد تھے۔ چاند کی تیز روشنی میں آنے والوں کو بخوبی دیکھا جاسکتا تھا کہ لمبے چوڑے قدو قامت کے مالک خاص قسم کے لباس میں ملبوس تھے۔ ان کے شانوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ سب سے آگے والا آدمی تو ایک طرح سے پہلوان معلوم ہوتا تھا۔ چوڑا چکلا سینہ' بڑی بڑی مونچھیں' آنکھوں میں دحشت خیزی۔ اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"آوازیں اسی طرف سے آرہی تھیں۔"

"وہ دیکھئے مالک۔" ایک دوسرے آدمی نے غلام شیر کی جانب اشارہ کیا اور لمبے تڑنگے قدو قامت کا مالک شخص چونک گیا۔ پھر وہ آگے بڑھ کر غلام شیر کے پاس پہنچ گیا۔

"ارے یہ تو زندہ ہے۔ باندھ رکھا ہے کسی نے اسے۔" باقی لوگ چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ جس آدمی نے غلام شیر کی جانب اشارہ کیا تھا وہ بھی تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کھولو اسے کھولو۔" لمبے تڑنگے آدمی نے اپنی گونج دار آواز میں کہا اور ان میں سے ایک نے خنجر نکال لیا۔ پھر وہ اس کی رسیاں کاٹنے لگے اور چند لمحوں کے بعد غلام شیر کے ہاتھ پاؤں آزاد ہوگئے۔ وہ جلدی سے اٹھ گیا تھا۔ لمبے آدمی نے کہا۔

"لڑکے تیری گردن اور سینے سے خون بہہ رہا ہے۔"

"جناب! میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ ہم.......... میں۔"

"ٹھہر جاؤ۔ جابر! جاؤ باہر سے مرہم پٹی کا سامان لے آؤ۔"

"ابھی آیا مالک۔" ایک اور آدمی نے کہا اور لمبے تڑنگے آدمی نے دوسرے آدمی کو حکم دیا۔

"مشعلیں روشن کرلو۔"

"جی مالک۔" پھر تھوڑی دیر کے بعد باہر سے چند مشعلیں اندر آگئیں۔ چاند کی روشنی بے شک اس بڑے سے کمرے کے بیشتر حصے کو روشن کر رہی تھی لیکن مشعلوں کے آنے سے یہاں کا ماحول منور ہوگیا۔ دفعتاً ہی غلام شیر نے کہا۔

"جناب عالی! اس مجسمے کے پیچھے ایک سفید رنگ کا انسان چھپا ہوا ہے جو ہوا کی شکل میں ہے۔"

"دیکھ جابر کون ہے۔" لمبے تڑنگے آدمی نے کہا اور اس کے ساتھ موجود آدمی پیچھے کی جانب دوڑ گیا۔ ادھر باہر سے جو شخص اندر آئے تھے وہ غلام شیر کے زخم پر ٹیپ لگانے لگے۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گردن کے زخم پر باقاعدہ پٹی باندھی گئی تھی۔ لمبا تڑنگا آدمی بغور غلام شیر کو دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے مشعل کی روشنی چاروں طرف ڈالی تو غلام شیر کی نگاہیں بھی کنھیا لال کے بدن کی جانب اٹھ گئیں۔ لمبے تڑنگے آدمی نے کہا۔

"یہ کون ہے؟"

"دادا جی مہاراج! میرا مطلب ہے کنھیا لال۔"

"کون کنھیا لال؟ دیکھو اسے۔" اب کئی آدمی اندر آچکے تھے۔ غلام شیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں لیکن بہرحال وہ لوگ کنھیا لال کی طرف پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے کنھیا لال کے جسم کو ٹٹول کر دیکھا اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ تو مردہ ہے۔ اس کی لاش سے بدبو اٹھ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کئی دن سے اس کی لاش یہاں پڑی ہوئی ہے۔" پھر اچانک ہی وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور اپنے دوسرے آدمیوں کو ہوشیار کرتا ہوا بولا۔

"سانپ' سانپ۔" غلام شیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ سانپ جسے کنھیا لال نے مار کر پھینک دیا تھا۔ برق رفتاری سے لہریں لیتا ہوا ایک طرف دوڑ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ اسے ہلاک کرنے کی کوشش کرتے وہ ایک سوراخ میں گھس کر غائب ہوگیا حالانکہ وہ خاصی دیر سے مردہ پڑا ہوا تھا اور غلام شیر اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا لیکن نہ جانے سانپ زندگی کیسے دوڑ گئی تھی۔ ادھر جابر اس پورے کمرے کی تلاشی لینے کے بعد واپس آیا اور لمبے چوڑے آدمی کے قریب پہنچ گیا۔

"مالک! کچھ بھی نہیں ہے البتہ یہ دو خنجر پڑے ہوئے ملے ہیں۔" اس نے دونوں خنجر سامنے کرتے ہوئے کہا جن پر خون لگا ہوا تھا۔ غلام شیر بے اختیار چیخ پڑا۔

"یہ.......... یہ' یہی تو تھے اس کے ہاتھ میں۔ انہی سے اس نے میرے زخم لگائے ہیں۔"

"مگر کون؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے اور یہاں داخل ہونے کا دروازہ ایک ہی ہے۔"

"میں نہیں جانتا' میں نہیں جانتا وہ.........." غلام شیر جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگیا تب ان میں سے ایک نے کہا۔

”مالک! یہ شیطانی چرخہ معلوم ہوتا ہے۔ آؤ یہاں سے باہر نکل چلو۔“

”مجھے کسی شیطانی چرخے کی پرواہ نہیں ہے۔ میرا مرشد میرے ساتھ ہوتا ہے اور ہزار آنکھوں سے میری حفاظت کرتا ہے۔ خیر چلو بچے کو باہر لے چلو۔ کھلی ہوا میں چل کر اس سے پوچھیں گے کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ ویسے بڑا سمجھدار اور بہادر بچہ معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اس وحشت ناک ماحول میں تو اچھے اچھے ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔“

وہ لوگ غلام شیر کو سہارا دے کر باہر نکل آئے۔ ہولناک کھنڈر اب اس وقت اچھا خاصا پُررونق ہو گیا تھا۔ باہر تیرہ افراد تھے۔ چھ سات گھوڑے تھے۔ ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ لوگ کھنڈر سے باہر نکل آئے تھے۔ لمبے چوڑے قد و قامت کے شخص نے کہا۔

”جابر! بندے اوپر چڑھا دیئے ہیں؟ ان سے کہو پوری طرح ماحول پر نظر رکھیں۔ ہم لوگ نیچے آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”جی مالک! یہاں آتے ہی اونچی جگہیں سنبھال لی گئی ہیں۔ ویسے مالک چاروں طرف تو سناٹا پھیلا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کوئی پرندہ بھی اس وقت ہوش میں آکر نہیں اڑ رہا ہے۔“

”پہلے بھی کہہ چکا ہوں تم سے کہ صرف اپنا کام کرو۔ اپنے آپ کو چوکس رکھو۔ سب ٹھیک ہوتا ہے جہاں دوسرے کے بارے میں سوچ کر مطمئن ہو گئے، وہیں سمجھ لو کہ تباہی کا آغاز ہو گیا۔“

”جی مالک، جی مالک۔“ اس شخص نے کہا اور اس کے بعد وہ لوگ انتظامی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ غلام شیر کو حیرت تھی کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پے در پے پیش آنے والے واقعات اس کے لئے اس قدر ناقابل یقین تھے کہ وہ چکرا کر رہ گیا تھا لیکن بہرحال کھلی ہوا نے اس کے حواس پر اچھا اثر ڈالا اور وہ اس لمبے چوڑے آدمی کے کہنے پر ایک صاف ستھری جگہ پر لیٹ گیا۔ بدن میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ واقعات کو یاد کر کے دماغ خراب ہوا جا رہا تھا۔ پھر وہ لمبا چوڑا آدمی اس کے پاس آ گیا اور اس نے غلام شیر کی کلائی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میرا نام نعمت خان سنگھی ہے۔ کبھی سنا ہے یہ نام تم نے۔“ غلام شیر کے دماغ کی چرخیاں گردش میں آ گئیں۔ یہ نام اچھی طرح سماعت آشنا تھا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے ہی کی بات ہے۔ بستی سے کوئی دو میل دور ایک بڑا میلہ لگا تھا۔ اس میلے میں غلام شیر بھی اپنے دوستوں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ گھر سے اجازت لے کر نہیں گیا تھا

بلکہ گھر والوں کو بتائے بغیر دوستوں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اچانک میلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے نعرے لگنے لگے۔

”نعمت خان سنگھی، نعمت خان سنگھی۔“ نعمت خان سنگھی ڈاکو تھا اور میلہ لوٹنے آیا تھا۔ پھر غلام شیر نے نعمت خان سنگھی کے بارے میں بہت سی باتیں سنی۔ نعمت خان سنگھی ایک انتہائی خوفناک ڈاکو تھا اور ان علاقوں میں اس نے پولیس کو نچا رکھا تھا۔ بے شمار ڈاکے ڈالے تھے اس نے اور بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ غلام شیر نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا تو نعمت خان مسکرا کر بولا۔

”تیرے چہرے سے اندازہ ہو رہا ہے لاڈلے کہ تُو سنگھی کو جانتا ہے۔“

”نہیں جناب، ہاں جناب۔“

”نہیں بیٹا نہیں۔ بہادر لوگ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ نعمت خان سنگھی ڈاکو ہے۔ بہت سے ڈاکے ڈال چکا ہے۔ بہت سے لوگوں کو پکڑ چکا ہے۔ مگر ایک بات میں تجھے بتا رہا ہوں۔ ماں نے کہا تھا بیٹا! موت اگر تمہاری گردن پر ہاتھ رکھے ہوئے ہو اور تم بچنے کا کوئی بھی راستہ تلاش نہیں کر سکتے ہو تب بھی سچ بولنا۔ جھوٹ مت بولنا۔ بس کیا تُو یقین کرے گا لڑکے کہ ایک بار میں ایک فقیر کے بھیس میں پکڑا گیا تھا۔ اس سالے پولیس والے نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے اس سے مقابلہ نہیں کیا۔ یہ سوچ کر کہ کوشش کر کے بچ نکلوں گا۔ جب اس نے مجھ سے اندر لے جا کر معلومات حاصل کیں اور پوچھا کہ میں کون ہوں تو میں نے صاف بتا دیا کہ میں نعمت خان سنگھی ہوں۔ اس نے مجھے لاک اپ میں بند کر دیا۔ میں لاک اپ توڑ کر بھاگ نکلا۔ چار پولیس والے مار دیئے میں نے پر جھوٹ نہیں بولا۔ بس میں تیرا باپ نہیں ہوں کہ تجھے نصیحتیں کروں۔ پر ابھی تو میں تیرا دوست ہوں۔ ہو سکتا ہے تو میرے ہی ہاتھوں مارا جائے مگر میں تجھ سے ایک بات کہوں۔ سچ بولنا جھوٹ مت بولنا۔ آگے تیری مرضی ہے۔ تجربہ کر کے دیکھ لینا سچ ہمیشہ فائدہ دیتا ہے۔ نام کیا ہے تیرا؟“

”غلام شیر۔“ غلام شیر نے جواب دیا۔

”واہ رے واہ۔ ہے تو شیروں جیسا ہی پر تُو بتا رہا تھا کہ اس بڈھے کا نام کنہیا لال ہے جسے تو دادا جی مہاراج کہہ رہا تھا اور جو وہاں مرا ہوا پڑا تھا۔“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے جناب! آپ کہاں اپنا وقت ضائع کریں گے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ نے میری زندگی بچا ہی لی ہے تو مجھے میری بستی تک پہنچا دیجئے۔ ایک

آدمی بھیج دیجئے میرے ساتھ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر جیسی آپ کی مرضی۔"
"وہ پہنچا دیں گے' پہنچا دیں گے۔ ہمارا علاقہ ہے یہ۔ مہمان بنا ہے تو ہمارا۔ کچھ وقت ہمارے ساتھ گزار بچے دیکھ ڈاکوؤں کی زندگی بھی کیا ہوتی ہے۔" سنگلی ہنسنے لگا غلام شیر کو اس کی یہ ہنسی بہت خوفناک محسوس ہوئی تھی۔ بہرحال وہ جن مشکلات میں گرفتار ہوا تھا۔ ان کے تحت کسی کا مہمان بننا تو کیا ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ وہ خود کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے اس کے دل میں تجسس شدید تھا۔ نعمت خان سنگلی کا نام اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ نام وحشت کی علامت تھا اور اچھے اچھے اس نام کو سن کر کانپ جاتے تھے۔ ایک اتنا خطرناک ڈاکو اسے اپنا مہمان بنا رہا ہے۔ یہ بات بذات خود بڑی سنسنی خیز تھی۔ ویسے تو بہت سی باتیں سنسنی خیز تھیں۔ کنہیا لال جو کچھ ثابت ہوا تھا۔ وہ بھی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ وہ شیطانی مندر' وہاں موجود مجسمہ' کھوپڑیوں کا ڈھیر' اس خوفناک ہیولے کا رقص' وہ سب کچھ بھلا کوئی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ ہاں۔ اگر سمجھ میں آنے والی بات نہیں تو یہ ضرور تھی کہ غلام شیر ایک مضبوط دل کا مالک تھا جو بڑے اطمینان سے یہ ساری خوفناک باتیں برداشت کر گیا تھا۔ آخر کار نعمت خان سنگلی اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ کالے رنگ کی ہیبت ناک پہاڑیوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک خوفناک ویرانی نظر آ رہی تھی لیکن ان کالے پہاڑوں کے نیچے ایک عظیم الشان دنیا آباد تھی۔ سوراخوں کے دوسری طرف زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔ گھوڑے باندھنے کے لئے وسیع و عریض اصطبل پہاڑی کے کٹاؤ میں موجود تھے۔ دو تین جیپیں بھی موجود تھیں۔ بے شمار افراد ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ سنگلی اندر داخل ہو گیا۔ غلام شیر کو یہ سب کچھ انتہائی عجیب لگ رہا تھا۔ کیسی پراسرار دنیا تھی یہ' یہاں ڈاکو رہتے تھے۔ نعمت خان سنگلی غلام شیر کو ساتھ لئے ہوئے اندر پہنچا اور پھر مختلف راستے طے کرتا ہوا وہ ایک ایسے غار میں داخل ہو گیا جس کا دروازہ چوکور بنا دیا گیا تھا۔ غار اندر سے بالکل صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ اندر بڑے نرم قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک شاندار مسہری لگی ہوئی تھی۔ دو لڑکیاں اس مسہری کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں اور مسہری پر ایک بہت زیادہ عمر رسیدہ عورت لیٹی ہوئی تھی۔ نعمت سنگلی غلام شیر کو وہاں لے کر پہنچ گیا اور بولا۔

"اماں! دیکھ کون آیا ہے۔ یہ تمہارا مہمان ہے مجھ سے تو خیر تم ناراض ہو لیکن مہمان کو خوش آمدید کہو۔ اسے تھوڑے دن اپنے ساتھ رکھو' اس سے باتیں کرو۔" پھر

نعمت سنگلی نے پاس بیٹھی لڑکیوں سے پوچھا۔
"اماں ٹھیک تو ہے نا؟"
"جی سردار صاحب۔" لڑکیوں نے جواب دیا اور سنگلی نے گھور کر انہیں دیکھا اور بولا۔
"کتنی بار کہا ہے تم سے کہ ماں کے سامنے مجھے سردار نہ کہا کرو۔ میری سردار میری ماں ہے۔" بوڑھی عورت کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمودار ہو گئے اور اس نے رخ تبدیل کر لیا۔ سنگلی نے ایک نگاہ سے دیکھا اور پھر گردن جھکا کر واپسی کے لئے پلٹ گیا۔ غار کے دروازے پر رک کر اس نے پلٹ کر کہا۔
"غلام شیر! مہمان صرف ماں کے پاس رہ سکتے ہیں۔ یہ مقدس اور پاکیزہ جگہ ہے اس پوری آبادی میں۔ باقی سب ڈاکوؤں کے ڈیرے ہیں۔ تو باہر آنا چاہے تو آ کر سب جگہوں کو دیکھ سکتا ہے لیکن تیرا قیام ماں کے پاس ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ جب اسے گئے ہوئے کچھ دیر گزر گئی تو عمر رسیدہ عورت نے کروٹ تبدیل کی۔ غلام شیر ابھی تک کھڑا ہوا تھا وہ جلدی سے بولی۔
"ارے ارے بیٹے! آ' بیٹھ جاؤ۔" غلام شیر زندگی کے انوکھے تجربوں سے دوچار ہو رہا تھا۔ جو کچھ وہ سن چکا تھا وہ سب کا سب نیا اور حیرت انگیز تھا۔ ایسی انوکھی کہانیاں بھلا کب کسی کے علم میں آئی ہوں گی۔ غلام شیر آہستہ سے چلتا ہوا بوڑھی عورت کے پاس مسہری پر جا بیٹھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی اس نے مدھم لہجے میں کہا۔
"بیٹا! میں دونوں پیروں سے معذور ہوں۔ چل نہیں سکتی محسوس نہ کرنا میری بات کو' کہاں سے پکڑ کر لایا ہے یہ ظالم تمہیں کیا ہوا ہے۔ پہلے کبھی کسی کو اس طرح پکڑ کر نہیں لایا۔"
"نہیں اماں جی! نعمت خان مجھے پکڑ کر تو نہیں لائے۔ وہ مجھے میری بستی پہنچانے کا وعدہ کر کے لائے ہیں اور ایک طرح سے آپ یوں سمجھ لیجئے کہ میں اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں۔"
"خدا کا شکر ہے ورنہ میرے ذہن میں تو یہ بات آئی تھی کہ اب اس سنگدل نے انسانوں کی خرید و فروخت بھی شروع کر دی ہے اور تجھے شاید وہ کسی بستی سے پکڑ کر اس لئے لایا ہے کہ کسی کے ہاتھ فروخت کر دے۔"
"نہیں اماں جی! آپ یقین کریں وہ ایک اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے

کہ وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور سچ کے آگے کسی چیز کو کچھ نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ برے تو نہیں ہوتے۔" بزرگ عورت نے آنکھیں بند کرلیں پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

"خدا جانے' وقت جانے' تقدیر جانے۔ کون کیا ہے یہ اللہ ہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔ مگر تم کہاں بھٹک رہے تھے جو وہ تمہیں اپنے ساتھ لے آیا؟"

"ماں جی! بس آپ یوں سمجھ لیجئے کہ بہت ہی عجیب و غریب اور برے حالات کا شکار ہوں۔ پتہ نہیں غلطی کس کی ہے میری یا میرے ماں باپ کی یا پھر میری تقدیر کی۔"

"یہ زخم کیسے ہیں تمہاری قمیض پر خون بھی لگا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے تمہاری گردن پر کسی نے چھری پھیرنے کی کوشش کی ہو۔"

"ہاں ایسی ہی بات ہے۔"

"اچھا خیر میں بلاوجہ تمہیں پریشان کئے جا رہی ہوں۔ چلو لڑکیوں' بچے کے لئے کچھ لے کر آؤ۔" دونوں لڑکیاں اپنی جگہ سے اٹھ کر غار کے دروازے سے باہر چلی گئی تھیں۔ غلام شیر بے شک بہت برے حالات سے گزر رہا تھا لیکن یہ یقینی بات تھی کہ اس کی طبیعت میں دلیری اور بہادری تھی۔ وہ وقت سے متاثر ہونا نہیں جانتا تھا۔ جو کچھ اس پر بیتی تھی وہ بے حد سنسنی خیز تھی لیکن اب بھی وہ دہشت سے بے حال نہیں ہوگیا تھا۔ بوڑھی عورت کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"اماں جی! آپ سنگلی کی ماں ہیں۔" بوڑھی عورت کے چہرے پر شرم کے آثار پھیل گئے پھر اس نے شرمندگی سے کہا۔

"ہاں بیٹے! میں ماں ہی ہوں اس کی۔"

"مجھے کچھ ایسا لگا تھا جیسے آپ ان سے ناراض ہیں۔" غلام شیر بولا۔ عورت نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بولی۔

"بیٹے! کیا ایک شریف اور خاندانی عورت اپنے ڈاکو بیٹے سے خوش رہ سکتی ہے۔ حالات نے اسے بے شک ڈاکو بنا دیا لیکن انہی حالات سے مقابلہ کرنا تو زندگی کی نشانی ہوتی ہے۔ اس کا باپ ایک محنت کش اور دلیر انسان تھا۔ جس نے ساری زندگی عزت سے گزاری۔ وہ حالات تو اسے بھی درپیش تھے جن حالات نے نعمت خاں سنگلی کو ڈاکو بنا دیا۔ ہم سنگلی قبیلے کے لوگ ہیں۔ محنت اور جفاکشی ہمارے قبیلے کا امتیازی نشان ہے۔ برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں اور برائی تو شیطان کی پھیلائی ہوئی ہوتی ہے۔ بس اسی شیطان سے بچنا تو انسان کا اصل کام ہے۔ سنگلی کے باپ کو قتل کر دیا گیا۔ ڈاکوؤں کی تقریباً تمام ہی

کہانیاں یکساں ہوتی ہیں۔ نعمت سنگلی انتقام پر آمادہ ہوگیا حالانکہ میں نے اسے سمجھایا کہ اپنا مسئلہ اللہ پر چھوڑ دے' وہی ان درندوں سے انتقام لے گا جنہوں نے ہم پر زندگی تلخ کر دی تھی اور آخر کار میرے شوہر کی جان لے لی تھی لیکن سنگلی صبر نہیں کر سکا اور اس بے صبری نے اسے ڈاکو بنا دیا۔ میں اس وقت سے اس سے ناخوش ہوں' میں نہیں چاہتی کہ وہ لوگوں پر ظلم کرے۔ وہ بہت اچھا انسان ہے لیکن بس اس کے جنون نے اسے ڈاکو بنا دیا ہے۔" بوڑھی عورت کی آواز لرز گئی اسی وقت دونوں لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ بہت ہی اعلیٰ قسم کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر آئی تھیں اور اس ٹرالی پر بہترین خشک میوے اور چائے کا سامان موجود تھا۔ بوڑھی عورت نے کہا۔

"لو بیٹے! ہم یہاں پر تم کو تازہ پھل تو مہیا نہیں کر سکتے لیکن باقی تمہاری خاطر مدارت میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھیں گے۔" غلام شیر پر عجیب عجیب حالات منکشف ہو رہے تھے اور اب حالات کا یہ سلسلہ نہ جانے کون کون سا رخ اختیار کرنے والا تھا۔

چائے کے برتن غلام شیر کے سامنے رکھ دیئے گئے۔ بوڑھی عورت نے کہا۔ "بیٹے بے تکلفی سے کھاؤ اگر تم نے تکلف کیا تو مجھے دکھ ہوگا۔"

"جی........." غلام شیر نے کہا۔ کھانے پینے کا اسے خود بھی شوق تھا۔ کھانے پر ٹوٹا تو ایسے کہ سب کچھ بھول گیا۔ بوڑھی مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جب غلام شیر خوب شکم سیر ہوگیا تو اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا اور پھر شرمندہ ہوگیا اور پھر اٹھ کر بولا۔

"معافی چاہتا ہوں۔ میری ماں مجھے پیٹو کہا کرتی ہے۔"

"میں تم سے تمہاری کہانی سننا چاہتی ہوں۔ مگر آج نہیں۔ ابھی تم میرے مہمان رہو گے۔ ویسے ایک بات بتاؤ۔ ماں کے پاس فوراً جانے کو دل تو نہیں چاہتا۔"

"نہیں۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔ اور کچھ دن مجھے یہاں رہنے کا موقع ملے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"تم میرے مہمان ہو' جب تک دل چاہے یہاں رہو' چلو بٹیا مہمان کو آرام کی جگہ دکھا دو......... جاؤ بیٹے آرام کرو۔" غلام شیر اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔

☆======☆--------☆

سندر لال دو تین دن تک تو انتظار کرتا رہا کہ کنہیا لال اپنی پسندیدہ جگہ سے واپس آجائیں لیکن جب کنہیا لال کی طرف سے کوئی خبر ہی نہ ملی تو وہ پریشان ہوگیا۔ سندر لال

کو بھی اب باپ سے خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور خاص طور سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اس کے دونوں سالوں نے کنہیا لال کو زہر دیا تھا' وہ خود بڑا شرمندہ ہوگیا تھا۔ سندر لال خود ہی سندر کے پاس پہنچا تھا۔

"بڑے بھیا پتا جی کو کئی دن ہوگئے ہیں' آئے نہیں ہیں وہ۔ کیا بھیجا تھا آپ نے کسی کو انہیں لینے کے لئے.........؟"

"نہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ خود ہی آجائیں گے۔"

"نہیں بڑے بھیا ہم انہیں اس طرح نہیں چھوڑ سکتے اب تک جو ہوچکا ہے وہی بہت برا ہوا ہے۔ آپ چلے جائیے یا پھر میں چلا جاتا ہوں۔"

"نہیں ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں انہیں لینے کے لئے۔" سندر لال نے کہا اور پھر وہ دیال چند جوشی کے گھر پہنچ گیا وہاں جوشی تو موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی البتہ موجود تھی۔ ان لوگوں کے تو حالات ہی بدل گئے تھے جو کچھ سندر لال انہیں باپ کے کہنے پر دے گیا تھا' ابھی وہ زمین میں دفن کر دیا گیا تھا اور دیال چند جوشی نے یہ طے کیا تھا کہ دکان کے برابر دو سری دو دکانیں اور خریدے اور ان میں خوب بہت سا مال بھروا دے اور گھر بنوا لے۔ باقی رقم بیٹیوں کی شادی کے لئے مخصوص کر دے بلکہ بیوی سے بات کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ بھاگوان ابھی رشتے ناطے کی بات مت کرنا۔ ذرا گھر بن جائے' دکان بڑی ہو جائے' کاروبار پھیل جائے اور لوگوں کو پتا چلے کہ جوشی بھی کچھ ہے۔ تب پھر اچھے گھروں کے رشتے دار آئیں گے۔ ہم نے جتنی رقم ان کے لئے رکھ لی ہے' اسے لے دے کر ہم ان لوگوں کے لئے اچھے سے اچھا رشتہ مانگ سکتے ہیں۔ بیوی بھی اس بات پر تیار ہوگئی تھی۔ بہرحال سندر لال نے جوشی کی بیوی سے کہا۔

"بہن جی جوشی جی تو دکان پر ہوں گے آپ ذرا میرے پتا جی کو بلا دیجئے۔"

"کنہیا لال جی........."

"ہاں۔ اندر ہیں وہ.........؟"

"نہیں بھائی جی۔ وہ تو تین چار دن ہوئے یہاں سے چلے گئے........."

"ہیں........." سندر لال کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں' وہ چلے گئے........."

"مگر کہاں' گھر تو نہیں پہنچے؟"

"گھر نہیں پہنچے؟"

"بالکل نہیں........."

"پھر کہاں گئے.........؟"

"مگر تمہیں انہیں اکیلا نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔ جوشی جی سے میری بات تو ہوگئی تھی۔ تمہیں یقین ہے بہن جی کہ وہ تین چار دن سے گھر واپس نہیں آئے........."

"ہاں سرکار۔ بھلا اس میں بھی یقین نہ ہونے کی بات ہے' آپ گھر میں دیکھ لیں۔"

"میں جوشی کے پاس جاتا ہوں۔ یہ تو برا ہوا۔" سندر لال نے کہا اور پھر وہ دیال چند جوشی کی دکان پر پہنچ گیا۔ سندر لال کو دیکھتے ہی جوشی ہاتھ جوڑ کر نیچے اتر آیا تھا۔

"جے ہو مہاراج کی۔ کیسے ہیں آپ۔ بڑے مہاراج کیسے ہیں؟"

"بڑے مہاراج ہی کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں تمہارے پاس۔ تمہارے گھر سے ہو کر آیا ہوں۔"

"ہم سمجھے نہیں سرکار؟" جوشی نے حیرت سے کہا۔ سندر لال غور سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اسے جوشی کے چہرے پر سادگی نظر آئی۔ اس نے کہا۔

"جوشی بڑے مہاراج کہاں ہیں آخر؟ تمہارے ہاں چھوڑ کر گئے تھے انہیں۔"

"مگر سرکار وہ تو چلے گئے تھے........."

"میں نے تم سے کہا تھا کہ ان کا خیال رکھنا۔ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہیں اور ان کے ہوش و حواس ٹھیک نہیں ہیں۔"

"سرکار بتائے بغیر چلے گئے تھے ہمیں۔ شاید آپ کو اس بات کا پتا ہو کہ انہوں نے کریم شیر کو بیس ہزار روپے دے کر اس سے اس کا بیٹا غلام شیر خریدا ہے۔ بس غلام شیر کو لے کر وہ چلے گئے تھے پھر اس کے بعد واپس نہیں آئے۔"

"بیٹا خریدا ہے؟" سندر لال نے بڑے پریشان لہجے میں کہا۔

"ہاں مہاراج۔ کریم شیر ہماری بستی میں رہتا ہے۔ مسلمان لڑکے کو خریدا ہے انہوں نے۔ ہم تو خود حیران تھے پر مالک کی بات مالک ہی جانتے ہیں۔"

"یار تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔" سندر لال نے کہا اور دیال چند جوشی نے ساری تفصیل سندر لال کو بتا دی۔

"ہے بھگوان جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ دماغی خرابی کے عالم میں کر رہے ہیں۔ لڑکا کتنا بڑا ہے وہ.........؟"

"اچھا خاصا ہے سرکار' سمجھدار ہے' تیز چالاک ہے۔"

"یہ نہیں پتا کہ وہ کہاں گئے ہیں؟"

"بالکل نہیں........"

"دیال چند تم ایسا کرو کہ دکان بند کرو اور میرے ساتھ گھر واپس چلو' کریم شیر سے معلومات حاصل کریں گے۔" کریم شیر سے بھی کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی تھیں۔ سندر لال پریشان گھر پہنچ گیا اور اس نے مہندر لال کو ساری تفصیل سنائی تو مہندر لال بولا۔

"غلطی ہماری ہی ہے بڑے بھیا۔ آپ بتاؤ کیا وہ اس قابل تھے کہ ہم انہیں گھر سے باہر چھوڑ دیں؟"

"قید کر کے بھی تو نہیں رکھ سکتے تھے۔ علاج کرانے بھی نہیں لے جا سکتے تھے۔"

"اب کیا کریں........؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ انتظار ہی کرنا پڑے گا۔ ذرا وید جی کے پاس چلے جاؤ اور ان سے معلوم کرو کہ انہیں تو کچھ نہیں پتا۔" بیچارے ہری لال جی اس گھر کے بہت وفادار تھے۔ مہندر لال کے ساتھ ہی گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے یہی کہا تھا کہ انہیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ بہرحال کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ وید جی الگ پریشان تھے اور انہوں نے سندر لال سے یہی کہا تھا کہ اس دوران ان کی ملاقات کنہیا لال جی سے ہوئی ہی نہیں۔ بہرحال کنہیا لال کا یہ عمل سب کے لئے حیران کن تھا۔ بیس ہزار روپے میں انہوں نے ایک لڑکا خرید لیا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ دونوں بیٹے کچھ بھی پتا نہیں چلا سکے تھے کہ ایک دن سوامی جی سندر داس وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک سادھو منش انسان تھے۔ جنگلوں' پہاڑوں اور ویرانوں میں گھومتے رہتے تھے۔ جاپ کیا کرتے تھے لیکن تھے نیک دل انسان کسی کے خلاف تو کبھی کچھ کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے بس دین دھرم کی باتیں بتاتے رہتے تھے۔ کنہیا لال سے دوستی تھی کبھی کبھی یہاں آجایا کرتے تھے۔ اس بار بھی کوئی ڈیڑھ سال کے بعد وہ یہاں پہنچے تھے۔ جب بھی وہ گھر آتے ان کی بڑی خاطر مدارت ہوا کرتی تھی۔ سب لوگ ہی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ سوامی جی کا استقبال پہلے کی طرح نہ کیا گیا۔ کیونکہ سب ہی پریشان اور الجھے ہوئے تھے لیکن جیسے ہی سوامی جی اندر داخل ہوئے انہوں نے گھر کے ایک ملازم سنتو سے کہا۔

"سنتو یہ گھر میں بدبو کیسی آرہی ہے؟"

"مجھے تو نہیں آرہی سوامی جی۔"

"کچھ ہوا ہے اس گھر میں۔ کیا ہوا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کہاں گئے یہ سارے کے سارے؟"

"سوامی جی مہاراج آپ کو کنہیا لال جی کا واقعہ تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا۔" اتنی دیر میں سندر لال اور مہندر لال بھی سامنے آگئے تھے۔ سنتو تو چلا گیا۔ وہ دونوں سوامی جی کو اندر لے گئے۔

"معاف کیجئے گا سوامی جی۔ آپ کے آنے کی خبر تو ہمیں مل گئی تھی مگر ہم ذرا پریشان تھے۔ آپ ٹھیک ہیں؟ آرام سے اپنی رہائش گاہ میں چلے جائیے۔ آپ کا کمرہ ہمیشہ کی طرح آپ کے لئے محفوظ ہے۔"

"مجھے کچھ وقت دو گے تم لوگ؟"

"ہاں ہاں کہئے کیا بات ہے؟"

"سنتو سے میں ابھی یہی کہہ رہا تھا کہ گھر میں کوئی بدبو سی آرہی ہے۔ اچھا تم یہ بتاؤ کنہیا لال کہاں ہے؟"

"آپ کو ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوا مہاراج؟" سندر لال نے کہا اور سوامی جی مہاراج چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر بولے۔

"کیا؟"

"آئیے' آپ کو بیٹھ کر بتاؤں بلکہ اچھا ہوا آپ آگئے ہو سکتا ہے آپ اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکیں۔" سندر لال سوامی مہاراج کو لے کر اپنے مہمان خانے میں داخل ہو گیا جہاں سوامی جی کے لئے ایک کمرہ ہمیشہ محفوظ رہا کرتا تھا۔ سوامی جی کچھ پریشان سے بیٹھے ہوئے تھے۔

"ہاں بتاؤ کیا ہوا؟"

"مہاراج یہاں تو بہت کچھ ہو گیا۔ زیادہ دن پہلے کی بات نہیں ہے۔ اچانک ہی پتا چلا کہ پتا جی کا دیہانت ہو گیا اور ہم سب نے ان کا کریا کرم کیا۔ پتا یہ چلا کہ پتا جی کو زہر دیا گیا تھا۔ بہرحال ان کا کریا کرم کر کے ہم انہیں شمشان لے چلے لیکن راستے میں کسی پراسرار طریقے سے ارتھی سے ان کی لاش غائب ہو گئی اور ہم خالی ارتھی لے کر شمشان گھاٹ پہنچ گئے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ لاش غائب کیسے ہوئی۔ بڑی لے دے مچی پھر ہم چتا میں خالی ارتھی رکھ کر واپس آگئے۔ بڑی سنسنی پھیل گئی تھی یہاں۔ تھوڑا ہی سے گزرا تھا کہ ہماری بستی کے ایک بزاز نے ایک عجیب و غریب اطلاع دی۔ وہ

یہ تھی کہ پتا جی مہاراج اس کے پاس موجود ہیں۔ ہم تو حیران رہ گئے۔ بہرحال وہاں جا پہنچے۔ پتہ چلا کہ پتا جی اسے راستے میں ملے تھے۔ کھوئے کھوئے اپنے آپ سے بے خبر۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے ہمیں پہچان لیا۔ مجھے سندر لال کہہ کر مخاطب کیا۔ سندر اور سارے گھر والوں کو بھی جانتے تھے وہ لیکن اپنے بارے میں پوچھتے تھے کہ میں کون ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں ہے۔ بہرحال ہم انہیں یہاں لے آئے۔ دیال چند جوشی یعنی اس بزاز سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ تھوڑے دن کے بعد وہ پھر بزاز کے ہاں چلے گئے۔ اس کی کچھ مالی مدد کی تھی انہوں نے لیکن خیر بزاز نے اتنی سیوا کی تھی پتا جی کی کہ اسے کچھ دینا ہمیں برا نہیں لگا۔ بہرحال مہاراج یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں۔ دوبارہ ہم بزاز کے ہاں پہنچے کہ پتا جی کو گھر لے آئیں تو پتا چلا کہ وہ بزاز کے ہاں سے چلے گئے تھے اور انہیں گئے ہوئے بھی تین چار دن گزر چکے تھے۔ ایک اور اطلاع اس بزاز نے دی' وہ یہ کہ محلے کا ایک لڑکا جو مسلمان کا بیٹا تھا۔ بیس ہزار روپے میں اسے خرید اور اسے لے کر چلے گئے۔ اس کے بعد سے ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ہم نے خفیہ طور پر اپنے آدمیوں کو بستی میں پھیلا دیا' باہر جانے والے راستوں پر بھی دیکھ لیا گیا۔ کچھ آدمی اب بھی آس پاس والی بستیوں میں گئے ہیں تاکہ پتا جی کے بارے میں معلومات حاصل کریں لیکن ان کا کہیں کوئی پتا نہیں ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا مہاراج کہ کیا ہوا ہے یہ۔"

سوامی مہاراج پُرخیال انداز میں گردن ہلا رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا۔ "سندر لال! یہاں تیری اس حویلی میں' میں نے جس بدبو کا ذکر کیا تھا تجھ سے' وہ کوئی ایسی ویسی بدبو نہیں تھی۔ کوئی بہت ہی گندی آتما یہاں سے گزری ہے یا یہاں آکر رہی ہے۔ یہ اسی کی بدبو ہے جو اب تک پھیلی ہوئی ہے۔ تم اس دنیا میں رہنے والے ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ سب گیان دھیان کی باتیں ہیں۔ میں تین دن تک ایک جاپ کروں گا اس کے بعد پتہ چلے گا کہ اصل واقعہ کیا ہوا ہے۔ کنہیا لال کہاں چلا گیا ہے۔ ساری تفصیل میں تمہیں تین دن کے جاپ کے بعد بتاؤں گا۔"

"مہاراج! ہم آپ کے داس ہیں ہمیشہ ہی آپ کے چرنوں میں رہے ہیں اور آپ ہم پر مہربانیاں کرتے رہے ہیں۔ مہاراج آپ آرام سے جاپ کریں مجھے جگہ بتا دیں جہاں آپ جاپ کرنا چاہیں اور یہ بھی بتا دیں کہ میری ذمہ داری کیا ہوگی۔"

"بس سندر لال' ایک سنسان سی جگہ ہمیں بتا دے اور بس اس بات کا خیال رکھنا کہ تین دن تک کوئی ہمارے پاس نہ آئے ہمیں پریشان نہ کرے۔"

سندر لال نے حویلی کے وسیع و عریض حصوں میں سے ایک گوشہ سوامی مہاراج کے لئے منتخب کیا اور ان کے کھانے پینے کی چیزیں ان تک پہنچا دیں۔ یہ ایک برجی تھی جس میں سوامی مہاراج دھونی رما کر بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنے چلے کا آغاز کر دیا۔ بہرحال سندر لال کے دل میں نہ جانے کیا کیا خیالات تھے۔ گھر کے معاملات تو چل ہی رہے تھے۔ باپ بہرحال باپ ہوتا ہے سندر لال کے ذہن میں بہت سے خیالات آتے تھے کنہیا لال کے بارے میں اور وہ تین دن گزرنے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ تین دن گزرنے کے بعد جب سوامی مہاراج اپنی اس رہائش گاہ سے برآمد ہوئے تو سندر لال تھوڑے فاصلے پر کھڑا بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سوامی مہاراج کے چہرے کو دیکھا۔ اس چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس سے سندر لال نے یہی اندازہ لگایا کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے سوامی مہاراج کے پاؤں چھوئے تو سوامی مہاراج نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ادھر آجا بیٹے۔ اکیلے میں جو کچھ میں تجھے بتانا چاہتا ہوں وہ تیرے لئے دکھ کی خبر ہے۔"

"میں سمجھا نہیں مہاراج۔"

"آجا میں تجھے سمجھاتا ہوں۔" سوامی مہاراج نے کہا اور اسے لئے ہوئے اسی سنسان گوشے کے ایک حصے میں بیٹھے۔ اِدھر کوئی نہیں آتا تھا اور ویسے بھی سندر لال نے ان دنوں منع کر رکھا تھا کہ کسی بھی کام سے کوئی بھی شخص اس طرف نہ آئے۔ تین دن تک وہ خود شدید نگرانی کرتا رہا تھا کہ سوامی مہاراج کو ان کا جاپ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ سوامی مہاراج کے الفاظ نے سندر لال کے چہرے پر پیلاہٹ دوڑا دی تھی اس نے کہا۔

"جلدی بتایئے مہاراج ہوا کیا ہے؟"

"بیٹا کہانی تو لمبی ہے لیکن یہ تین دن جو میں نے صرف کئے ہیں بلاوجہ نہیں کئے۔ ان تین دنوں میں' میں اس واردات کا سارا کچا چٹھا تلاش کر لایا ہوں۔ پہلی بات تو میں تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کنہیا لال جی اسی دن مر گئے تھے جس دن تم لوگوں کو اس کا علم ہوا۔"

"میں سمجھا نہیں مہاراج۔"

"سیدھی سیدھی سی بات ہے سندر لال کہ وہ اسی دن مر چکے تھے جس دن تم نے

ان کی ارتھی بنائی اور لے کر چلے۔"

"مگر مہاراج' وہ ارتھی پر سے غائب ہو گئے تھے۔"

"ہاں اس کی ایک وجہ تھی۔"

"کیا؟"

"وہی تجھے بتانے جارہا ہوں۔"

"جلدی بتایئے مہاراج' میرا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا ہے۔"

"ہاں بیٹا بات ہی ایسی ہے۔"

"تو بتایئے کیا ہوا؟"

"چھوٹی سی ایک اطلاع ہے تیرے لئے۔ بہت دور کی بات ہے ایک بستی میں ہیرا اچھوت نامی ایک شخص رہتا تھا۔ ہیرا' اچھوت تھا اور تم جانتے ہو کہ اچھوتوں کے ساتھ برہمن کیا سلوک کرتے ہیں۔ بڑی عجیب سی بات ہے۔ وہ یوں تھا کہ ہیرا نوجوان تھا اور جوانی کسی بھی بات کو خاطر میں نہیں لاتی۔ دریا پار برہمنوں کی بستی تھی۔ ایک برہمن کی بیٹی ہیرا کو پسند آئی اور وہ اس کے پیچھے پیچھے پھرنے لگا لیکن جب برہمنوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے ہیرا کو پکڑ بلوایا اور مار مار کر اس کی ہڈی پسلی توڑ دی۔ انہوں نے اسے بہت زخمی کر دیا اور پھر دریا میں پھنکوا دیا۔ ہیرا بدکار آدمی تھا۔ وہ دریا میں بہتا ہوا ایک جگہ جا نکلا۔ وہاں اسے ایک سنیاسی بابا ملا۔ یہ کالا علم جانتا تھا اور پہاڑوں میں بیٹھا اپنے گندے علوم کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے ان گندے علوم سے کام لے کر بہت سی لڑکیاں اغوا کرالی تھیں اور ان کے ساتھ وہاں سختیاں کرتا تھا۔ ہیرا کو یہ ماحول ملا تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے سنیاسی مہاراج کے چرن چھوئے اور ان سے کہا کہ وہ اسے اپنا شاگرد بنا لیں۔ اس نے اتنی خدمت کی اس کالے جادو والے کی کہ وہ اس سے خوش ہو گیا۔ اب ہیرا نے اپنے دل کی بات کہی اور سوامی مہاراج نے یعنی اس کالے جادو والے نے برہمنوں کی اس لڑکی کو اغوا کرا لیا اور اسے ہیرا کے سپرد کر دیا۔ لڑکی ہیرا سے نفرت کرنے لگی۔ اس نے اس سے کہا کہ اسے واپس بھیج دے لیکن ہیرا اب بھلا اسے کہاں چھوڑ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی نے خودکشی کرلی۔ ہیرا کو اس کا کوئی خاص افسوس نہیں ہوا۔ اب اس کا دماغ بدل گیا تھا۔ کالے جادو والے کے ساتھ رہ کر وہ اس سے گندہ علم بھی سیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حسین لڑکیاں اس کی خدمت میں آجاتی تھیں۔

دونوں شیطان یہ کام کرتے تھے کہ ادھر سے ایک مولوی کا گزر ہوا۔ یہ ایک

مسلمان عالم تھا جو بہت دین دار تھا اور اسے بہت کچھ علم آتا تھا۔ یہ دونوں شیطان اسے نظر آئے تو وہ وہاں رک گیا اور اس نے ان سے کہا کہ وہ لڑکیاں جنہیں وہ اغوا کر کے لائے ہیں ان کے گھروں کو واپس پہنچا دی جائیں لیکن یہ نہ مانے بلکہ انہوں نے اس مسلمان عالم سے جادو کی جنگ کی مگر یہ اس پر قابو نہیں پاسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سوامی تو مارا گیا ہیرا اچھوت بھی شدید زخمی ہوا۔ عالم نے اس کا جسم اپنی قید میں کر لیا لیکن اس کی آتما اس کے علم کے ذریعے باہر نکل گئی تھی اور وہ وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ مولوی نے اس کا بدن اپنے قبضے میں کر لیا اور اسے لے کر چل پڑا پھر اس نے اس کے بدن کو ایک علم کے حصار میں قید کر لیا اور وہ بدن آج تک مولوی کے علم کے حصار میں ہے لیکن ہیرا اچھوت کی آتما بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اب وہ بالکل بے یارو مددگار رہ گیا تھا لیکن کالے جادو والے نے اسے جو علم سکھایا تھا اس سے کام لے کر وہ دوسرے جسموں میں منتقل ہونے لگا۔ اس نے معلومات کیں کہ اس کا بدن اسے کیسے حاصل ہو سکتا ہے تو اسے پتہ چلا کہ سات پائیل بچے قربان کرنا پڑیں گے۔ سات پائیل بھینٹ پڑیں گے اگر ان میں سے ایک بھی کم رہ گیا تو اس کی ساری شکتی ختم ہو جائے گی۔ یعنی وہ اپنا جسم نہیں حاصل کر سکے گا۔ وہ پائیلوں کی تلاش میں چل کھڑا ہوا اور پھر اس نے کئی پائیل مار دیئے۔ شیطان کے چرنوں میں وہ ان کی بلی دیتا تھا۔ اس وقت وہ ادھر سے گزر رہا تھا جب تم لوگ کنھیا لال کی ارتھی لے جارہے تھے۔ اس وقت اس کی آتما کو ایک بدن کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے خاموشی سے کنھیا لال کے جسم میں داخل ہو کر درختوں کی ایک شاخ پکڑی جس کے نیچے سے تم گزر رہے تھے۔ تم لوگوں کو احساس نہیں ہو سکا حالانکہ ارتھی ہلکی ہو گئی ہو گی۔ کنھیا لال وہاں سے نیچے اترا لیکن وہ اصل کنھیا لال نہیں تھا بلکہ ہیرا اچھوت کی آتما کنھیا لال کے شریر میں تھی۔ بس اس کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور جیسا کہ تم نے بتایا وہ ایک مسلمان لڑکے کو لے کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ اب وہ کہاں ہے یہ بات تو میں نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے کہ سات قربانیاں دینے کے بعد اسے اس کا جسم مل جائے اور وہ کسی اور کام سے لگ جائے۔ فی الحال وہ یہاں سے چلا گیا۔ تمہارے لئے بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ اب تمہارے پتا اس سنسار میں نہیں ہیں۔ ان کے لئے بس بھگوان سے دعا کرو۔ اس کے علاوہ اگر تم یہ سوچو کہ وہ حاصل ہو جائیں گے تمہیں تو یہ تمہاری بے وقوفی ہے۔ اگر بھگوان نہ کرے وہ واپس آبھی جائیں تو یہ سمجھنا کہ وہ کنھیا لال نہیں ہیں بلکہ ان کے شریر میں ہیرا اچھوت ہے۔"

سندر لال کانپ کے رہ گیا تھا اس خبر سے وہ شدید غم کا شکار ہوا تھا کہ اس کے پتا اس سنسار میں نہیں ہیں لیکن اسے جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں وہ بڑی سنسنی خیز تھیں جادوگروں کی دنیا میں اس طرح کے کام ہوتے رہتے ہیں چنانچہ وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

☆------☆------☆

نعمت خان سنگلی بدستور ڈاکے ڈال رہا تھا وہ راتوں کو نکل جاتا تھا اور پھر اس کے بعد اس کی واپسی کا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا تھا۔ پہاڑوں کی یہ زندگی غلام شیر کو بھی پسند آئی تھی باہر کی ہنگامہ آرائیوں سے یہ پُرسکون فضائیں بہت اچھی تھیں۔ وہ اکثر اپنے گھر کو بھی یاد کرتا رہتا تھا۔ نعمت خان سنگلی کی ماں کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ نعمت خان بھی جب آتا مسکرا کر اسے دیکھتا۔ کنہیا لال نے جو زخم اس کے لگائے تھے اب وہ بالکل ٹھیک ہو چکے تھے اچھی غذا اور اچھی دیکھ بھال نے اس کی صحت بہت اچھی کر دی تھی۔ اب یہاں سے کہیں باہر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا کیونکہ جو کچھ اس پر بیت چکی تھی وہ بہت ہی خوفناک تھی اور اکثر کبھی کبھی خوابوں میں وہ خوفناک کنہیا لال کو دیکھ لیتا تھا تو اس کا دل دہشت سے کانپنے لگتا تھا۔ اس کی سمجھ میں اب بھی نہیں آیا تھا کہ آخر کنہیا لال اسے ہلاک کیوں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تو اس کی بڑی خدمت کی تھی لیکن یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ ایک دن اس نے رات کو خواب دیکھا اور اس کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا۔ دوسری صبح کو ماں نے اسے دیکھا تو بولی۔

"کیا بات ہے بیٹا غلام شیر' کیسی طبیعت ہے تیری' بڑا نڈھال نظر آ رہا ہے چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔"

"ماں جی' میں نے رات کو پھر وہی خواب دیکھا ہے۔" غلام شیر نے کہا۔

نعمت خان سنگلی کی ماں کو غلام شیر ساری تفصیلات بتا چکا تھا۔ وہ خود حیران تھی۔ کہنے لگی۔ "خواب تو خواب ہوتے ہیں بیٹے۔ تو ان خوابوں کی پرواہ نہ کیا کر۔ یہاں میں ہوں ہمارے بہت سے ساتھی ہیں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ ذرا ایک بار پھر مجھے اپنے ماضی کے بارے میں بتا۔"

"بس کیا بتاؤں ماں جی' اپنے گھر میں رہتا تھا۔ بہت غریب آدمی تھے ہم لوگ' بہت سے بہن بھائی تھے میرے۔ پھر ٹھاکر کنہیا لال نے بیس ہزار روپے میں مجھے خرید لیا اور اس کے بعد میری خوب خاطر مدارت کی اور پھر نہ جانے کہاں کہاں گھماتا ہوا اس کالے

مندر میں لے آیا اور وہاں اس نے ایک خوفناک مجسمے کے سامنے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں یقیناً وہ کوئی گندے علم کرنے والا ہوگا۔ خدا غارت کرے ایسے لوگوں کو نہ جانے کہاں کہاں سے اپنی ناپاک خواہش لے کر دنیا میں آ جاتے ہیں اور پھر شیطان کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔"

"ماں جی' بڑا ڈر لگتا ہے مجھے میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں جادو کے بارے میں' میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن اب مجھے پتا چلا کہ جادو کیا چیز ہوتی ہے ماں جی' اس نے ایک سانپ کو مار کر پھینک دیا تھا اور پھر جب نعمت خان سنگلی وہاں پہنچے تو وہ سانپ زندہ ہو کر بھاگ گیا۔"

"کمال ہے' کیا چیز ہوتی ہے یہ جادو! کاش کچھ پتہ ہوتا مگر خوابوں کو دیکھنے کے بعد تو خوف نہ کیا کر۔ میں ہوں میری زندگی میں تیرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"ایک بات بتا۔"

"جی۔"

"کیا تیرا دل اپنے ماں باپ کے پاس جانے کو چاہتا ہے؟"

ماں کے سوال پر غلام شیر سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔"

"ماں باپ بہن بھائیوں کے پاس جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"نہیں ماں جی اب تھوڑا بہت میں بھی سوچنے لگا ہوں۔"

"کیا؟"

"ویسے تو کنہیا لال کا ساتھ مجھے اچھا لگا تھا کیونکہ سچی بات تو یہ ہے کہ گھر میں نہ کھانے کو ہوتا تھا اور نہ پینے کو' پھر ایسے ماں باپ کو یاد کرنے سے کیا فائدہ جنہوں نے مجھے صرف بیس ہزار لے کر بیچ دیا۔ میں نہیں جانتا بیس ہزار کتنے ہوتے ہیں اور ان سے کتنے کام بن سکتے ہیں لیکن میرے پیدا ہونے کے بعد میرے ماں باپ نے مجھ پر بہت روپے خرچ کیے ہوں گے۔ جو لوگ مجھے بیس ہزار میں بیچ سکتے ہیں میں انہیں یاد نہیں کرتا۔"

"ٹھیک کہتا ہے۔" ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ پھر بولی۔ "لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔"

غلام شیر خاموش ہو گیا تھا۔ وہ لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ نعمت خان سنگلی آگیا۔ ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ ”ماں اب تو تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہی۔“

ماں نے نگاہیں اٹھا کر نعمت خان کو دیکھا پھر بولی۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو نعمت خان؟“

”میں نے تمہیں اپنے بدلے میں ایک بیٹا دے دیا ہے حالانکہ اس نوجوان کو دیکھ کر مجھے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اگر میں اسے اپنے راستے پر لگا دوں تو کچھ عرصے کے بعد غلام شیر کا نام قرب و جوار کی آبادیوں میں دہشت کی علامت بن جائے گا۔ مجھے اس لڑکے کی آنکھوں میں بڑی ذہانت نظر آتی ہے۔ یہ ایک بہترین ڈاکو بن سکتا ہے لیکن ماں میں اپنے ذہن سے یہ خیال نکال چکا ہوں۔ یہ ڈاکو نہیں بنے گا۔ یہ تیرا بیٹا بنے گا بلکہ ابھی کچھ دن پہلے میرا ایک ساتھی مجھے مشورے دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ نعمت خان اس لڑکے کو یہاں سے نکال دو۔ کہیں اور پہنچا دو۔ ماں کے ساتھ یہ شہر میں رہے گا۔ اسے تعلیم دلاؤ اور ماں کی تمام آرزوؤں کو اس کی شکل میں پورا کر دو۔ وہ جو کچھ تمہیں دیکھنا چاہتی تھی وہ اسے بنا دو۔ کیا کہتی ہو ماں اس سلسلے میں‘ میری ایک تجویز ہے اس لڑکے کو لے کر تم شہر چلی جاؤ۔ میں وہاں تمہارے لئے ہر طرح کا بندوبست کر دوں گا۔ ایک شاندار گھر‘ ملازم‘ ساری چیزیں مہیا کر دوں گا۔ وہاں تم دونوں ماں بیٹے کی حیثیت سے رہنا۔ کوئی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا کہ تم ڈاکو نعمت خان سنگلی کی ماں ہو۔ اس لڑکے کو بھرپور تعلیم دلاؤ۔“

ماں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور نعمت خان سنگلی تڑپ گیا۔ ”ارے میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے ماں؟“

”بس ٹھیک ہے رے میں نہیں جاؤں گی۔ یہ بچہ بہت اچھا ہے مجھے بڑا عزیز ہے لیکن یہ میرا نہیں ہے۔ نعمت خان‘ میرا بیٹا تو تُو ہے۔ تُو جب بھی یہاں سے کہیں جاتا ہے تو میں تسبیح لے کر بیٹھ جاتی ہوں‘ تُو انسانوں کی گردنیں کاٹتا ہے انہیں لوٹتا ہے اور میں اللہ کے حضور گڑگڑاتی ہوں عاجزی سے کہتی ہوں کہ الٰہی میرے بیٹے کو معاف کر دینا الٰہی وہ ہر مشکل سے محفوظ رہے۔ بڑی شرمندہ ہوتی ہوں میں نعمت خان اللہ کے سامنے‘ میرا ضمیر مجھے شرمندہ کرتا ہے کہتا ہے کہ بڑھیا تُو اس بیٹے کے لئے دعائیں مانگ رہی ہے جو اس وقت بھی دوسری ماؤں کے بیٹوں کو زندگی سے محروم کر رہا ہوگا۔ میں رو کر کہتی ہوں میرے اللہ میں کیا کروں۔ نعمت خان تُو نے اگر مجھے شہر بھیج دیا تو مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ تو

ڈاکا ڈالنے جا رہا ہے میں کیسے دعائیں کروں گی تیرے لئے اور کیسے مجھے صبر و سکون رہے گا کہ میرا بیٹا خیریت سے واپس گھر آگیا۔“

نعمت خان بری طرح بگڑ گیا تھا۔ ”تُو ہمیشہ جذباتی باتیں کرتی ہے‘ ہمیشہ جذباتی باتیں کرتی ہے تُو۔“

”اگر اس میں سے کوئی بات غلط ہے تو بتا دے۔ یہ سچائیاں نہیں ہیں جو تُو کہہ رہا ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن تُو یہ بات غلط کہہ رہا ہے کہ تُو نے اپنے بدلے اسے مجھے دے دیا تیرا بدلہ تو کہیں ہو ہی نہیں سکتا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ کبھی کسی وقت پولیس میرے پیچھے لگ کر یہاں آسکتی ہے۔ ان پہاڑوں پر ریڈ کر سکتی ہے اور اس کے بعد ہر ہتھیار استعمال ہو سکتا ہے۔ تُو بھی زخمی ہو جائے گی۔“

”زخمی تو میں ہوں بیٹے‘ تجھے کیا معلوم میں کس قدر زخمی ہوں۔“ ماں نے کرب سے کہا اور نعمت خان گردن ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ دل پر ضربیں تو لگتی تھیں لیکن وقت نے جو کچھ دیا تھا اب اس سے خود گردن موڑ لینا نعمت کے بس کی بات نہیں تھی۔ ادھر غلام شیر بھی یہ ساری باتیں سن رہا تھا یہ سب کچھ اپنی جگہ تھا ادھر سانپ کے روپ میں ہیرا اچھوت باہر نکل کر بھاگا تھا۔ شیطان کے مندر میں وہ غلام شیر کی بلی دینا چاہتا تھا۔ اس بلی کے بعد اسے غلام شیر کا جسم مل جاتا۔ ایک نوجوان لڑکے کا جسم۔ یہ اس نے بہت دیر کے بعد سوچا تھا اس سے پہلے اس نے بہت سے جسم اپنائے تھے اور الٹے سیدھے کام کرتا رہا تھا لیکن اس کی کارکردگی بہت زیادہ اچھی نہیں رہی تھی۔ غلام شیر کو دیکھ کر اس نے یہ سوچا تھا کہ ایک طاقتور بدن حاصل کرنے کے بعد وہ اس مولوی سے جنگ کرکے اپنا جسم چھیننے کی کوشش کرے گا۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ اپنا بدن حاصل کر لے۔ باقی جہاں تک اس کے کالے علوم کا تعلق تھا تو وہ اس قدر اسے حاصل تھے کہ وہ اس سے بہت سے کام لے سکتا تھا۔ ہاں اگر ساری بلی پوری ہو جائے تو پھر اسے ایک مہان شکتی حاصل ہو سکتی تھی۔ بہت سے جذبے تھے اس کے دل میں مولوی کے خلاف کام کرنے کا جذبہ۔ دل میں اس نے سوچا تھا کہ اپنا بدن حاصل کرنے کے بعد وہ ان سارے مسلمان عالموں کو ختم کرے گا جو کالے جادو کا توڑ کر سکتے ہیں۔ کالے جادو کے فروغ کے لئے وہ اعلیٰ پیمانے پر کام کرے گا۔ یہ سارے خیالات اس کے دل میں مچلتے تھے اور وہ مکمل طور پر کوششیں کرتا تھا۔ اس نے کئی منتر پڑھے تھے جن سے اسے شیطان کی

قربت حاصل ہو گئی تھی لیکن یہ بات اس کے علم میں آچکی تھی کہ شیطان کسی کو بھی طاقت نہیں دیتا بلکہ جو خود طاقتور ہوتے ہیں انہیں حاصل کر کے ان کی مدد کرتا ہے۔ یہ پورا ایک الگ شیطانی کھیل تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہیرا اپنے علوم میں ماہر ہو کر شیطان سے معاہدہ کرتا' وہ مولوی اس سے ٹکرا گیا تھا جس نے اس کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا اور نہ صرف یہ بلکہ اس کا بدن چھین لیا تھا اس سے' اور اس طرح ہیرا کی آتما اس سنسار میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور اسے مسلسل شکست ہو رہی تھی۔ سانپ کی حیثیت سے وہ بہت دور نکل بھاگا اور پتھروں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

نعمت خان سنگلی اس لڑکے کو لے کر چل پڑا اور ہیرا سانپ کی حیثیت سے اس کا تعاقب کرنے لگا۔ نعمت خان سنگلی کے گھوڑے پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے اور ہیرا مسلسل اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ نعمت خان سنگلی اپنے ڈیرے پر پہنچ گیا اور ہیرا وہاں سے کچھ فاصلے پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ بڑا بے بس تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا دل چاہا کہ رات کو نعمت خان سنگلی کے ڈیرے میں گھس کر اسے کاٹ لے اور اس سے اپنا بدلہ لے لے۔ اس نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا تھا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ پھر جب رات آدھی کے قریب گزر گئی تو وہ زمین پر رینگتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ پہاڑوں کے پُراسرار غاروں کے اندر روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ہیرا کا خیال تھا کہ اب سب سو چکے ہیں لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ ڈاکو رات کو چٹانوں میں خاموشی سے جاگتے ہیں کہ کہیں پولیس کا ادھر سے گزر نہ ہو جائے۔ ہیرا اپنی دانست میں سب کی نگاہوں سے بچتا ہوا اس طرف جا رہا تھا جہاں نعمت خان سنگلی موجود تھا کہ اوپر سے اسے دیکھ لیا گیا اور پھر اوپر سے پتھر برسائے جانے لگے۔ ڈاکو سانپ سانپ چیخ رہے تھے۔ یہ پتھر اس طرح چاروں طرف سے پڑے کہ ہیرا کو زندگی بچانا مشکل ہو گیا۔ ایک پتھر اس کی دم پر پڑا تھا اور ہیرا شدتِ کرب سے تلملا گیا۔ وہ تو شکر تھا کہ اسے ایک چٹان کے نیچے گھسنے کی جگہ مل گئی لیکن اوپر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور ہیرا جانتا تھا کہ چند ہی لمحوں کے بعد وہ اسے گھیر لیں گے۔ اب لاکھ کوشش کرتا لیکن اتنی جلدی سانپ کے بدن سے اپنی آتما کو نکالنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر بھاگا اور پھر اسے پتھروں کی آڑ ملتی چلی گئی لیکن جو زخم اسے لگا تھا۔ وہ شدید تکلیف دے رہا تھا اور ہیرا کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہیں رک کر بے ہوش ہو جائے۔

وہ شدید کرب اور بے چینی کے عالم میں وہاں سے بھی بھاگا۔ دم تقریباً ٹوٹ گئی تھی۔ بہت ہی پریشان تھا وہ۔ کافی فاصلہ طے کر لیا۔ دانت بھنچے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے لیکن ابھی اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خاصا دور نکل آیا اور پہلی بار اسے ایک متحرک چیز نظر آئی۔ کوئی انسان تھا۔ ہیرا اس کی جانب بڑھ گیا یہ ایک فقیر تھا جو بستیوں میں بھیک مانگا کرتا تھا۔ کچھ عرصے ایک بستی میں کچھ عرصے دوسری بستی میں' اس وقت وہ سونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ خوب کھا پی کر آرام کر رہا تھا وہ اور اب اسے نیند آ رہی تھی' ہیرا وہیں رک گیا۔ وہ اپنی تکلیف سے آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا اور اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ فقیر سو جائے۔

چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد فقیر کے خراٹے گونجنے لگے۔ اب ہیرا کو اس کا کام کرنا تھا۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ سانپ کے بدن سے نکلا اور آتما کی شکل میں ایک طرف جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا عمل کرنا شروع کر دیا۔ فقیر کے بدن پر ایک سایہ سا گزر رہا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہیرا کی آتما فقیر کے بدن میں داخل ہو گئی۔ فقیر کی آتما اس کا بدن چھوڑ گئی تھی۔ یہ ہیرا کی جادوگری تھی۔ اس نے جو کچھ سیکھا تھا اسے کام میں لا رہا تھا لیکن کسی چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسان کے جسم میں داخل ہونا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ہاں وہ یہ جانتا تھا کہ سوتا ہوا اور مرا ہوا انسان ایک جیسا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی آتما باہر نکال کر پھینکی جا سکتی ہے اور اپنی آتما اس کے بدن میں داخل کی جا سکتی ہے۔ فقیر کے جسم میں داخل ہونے کے بعد اس نے گہرا سکون کا سانس لیا کم از کم اس شدید تکلیف سے تو نجات مل گئی تھی جو سانپ کی دم میں چوٹ لگنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بھی ایک عمل تھا جس بدن میں وہ ہوتا تھا اس بدن کو پہنچنے والا ہر نقصان اسے نقصان پہنچاتا تھا۔ بہرحال بڑی تکلیف سہی تھی۔ فقیر کے بدن میں وہ دیر تک اسی طرح لیٹا ہوا آرام کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ جس طرح بھی بن پڑے غلام شیر کا جسم حاصل کر لیا جائے۔ یہ طاقتور بدن اسے مدد دے سکتا تھا اور وہ اس مسلمان عالم سے اپنا جسم حاصل کرنے کے لئے جنگ کر سکتا تھا۔ یہ اس کا آخری فیصلہ تھا اور اس نے طے کر لیا تھا کہ اس مولوی کو نہیں چھوڑے گا جس نے اس کا بدن اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ بہرحال اس کے لئے چاہے کتنی محنت کیوں نہ کرنی پڑے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غلام شیر کے پاس اس شکل میں پہنچنے کے لئے اسے کیا کرنا چاہئے۔ یہ رات تو اس نے وہیں گزاری۔ سانپ کی حیثیت سے کافی فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا اور اب یہ فاصلہ اسے واپس طے کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اس کے لئے تیاریاں کرنے لگا۔ فقیر کی جھونپڑی

میں بہت کچھ موجود تھا جو اس نے کھایا پیا' یہ فقیر جس طرح عیش کرتے ہیں اس دور میں عام انسان ان کے عیش و عشرت کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ وہ جو دن بھر محنت مزدوری کرکے شام کو چند پیسے کما کر گھروں کو واپس لوٹتے ہیں' ذہنی طور پر مطمئن اور مسرور بے شک ہوتے ہیں' مالی طور پر اتنے مطمئن نہیں ہوتے جتنے یہ تھوڑی سی دیر میں محنت کرکے کما لینے والے فقیر ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ ذمہ داریاں کچھ لوگوں کی ہیں کہ وہ ان فقیروں سے عوام کو نجات دلائیں اور ملک کی پیشانی پر لگا یہ بدنما داغ مٹا دیں۔ اس وقت آپ کتنے ہی ضروری کام کے لئے کسی انسان کو طلب کریں۔ ملے گا تو بہت مہنگا' لیکن یہ فقیر۔ اصل میں ان کی سوچ کا انداز مختلف ہے۔ صبح سے شام تک شدید محنت مشقت کرکے سو' سوا سو کمانے کی بجائے دو تین گھنٹے کام کرکے سینکڑوں روپے کما لینا زیادہ آسان نظر آتا ہے اللہ کے نام پر دینے والے لوگ ان کی اداکاری سے متاثر ہوکر انہیں بہت کچھ دے جاتے ہیں پھر بھلا انہیں نوکری کرنے کی یا کام کرنے کی کیا ضرورت پیش آئے۔ بہرحال یہ فقیر انہی میں سے ایک تھا لیکن اس وقت اس کے جسم میں ایک اور شیطان کی روح داخل ہوگئی تھی اور اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ بہت سوچنے سمجھنے کے بعد آخر کار ہیرا نے واپسی کا سفر شروع کیا اور آہستہ آہستہ اس جانب چلنے لگا جہاں نعمت خان سنگلی کا ڈیرہ تھا۔

یہ فاصلہ اس نے کافی دیر میں طے کیا تھا جبکہ سانپ کی حیثیت سے اس کی رفتار بہت زیادہ تیز تھی۔ بہرحال جب وہ نعمت خان سنگلی کے علاقے میں پہنچا شام کے کوئی چار ساڑھے چار بج چکے تھے' یہاں اس نے ایک بیوقوفی کی تھی کہ ایک انسان کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ اصل میں یہ علاقے ڈاکوؤں کے تھے اور ڈاکو بھلا کسی اجنبی انسان کو اپنے علاقے میں کیسے برداشت کرسکتے تھے۔ ہر وقت پہرہ رہا کرتا تھا۔ انہی پہریداروں نے تو سانپ کو دیکھا تھا۔ ایک چڑیا پر بھی ان کی نگاہ رہتی تھی چنانچہ اس فقیر کو فوراً ہی بلندیوں سے دیکھ لیا گیا۔ ڈاکوؤں نے ایک دوسرے کو اطلاع دی اور بہت پھیل کر اس فقیر کے گرد گھیرا ڈالا جانے لگا جبکہ ہیرا آہستہ آہستہ اس جانب بڑھتا چلا آرہا تھا۔ ابھی وہ ان غاروں سے خاصی دور تھا کہ اچانک چاروں طرف سے ڈاکو اس پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے ہیرا کو کس لیا تھا اور ہیرا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"ارے بھائیو! میں درویش ہوں' سادھو ہوں' فقیر ہوں' بابا ہوں۔ میرے ساتھ یہ کیا کر رہے ہو تم۔ ارے چھوڑو مجھے چھوڑو۔ اُفوہ کتنی زور سے مجھے رسیوں سے باندھا ہے تم نے' میرے تو ہاتھ ٹوٹے جارہے ہیں۔" ڈاکوؤں نے کوئی جواب نہیں دیا بس اسے

گھسیٹتے ہوئے اپنے علاقے میں لے آئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک دوسرے کو ہدایت کردی تھی کہ ذرا دور تک نظر رکھیں۔ ہوسکتا ہے اس کے ساتھ اس کے آدمی بھی ہوں۔ اس دوران ہیرا کی تلاشی بھی لے لی گئی تھی۔ ہیرا ابھی تو کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا اپنا جادو ان حالات میں بے اثر تھا چنانچہ بحالت مجبوری وہ ان کے ساتھ چلتا رہا۔ یہ اسے گھسیٹ کر غاروں کے پاس لے آئے اور پھر ایک جگہ اس کے پاؤں باندھ کر اسے بٹھا دیا گیا۔

"بھائیو! میری بات تو سنو۔ میں تو ایک فقیر ہوں تم چاہو جس طرح بھی میرے بارے میں معلومات حاصل کرلو۔ میرے سامان کی تلاشی لے لو۔ میں کیا کرسکتا ہوں اس بارے میں۔"

"فقیر کے بچے چپ ہوکر بیٹھ ورنہ زبان نکال کر باہر رکھ دی جائے گی۔"

ہیرا خاموش ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد نعمت خان سنگلی کو اس کی اطلاع ملی اور نعمت خان سنگلی نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔"

بہرحال تھوڑی دیر کے بعد نعمت خان سنگلی وہاں پہنچ گیا اور اس نے سر سے پاؤں تک اس فقیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں کیا نام ہے تیرا؟"

"جانو بابو۔" فقیر نے جواب دیا۔

"جانو بابو' یہاں کیا کرنے آئے تھے میرے لعل؟" نعمت خان سنگلی نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"بابا۔ بھگوان کی زمین تو بہت وسیع ہے۔ گھومتے پھرتے ادھر نکل آئے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا بابو جی کہ یہاں آنا منع ہے۔"

"ہوں! ذرا دونوں ہاتھ دکھاؤ۔" نعمت خان نے کہا اور ہیرا نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ "ہوں! یہ کسی عام آدمی کے ہاتھ نہیں ہیں تم ضرور حکومت کے جاسوس ہو۔"

جواب میں ہیرا ہنس پڑا تھا پھر اس نے کہا۔ "ہم اور جاسوس؟"

"ہاں۔"

"نہیں بابو جی' ہم جاسوس نہیں ہیں اور جہاں تک تم ہاتھوں کی بات کرتے ہو تو ہم نے زندگی میں محنت مزدوری کی ہی کب ہے۔ یہ فقیر لوگ محنت کہاں کرتے ہیں یہ تو بس ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم کون ہو تمہاری اصلیت کیا ہے تمہیں چھوڑا نہیں جائے گا۔"

"ارے بابو جی ایسا مت کرو۔ کچھ کھانے پینے کو دو اور یہاں سے چلتا کرو۔ ہم کہاں کے جاسوس' کیسے جاسوس۔"

"تمہیں کھانے کے لئے چاہیئے؟"

"ہاں' بھوک لگ رہی ہے۔"

"چلو' اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔"

اور کھانے پینے کا بندوبست یہ تھا کہ اسے ایک لکڑی کے کندے سے باندھ دیا گیا اور اس کے بعد نعمت خان سنگلی نے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ کوڑے اس کے بدن پر پڑ رہے تھے اور ہیرا سوچ رہا تھا کہ لعنت ہے ایسی زندگی پر' ہر طرف سے مصیبت ہی مصیبت آ رہی ہے' ستارے گردش میں معلوم ہوتے ہیں۔

نعمت خان خود اسے کوڑے سے مار رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ بتا کیا بات ہے بتا کون ہے تو' لیکن ظاہر ہے ہیرا اس سے زیادہ اور کیا بتا سکتا تھا۔ پٹتے پٹتے وہ بے ہوش ہو گیا۔ نعمت خان سنگلی نے کہا کہ جب یہ ہوش میں آ جائے تو اسے پھر مارو۔ اس سے معلومات حاصل کرو کہ یہ آخر کون ہے اور ان علاقوں میں کیوں آیا ہے۔ کسی فقیر کا اس علاقے میں آنا کسی طور ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ضرور کوئی غلط آدمی ہے۔

یہ کہہ کر نعمت خان سنگلی تو چلا گیا۔ اس کے آدمیوں نے ہیرا کو اٹھا کر ایک طرف قید خانے میں ڈال دیا۔ یہ قید خانہ کیا تھا بس ایک غار تھا جہاں ایک آدمی پہرا دیتا تھا لیکن یہ ایک آدمی بھی کافی تھا۔ اگر کوئی سرکشی کرنے کی کوشش کرتا تو یہ اکیلا چوکیدار ہی اس کے بھیجے کو اُڑا کر رکھ دیتا۔ بہرحال ہیرا کو نہ جانے کتنی دیر بعد ہوش آیا تھا۔ اس کا پورا بدن شدید دکھ رہا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد اس کے حلق سے کراہیں نکلنے لگی تھیں۔ صورتِ حال کو سمجھنے میں اسے وقت نہ ہوئی اور اس کے منہ سے نکلا۔

"ناش ہو بھگوان کرے ناش ہو ان کا۔ سسروں نے میرا تو خانہ خراب کر کے رکھ دیا۔ پہلے پتھر مارا اس کی تکلیف سے نجات ملی تو اب یہ' ارے باپ رے باپ۔ یہ پورا شریر تو پھوڑے کی شکل بن چکا ہے۔ نکلو بھائی اس سے نکلو۔"

اور اس نے اپنا سانس روک لیا اور پھر خاموشی سے فقیر کے جسم سے باہر آ گیا۔ اب وہ صرف ایک ہوا کی شکل میں تھا چنانچہ اس کا رخ غار کے دہانے کی طرف ہو گیا۔ پہریدار

کھڑا پہرہ دے رہا تھا اور ہوشیار تھا۔ نعمت خان سنگلی کی ہدایت تھی کہ جس کے سپرد یہ ڈیوٹی کی جائے وہ اسے خوشی کے ساتھ انجام دے اور اس میں غفلت نہ کرے۔ چنانچہ پہریدار مستعد تھا لیکن ایک روح کو ایک ہوا کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ ہیرا قید خانے سے باہر نکل آیا اور اب اسے غلام شیر کی تلاش تھی۔ اسی لئے تو اس نے اتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں اب بھلا یہ کام بھی نہ کر سکتا تو لعنت ہے۔ وہ مختلف غاروں میں گھستا پھرا۔ اب اس کے لئے کوئی بھی جگہ بند نہیں تھی۔ بس جہاں سے ہوا کا گزر ہو سکے چنانچہ وہ مختلف گوشوں میں تلاش کرتے ہوئے آخر کار غلام شیر تک پہنچ گیا۔ چوڑے چکلے بدن والا جوان آرام کی نیند سو رہا تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر نعمت خان سنگلی کی ماں کروٹ بدلے سو رہی تھی۔ ہیرا خوب ہنسا۔ وہ کام ہو گیا تھا جس کے لئے اس نے کوششیں کی تھیں۔ اگر غلام شیر کی بلی دے دی جاتی تو آج صورتِ حال مختلف ہوتی لیکن اس نعمت خان سنگلی نے اس کا اہم کام روک دیا تھا۔ بہرحال اس کے بعد ہیرا نے اپنا عمل شروع کر دیا۔ ایک مشکل کام تھا ایک زندہ انسان کی روح کو نکال باہر پھینکنا اور اس کی جگہ قبضہ کر لینا لیکن یہ کام ہیرا کو آتا تھا اور ویسے بھی اس کی ضرورت تھی چنانچہ کچھ ہی لمحوں کے بعد ہیرا غلام شیر کے جسم پر قبضہ کر چکا تھا اور غلام شیر کی نیند میں ڈوبی ہوئی روح ایک طرف سر جھکائے بیٹھی گردن جھٹک رہی تھی۔ یہ تصوراتی سر تھا اور تصوراتی گردن کیونکہ ہوا کا وجود نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف ایک احساس ہوتا ہے لیکن اس احساس کے بھی احساسات ہوتے ہیں۔ چنانچہ غلام شیر کی روح بھی سو ہی رہی تھی البتہ اب غلام شیر کے جسم میں ہیرا اچھوت تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کرنا کیا چاہیے۔ اس وقت اگر باہر نکلنے کی کوشش کرے گا تو خوامخواہ یہاں رہنے والوں کو شبہ ہو گا۔ دن کی روشنی میں وہ غلام شیر کی حیثیت سے باہر نکلے گا اور اس کے بعد یہاں سے فرار ہو جائے گا۔ یہ زیادہ اچھا ہے اور اب آرام کی نیند سو جانا چاہیے۔ ان حالات میں اس کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا چنانچہ اس نے کروٹ بدلی اور گہری نیند سو گیا۔

☆======☆======☆

ہیرا اچھوت موقع پا کر نکل گیا تھا جبکہ غلام شیر یہیں موجود تھا۔ ایک روح ایک ہوا کی حیثیت سے۔ غلام شیر کو موجود نہ پا کر یہاں جو کچھ ہوا تھا اس نے غلام شیر کو بہت متاثر کیا تھا۔ غلام شیر نے چیخ چیخ کر انہیں صورتِ حال بتائی تھی لیکن سب بہرے ہو گئے تھے۔ کوئی اس کی آواز سن ہی نہیں رہا تھا۔ کئی دن تک غلام شیر انہیں بتانے کی کوشش کرتا رہا لیکن بیکار۔ تب وہ بددل ہو کر وہاں سے چل پڑا۔ ہیرا تو اپنا کام کر کے چلتا بنا تھا لیکن غلام شیر پر زندگی تنگ ہو گئی تھی۔ وہ شدید کشمکش کا شکار تھا۔ اب وہ صرف ایک روح تھا۔ کوئی بھی جیتا جاگتا انسان اس سے مخاطب نہ ہوتا تھا البتہ ایک دن قبرستان سے گزرتے ہوئے اس کی یہ مشکل حل ہو گئی۔ وہ ایک جیتا جاگتا وجود تھا۔ ایک اچھی شکل کا انسان۔ اس نے غلام شیر کو اشارے سے پاس بلایا تھا۔ وہ ایک پکی قبر پر بیٹھا تھا۔

"جو دوسرے نہیں جانتے وہ میں جانتا ہوں۔ تم ایک زندہ روح ہو مگر میں مر چکا ہوں۔"

"مر چکے ہو.......... کیا یہ تمہاری قبر ہے؟" غلام شیر نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ قبر جمیل الرحمان خان کی ہے۔ میری قبر برابر والی ہے۔"

"مگر تم کون ہو؟" غلام شیر نے پوچھا۔

"میں میرے دوست زندگی کا مزہ چکھنے کے بعد اب موت کے دامن میں زندگی گزار رہا ہوں۔"

"موت کیسی ہوتی ہے؟"

"زندگی سے کہیں زیادہ دلکش۔ بس ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیا؟"

"چندرا کو جلا دیا گیا ہے کیونکہ وہ ہندو تھی۔"

"چندرا کون؟" غلام شیر نے پوچھا۔

"میرے دوست شیکھر کی بہن۔ چاندنی انسانی روپ دھار لے تم اسے چندرا کہہ سکتے ہو۔ اتنی ہی خوبصورت تھی۔ میں ان دنوں میں اپنے تایا زاد بھائی کے ساتھ رہتا تھا جو ریونیو میں ملازم تھے۔ گھر میں صرف بھابی ہوتی تھیں کیونکہ حامد بھائی عموماً دورے پر ہوتے اس لئے آنے والوں کی خاطر مدارت میرے ہی ذمہ ہوتی۔ اور رفتہ رفتہ چندرا اور میں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔

راکھی بندھن کا تہوار آیا تو دیدی نے مجھے پہلی مرتبہ گھر کے اندر بلایا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح پیار سے میرے ہاتھ پر راکھی باندھی۔

"اب تم بھی شیکھر کی طرح میرے بھائی ہو۔" دیدی نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ شاید ان کو اپنے پتی یاد آ رہے ہوں گے۔ میں نے ہر تہوار کے موقع پر دیدی کی آنکھیں اشکبار دیکھی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت اور رحمدل تھیں لیکن ہندو مذہب میں دوسری شادی کا تصور نہ تھا۔ اس لئے ان کو اپنی تمام زندگی اسی طرح کاٹنی تھی۔ مجھے ان کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا۔ پہاڑ سی زندگی کسی جوان عورت کے لئے بیوگی میں کاٹنا کتنا ظلم تھا۔

"اری چندرا' کہاں ہے تو؟" دیدی نے آواز دی۔ "کیا اختر بھیا کو راکھی نہ باندھے گی؟"

چندرا شرمائی شرمائی سی باہر نکلی۔ اس نے بڑا رنگین بسنتی جوڑا پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں چوڑیوں کی بجائے موگرے پھول اور دھان کی بالیوں کے کنگن تھے۔ اس نے شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔ "مجھے لجا آتی ہے دیدی!"

"چل پگلی! اس میں لجانے کی کیا بات ہے۔" دیدی نے اسے ڈانٹا لیکن چندرا نے راکھی نہیں باندھی۔

چندرا مجھ سے محبت کرتی تھی۔ وہ مجھے اپنا محبوب بنا چکی تھی۔ پھر راکھی کیسے باندھتی؟

ہم اس طرح چپکے چپکے ایک دوسرے کو چاہتے رہے۔ ہمیں ایک دوسرے کو اپنی محبت سے آگاہ کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ہماری نگاہیں ایک دوسرے کو وہ سب بتلا دیا کرتی تھیں جو زبان کہنے سے قاصر تھی۔ چندرا اور دیدی کی آمد و رفت اب روز کا معمول بن چکی تھی۔ بھابی کو دیدی سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ وہ بار بار ان کو بلوا لیا کرتی تھیں اور اس طرح چندرا کو بھی آنے جانے کا موقع مل جاتا۔ جب

بھی کوئی اچھی چیز پکتی دیدی مجھے ضرور بھجواتی تھیں اور لانے والی ہمیشہ چندرا ہوتی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے، مسکراتے، چھیڑتے اور شرارتیں کرتے اور کبھی کبھی میں چپکے سے کچھ کہہ دیتا تو چندرا کا چہرہ شرم سے گلنار ہو جاتا۔ وہ چیخ کر بھابی سے میری شکایت کرتی اور میں ہنستا ہوا بھاگ جاتا۔

اور پھر اچانک ایک دن چندرا کی ماں کا انتقال ہو گیا' معمولی سے بخار میں وہ جھٹ پٹ چل بسیں۔ چندرا نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ مجھے بھی بڑا دکھ ہوا۔ ماتا جی بڑی نیک اور محبت کرنے والی عورت تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ شیکھر کی طرح مجھ سے بھی ماں کا سا شفقت بھرا برتاؤ کیا تھا۔ ان کی ارتھی میں شرکت کے لئے جو لوگ آئے ان میں چترکوٹ کی راجکماری نرملا بھی تھیں۔

چترکوٹ ہندوؤں کی متبرک جگہ تھی۔ کہتے ہیں رام چندر جی نے بن باس کے زمانے میں یہیں قیام کیا تھا۔ کروی سے دس بارہ میل دور یہ ایک پہاڑی مقام تھا۔ پہاڑی پر ایک مندر اور اس کے سامنے ہی ایک بڑا سا تالاب تھا۔ بارش کا پانی تالاب میں بھر جاتا تھا اور جو لوگ یاترا کے لئے یہاں آتے تھے وہ اسی میں غسل کرتے۔ ان کے عقیدے کے مطابق یہاں غسل کرنے سے تمام گناہ دھل جاتے تھے۔ چترکوٹ میں کوئی آبادی نہ تھی۔ چند مکانات تھے جن میں مندر کے نگران مہنت لوگ رہتے تھے لیکن سال میں ایک مرتبہ یہاں میلہ لگتا۔ تمام ہندوستان کے یاتری پوجا کے لئے یہاں آتے۔ ہزاروں کا مجمع ہوتا۔ اس موقع پر کروی کے مالدار ہندو تالاب کے اندر سینکڑوں بوری شکر ڈلوا دیتے جس سے پانی میٹھا ہو جاتا اور اسی پانی میں یاتری ستو گھول کر کھاتے۔ گرمیوں کا زمانہ ہوتا اور اس گندے پانی کی وجہ سے گرمی کی بنا پر ہر سال ہیضے کی وبا پھیلتی۔ سینکڑوں افراد لقمۂ اجل ہو جاتے لیکن یہ رسم بند نہ ہوتی۔

مندر کو جانے والی سڑک پر چلتے تو ایک جانب گھنے درختوں کے درمیان پرانا قلعہ نظر آتا تھا۔ یہاں تک جانے کے لئے ایک پتلی سی سڑک چلی گئی تھی۔ قلعہ کی دیوار شکستہ ہو چکی تھی لیکن اندر بنے ہوئے قدیم محل کی عمارت کا ایک حصہ اور بارہ دری اب تک سلامت تھی۔ چترکوٹ جاتے ہوئے دور سے حویلی کی عمارت صاف نظر آتی جس پر کیا ہوا سفید رنگ درختوں کے درمیان سے جھلکتا تھا اور اس ویران محل میں راجکماری نرملا اپنے بوڑھے باپ اور چند ملازموں کے ہمراہ رہا کرتی تھی۔

شیکھر کی ماں اور راجکماری نرملا کا ایک خاندان تھا۔ وہ رشتے میں نرملا کی خالہ تھی

لیکن چونکہ نرملا تمام رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ حویلی میں رہتی تھی اور کسی کا آنا جانا نہیں تھا اس لئے شیکھر کے گھر والوں نے بھی راجکماری نرملا کو زندگی میں دوسری بار دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ وہ شیکھر کے باپ کی موت پر آئی تھی اور دوسری مرتبہ اس کی ماں کی ارتھی پر......... وہ دراز قد اور بلاشبہ راجکماریوں کی طرح حسین تھی۔ عمر کسی طرح چوبیس پچیس سے کم نہ تھی۔ قد نکلتا ہوا' چہرہ بیضوی اور رنگ سورج کی کرنوں کی طرح سنہرا۔ پتلے پتلے ہونٹ اتنے سرخ تھے لگتا تھا کہ لپ اسٹک لگی ہوئی ہے۔ بال سیاہ اور لانبے' شانوں پر دو حصوں میں بکھرے ہوئے اور آنکھیں سحر زدہ......... ان میں جھانکو تو لگتا تھا کہ جانے کتنی گہرائیوں میں ڈوب جاؤ گے۔ میں نے ایک دو بار اسے دیکھا لیکن ایک مرتبہ نظریں ملیں تو ایسا لگا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ دوبارہ نظریں نہ ملا سکا۔ جانے کیوں وہ میری اس وحشت پر ہلکے سے مسکرا دی۔

چندرا نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا اور کسی کے سمجھانے سے اس کی ہچکیاں بند نہ ہو رہی تھیں لیکن جب نرملا نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تو چندرا نے چونک کر اسے پہلی بار دیکھا تھا اور پھر اسے ایسے سحر زدہ انداز میں دیکھتی رہی جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ نرملا نے جھک کر اس کو پیار کیا......... لیکن جانے کیوں مجھے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی تھی کہ اس نے چندرا کے گالوں کو نہیں......... گردن کو چوما تھا اور پھر اسے پیار سے لپٹا لیا تھا.........

مجھے نرملا کی اس حرکت پر بھی حسد محسوس ہوا تھا۔ جیسے وہ میرا حق چھین رہی ہو۔

اور پھر دوسرے دن دیدی نے مجھے بتلایا کہ نرملا اپنے ساتھ چندرا کو چترکوٹ لے گئی ہے۔

''چندرا کبھی ماتا جی سے ایک دن کے لئے جدا نہ ہوئی تھی۔'' دیدی نے روتے ہوئے بتلایا۔ ''اس نے رو رو کر جی ہلکان کر لیا تھا۔ نرملا کماری بضد ہو کر ساتھ لے گئی ہیں اور اچھا ہی ہوا شاید وہاں اس کا دل بہل جائے۔''

لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چندرا ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہو۔ یہ دیوانہ پن نہیں تو اور کیا تھا لیکن میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

''راجکماری نرملا تمہاری رشتہ دار ہیں دیدی.........؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھیا......... وہ ہماری ننھیالی رشتہ دار ہے......... ماتا جی رشتے میں اس کی خالہ ہوتی تھیں۔''

''پھر یہ لوگ کبھی آتے کیوں نہیں تھے؟''

"وہ بڑے لوگ ہیں........." دیدی نے بتلایا۔ "کبھی یہ ساری ریاست ان کی ہوتی تھی۔ ماتا جی کہتی تھیں ہمارے پرنانا بڑے تانے بانے والے راجہ ہوا کرتے تھے اور ان کی رشتہ داری شہنشاہ اکبر سے تھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "شہنشاہ اکبر تو مسلمان تھا۔"

"ہاں کہتے تو یہی ہیں......... پر ماتا جی بتلاتی تھیں کہ اکبر مسلمان بھی تھا اور ہندو بھی۔ اسے ہندومت سے بڑا پیار تھا اور وہ ہمارے دیوتاؤں کو بھی مانتا تھا۔ اس نے بہت سی ہندو لڑکیوں سے شادی رچائی تھی۔ نرملا کا خاندان بھی ہماری طرح راجپوت تھا اور نرملا کے دادا جس کے پیٹ سے تھے وہ اکبر شہنشاہ کی رانی رہ چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ شہنشاہ اس پر بری طرح مرمٹا اور شادی کر کے اسے اپنے ساتھ دلی لے گیا لیکن اکبر کی موت کے بعد وہ واپس آگئی تھیں اور پھر ہمیشہ یہیں پر رہیں۔"

"لیکن یہ لوگ اس ویران قلعے میں کیوں رہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں کہ ان کی ماں کی وصیت تھی اور مہارانی دیپ کور نے بھی یہی وصیت کی تھی کہ اگر ان کی اولاد نے حویلی کی رہائش ترک کی تو وہ تباہ ہو جائے گی۔ ان کے پاس دھن دولت بہت کچھ ہے لیکن بے چاری نرملا۔ وہ بھی میری طرح ودھوا ہے اس کا شوہر ایک حادثے میں مر گیا تھا۔"

نرملا کے بارے میں یہ باتیں میں نے پہلی بار سنی تھیں لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے صرف چندرا کی جدائی کا غم تھا۔ ایک ایک لمحہ کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا اور میں اپنی تڑپ کا کسی سے اظہار بھی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن قدرت نے خود راستہ بنا دیا۔

چندرا کے جانے کے چھ سات دن بعد اچانک شیکھر بیمار پڑ گیا۔ اسے جاڑا بخار شروع ہو گیا تھا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ دیدی بہت پریشان تھیں۔ میں ہر لمحہ شیکھر کی خدمت کرتا۔ ڈاکٹرز کو لانا دوا لے کر آنا اور وقت پر شیکھر کو دوا دینا' یہ سب میری ذمہ داری تھی۔ ایک دن شیکھر نے دیدی سے کہا کہ چندرا کو دیکھنے کو بڑا جی چاہتا ہے۔ دیدی بے چاری کیا جواب دیتیں......... کہنے لگیں کوئی ہے بھی نہیں جس کو چترکوٹ بھیج کر چندرا کو بلوائیں......... میں نے فوراً ہی موقع سے فائدہ اٹھایا۔

"دیدی......... تم کہو تو میں جا کر لے آؤں۔"

"ہاں......... لیکن بھیا کہیں وہ لوگ برا نہ مانیں۔" دیدی نے کہا۔

"وہ کیوں برا مانیں گے؟" شیکھر نے غصے سے کہا۔ "آج تک تو کبھی رشتہ داری یاد

ہیں آئی تھی۔ اب آئی تو بہن کو لے کر چل دی۔ ویسے بھی مجھے نرملا ایک آنکھ نہیں بھاتی۔"

"ایسا نہ کہو شیکھر۔" دیدی نے فوراً ٹوکا۔ "آخر وہ بھی تمہاری بہن ہوتی ہے۔"

لیکن شیکھر اتنا بضد ہوا کہ بالآخر دیدی نے مجھے چترکوٹ جانے کو کہہ دیا......... میں نے شیکھر کے لئے تین دن کی دوا لا کر رکھ دی اور پھر دوسرے ہی دن گھوڑا لے کر چترکوٹ روانہ ہو گیا۔ زندگی میں دوسری بار میں چترکوٹ جا رہا تھا۔ ایک بار شیکھر کے ہمراہ میلے کے زمانے میں گیا تھا اور اب تنہا جا رہا تھا۔ آبادی سے باہر نکلتے ہی میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جلد از جلد چندرا کے پاس پہنچنے کے لئے پوری رفتار سے روانہ ہو گیا۔

فاصلہ زیادہ نہ تھا لیکن مسلسل چڑھائی تھی اس لئے حویلی تک پہنچنے میں دوپہر ہو گئی لیکن بلندی پر حویلی کی سفید عمارت درختوں کی اوٹ سے جھلک رہی تھی۔ اس لئے میں نے بار بار ایڑ لگا کر گھوڑے کی رفتار تیز کی۔ کچھ دیر بعد درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حویلی قطعہ کے اندر واقع تھی۔ قلعہ کی شکستہ فصیل اب بھی اتنی بلند تھی کہ اس کو پار کرنا ممکن نہ تھا اور اندر جانے کا واحد راستہ بڑے پھاٹک سے تھا جو کھلا ہوا تھا۔ ہر سمت عجیب سی ویرانی برس رہی تھی اور دور دور تک کسی آبادی یا متنفس کا پتہ نہ تھا۔

میں پھاٹک سے گزر کر جیسے ہی اندر داخل ہوا تو بارہ دری نظر آئی جس کے سامنے وہی بگھی کھڑی تھی جس پر سوار ہو کر نرملا کروی آئی تھی۔ سوائے حویلی کی عمارت کے ہر سمت کھنڈر نظر آ رہے تھے۔ بائیں جانب اصطبل تھا جس میں بندھے ہوئے مشکی گھوڑے باہر سے نظر آ رہے تھے لیکن کسی آدم زاد کا پتہ نہ تھا۔ میں نے اصطبل کا رخ کیا اور اپنا گھوڑا ایک خالی تھان پر باندھ ہی رہا تھا کہ کسی نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا چندرا دیوی کے گھر سے آئے ہو؟"

میں چونک کر پیچھے مڑا۔ بوڑھے سائیں کو داخل ہوتے میں نہ دیکھ سکا تھا۔ وہ اتنا بوڑھا تھا کہ اس کی بھویں تک سفید ہو گئی تھیں۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے وہ مجھے عجیب انداز میں گھور رہا تھا۔

"ہاں......... تم راجکماری نرملا کو خبر کر دو۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"راجکماری نرملا......... اس وقت........." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں۔ میں چندرا کو لینے آیا ہوں اس لئے تم فوراً خبر کر دو........."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے.........." بوڑھے نے کہا........ "راجکماری اس وقت کسی سے نہیں ملتی ہیں۔"

"لیکن میں اتنی دور سے آیا ہوں اور پھر چندرا کو لے کر واپس بھی جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ ان کے آرام کا وقت ہے.........." بوڑھے نے غصے میں جواب دیا۔ "میں انہیں نہیں جگا سکتا۔"

"اچھا تو پھر چندرا کو اطلاع کر دو.........."

بوڑھا زیر لب بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی بڑی حویلی میں اور کوئی نوکر چاکر نظر نہیں آتا.......... جانے کیوں اس جگہ دل پر ایک انجانا سا خوف طاری ہو رہا تھا۔ اتنے میں چندرا آتی ہوئی نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرا دی۔ ظاہر ہے اسے یہاں میری آمد کا وہم و گمان بھی نہ رہا ہو گا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی قریب آئی۔

"ارے تم.......... تم یہاں کیسے آ گئے؟" اس نے مجھے والہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کو میری آمد پر کوئی اعتراض ہے تو واپس چلا جاؤں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں.......... تم تو برا مان گئے.........." چندرا جلدی سے بولی۔ "یہاں کیوں کھڑے ہو اندر آ جاؤ۔"

وہ مجھے لئے ہوئے مختلف راہداریوں سے گزر کر ایک ہال نما کمرے میں پہنچی۔ حویلی کیا تھی سچ مچ شاہی محل تھا۔

بڑے بڑے جھاڑ اور قندیلیں کمرے میں لگی ہوئی تھیں لیکن جدید دور کی سجاوٹ کی طرح کمرے میں فرنیچر کا نام و نشان نہ تھا۔ قیمتی ایرانی قالین فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ مخملی غلاف والے گاؤ تکئے قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ چاندی کے اگالدان رکھے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک گاؤ تکئے کے سامنے بڑی خوبصورت سی نقشین صراحی اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر قدیم دور کے ہتھیار سجے ہوئے تھے اور سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کے درمیان میں شہنشاہ اکبر کی تصویر تھی۔ سونے کے حسین فریم میں لگی ہوئی اس تصویر کے برابر چھوٹی تصویر جو تھی وہ ہو بہو نرملا کی تھی۔

"نرملا تصویر میں بڑی حسین نظر آ رہی ہے۔" میں نے تصویر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ نرملا نہیں.......... ان کی پردادی مہارانی دیپ کور کی تصویر ہے۔" چندرا نے بتلایا۔

"ناممکن.........." میں نے کہا۔ "اتنی مشابہت ممکن نہیں ہے۔"

لیکن چندرا نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر اندر گئی۔ میں نے دانستہ اسے شیکھر کی بیماری کے بارے میں نہیں بتلایا تھا۔ ورنہ وہ پریشان ہو جاتی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ راجکماری سے اجازت کے بغیر چندرا کیسے جائے گی اور اگر راجکماری دیر سے سو کر اٹھی تو واپس جانا ناممکن ہو گا کیونکہ سہ پہر ہو رہی تھی اور راستہ ویران جنگل سے گزرتا تھا۔ چندرا ایک خوبصورت سی کشتی میں کھانا لے کر آ گئی۔

میں بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ اس لئے بلا تامل کھانے بیٹھ گیا۔

"گھر میں کوئی ملازم نہیں ہے؟" میں نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہے کیوں نہیں' درجنوں ہیں۔" چندرا نے جواب دیا۔

"پھر تم کیوں کھانا لینے گئی تھیں؟"

"اوہ.......... دراصل اس وقت سب سو رہے ہیں۔"

"سو رہے ہیں؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ دراصل راجکماری رات کو دیر تک جاگتی ہیں۔ صبح ہونے تک روزانہ راگ و رنگ کی محفل سجتی ہے۔ اس لئے دن کو سب آرام کرتے ہیں۔"

"عجیب بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اس ویرانے میں راگ و رنگ کی محفل کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔"

"مجھے خود تعجب ہوا تھا۔" چندرا نے کہا۔ "لیکن یہ روزانہ کا معمول ہے اس لئے میں بھی عادی ہو گئی۔"

"چندرا.......... میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" میں نے بالآخر اسے بتلا دیا۔ "دیدی نے تمہیں بلایا ہے۔"

"لیکن.........." چندرا کسی سوچ میں پڑ گئی۔ "نرملا تو ابھی سو رہی ہیں۔ میں ان سے پوچھے بغیر کیسے چل سکتی ہوں؟"

"میں خود یہی سوچ رہا تھا۔ وقت کم ہے۔ اس لئے تم ان کو جگا کر اجازت لے لو۔"

"نہیں.......... ان کو کوئی نہیں جگا سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ ان کا حکم ہے۔" چندرا نے جواب دیا۔ "وہ خود ہی بیدار ہوتی ہیں۔ دن کو کسی کو ان کے کمرے میں جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔"

"کیا روزانہ ہی ایسا ہوتا ہے؟"

"ہاں۔"

"تب پھر کیا ہو گا.......... شام سے پہلے میرا جانا ضروری ہے۔"

چندرا بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"صرف ایک صورت ہے۔" اس نے کہا۔ "تم آج رات یہیں ٹھہر جاؤ.......... ہم کل صبح چلیں گے۔"

اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ہم دونوں حویلی سے نکل کر باہر آ گئے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے چندرا سے تنہائی میں ملنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ میرا دل اس طرح اچھل رہا تھا جیسے سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ چندرا بھی مجھے جن لجائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی وہ اس کے دل کی کیفیت کی چغلی کھا رہی تھیں۔

"تم نہیں، تھیں تو ایک لمحہ بھی میرا دل نہیں لگتا تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن پھر یہ سوچ کر صبر کر لیتا تھا کہ شاید تم یہاں بہل جاؤ گی۔"

"تمام دن میں پریشان رہتی تھی۔" چندرا نے کہا۔ "ہر لمحہ دل چاہتا تھا کہ واپس پہنچ جاؤں۔"

"کیوں؟ یہاں تو تم بڑے آرام سے تھیں۔"

چندرا نے ملامت آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ "جب اپنے پاس نہ ہوں تو آرام کیسا؟" اس نے کہا۔

"ہاں.......... ڈیڈی یاد تو آتی ہوں گی۔ وہ بھی ہر وقت تمہارے لئے بے چین رہتی تھیں۔"

"ڈیڈی کے علاوہ بھی کوئی یاد آتا تھا۔" اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

خوشی سے بے تاب ہو کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "سچ؟ اوہ چندرا.......... چندرا.......... تم نے آج مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ بھینچتے ہوئے کہا۔

"تم تو سدا کے دیوانے ہو۔" اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں سدا سے تم نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔" میں نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے

کہا۔ "تمہارے بغیر ایسا لگتا تھا جیسے زندگی ویران ہو گئی ہے۔"

"بس رہنے دو.......... سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔"

"نہیں چندرا.......... میں قسم کھا کے کہتا ہوں.......... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

چندرا ہنس پڑی۔ "کسی فلم سے یہ باتیں سیکھ لی ہیں شاید۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں چندرا.......... میری محبت کا یوں مذاق نہ اڑاؤ۔"

اس نے پیار سے میرا ہاتھ دبایا۔ "برا مان گئے؟ میں تو مذاق کر رہی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے.......... لیکن چندرا.......... میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں.......... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

چندرا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "میرا خود یہی خیال ہے اختر.........." اس نے دھیرے سے کہا۔ "لیکن۔"

"لیکن کیا..........؟"

"جب یہ سوچتی ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا.......... تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔"

"ایسا کیوں نہیں ہو سکے گا؟"

"میں ہندو ہوں.......... اور.......... اور.........."

"اور میں مسلمان.......... یہی بات ہے نا.......... لیکن مذہب ہماری محبت میں دیوار نہیں بن سکتا۔ ہم اس دیوار کو گرا دیں گے۔"

"سوچنا اور بات ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے افسردہ ہو کر کہا۔

"ہم کہیں دور چلے جائیں گے.......... دور.......... اتنی دور جہاں یہ بندھن ہماری محبت میں حائل نہ ہو سکیں۔"

"میں جانتی ہوں کہ ایسا ممکن ہے.......... لیکن ڈیڈی رو رو کر مر جائیں گی اور پھر شیکھر کسی کو کیا منہ دکھائے گا۔"

میرا بنایا ہوا خیالی محل مسمار ہو گیا۔ بے شک یہ کیسے ممکن تھا۔ میں اپنے دوست اور ڈیڈی کو دنیا کے سامنے یوں رسوا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن میں چندرا کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا تھا.......... خدایا میں کیا کروں؟ چندرا نے شاید میری پریشانی بھانپ لی تھی۔

"پر محبت کرنا تو پاپ نہیں ہے اختر..........." اس نے تسلی دی۔ "ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے۔"

"تمہیں چندرا محبت کرنا پاپ نہیں ہے.......... لیکن اگر دنیا کو پتہ لگ گیا کہ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں تو وہ اسے پاپ بنا دیں گے۔"

"دنیا کو پتہ ہی کیوں لگے گا.........." اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہاری نگاہوں سے.......... میں تمہیں دوسروں کے سامنے دیکھتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں کسی کو شبہ نہ ہو جائے.........."

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "بڑے جھوٹے ہو.......... ہمیشہ تو ندیدوں کی طرح گھورتے رہتے تھے۔" اس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

اور تھوڑی دیر کے لیے میں سب کچھ بھول گیا۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا اور میں نے حویلی کی طرف نگاہ کی تو وہاں مجھے بہت سے لوگ چلتے پھرتے نظر آئے۔

"شاید راجکماری نرملا بیدار ہو گئی ہیں۔" میں نے کہا۔

چندرا چونک کر اٹھ بیٹھی۔ "ہائے تم نے باتوں میں ایسا لگایا کہ بالکل دھیان نہ رہا۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔" چندرا نے گھبرا کر کہا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ حویلی میں داخل ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

ویران اور سنسان عمارت میں نوکروں اور داسیوں کی فوج اس طرح مصروف نظر آ رہی تھی جیسے ابھی شہنشاہ اکبر تشریف لانے والے ہوں۔ ان کے جسم پہ قدیم طرز کے لیکن صاف ستھرے لباس تھے۔ وہ بڑا کمرہ جہاں میں چندرا کے ساتھ بیٹھا تھا' عود اور عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کسی نے ہماری سمت توجہ نہ کی۔ کمرے کے ایک حصے میں بچھی ہوئی اجلی چاندنی پر مختلف ساز قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ جھاڑ و فانوس رنگ برنگی روشنیاں بکھیر رہے تھے۔ میں محو حیرت کھڑا تھا کہ اچانک تمام ملازم اور داسیاں صف بستہ کھڑے ہو کر تعظیماً جھک گئے اور بے ساختہ میری نظریں زینے کی سمت اٹھ گئیں۔

راجکماری نرملا آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ اس کے جسم پر باریک لباس تھا۔ جس سے اس کا صاف و شفاف حسن چاندی کی طرح جھلک رہا تھا۔ وہ بلاشبہ راجکماری نظر آ رہی تھی۔ اس کا فرادا حسن بھی بڑا پُروقار لگ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مجھے دیکھ کر ایک خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔ میں اس کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ جب تک وہ قریب نہ آ

گئی' میری نظر اس کے ساتھ ساتھ چلنے والے عمر رسیدہ شخص پر نہ پڑی۔ اور جب پہلی بار میں نے اس بڈھے کو دیکھا تو ایک شدید قسم کی کراہت کا احساس ہوا۔ باوجود یہ کہ اس نے شاہانہ لباس پہن رکھا تھا پھر بھی جھریوں بھرے سانولے چہرے پر ایک عجیب قسم کی خباثت جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی اور نگاہ ملتے ہی مجھے یوں لگا جیسے جسم میں برقی رو سی دوڑ گئی ہو۔ میں نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔

"یہ نرملا کے پتا جی ہیں۔" چندرا نے سرگوشی میں کہا۔ "راجہ مہندر پرتاب سنگھ۔ سنا ہے ان کی عمر سو سال سے بھی اوپر ہے۔ یہ صرف رات کو نرملا کے ساتھ نیچے آتے ہیں اور کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔"

میں نے تعجب سے راجہ مہندر پرتاب کی سمت دیکھا جو اب زینے سے اتر کر ہماری سمت بڑھ رہا تھا۔ اتنی عمر کے باوجود اس کے جسم میں جوانوں کی سی چستی تھی اور جب اس نے ایک بار پھر مجھے گھورا تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گدھ کسی لاش کو گھور رہا ہو۔ اس کی آنکھ میں گدھ جیسی حرص اور بھوک نظر آ رہی تھی۔ ایک بار پھر مجھے شدید نفرت کا احساس ہوا اور ایسا لگا جیسے ہر سمت کسی سڑی ہوئی لاش کی سی بو پھیل گئی ہو۔ میں اپنی اس نفرت پر خود حیران تھا۔

"آداب۔" میں نے راجہ اور راجکماری نرملا کی طرف دیکھ کر کہا۔

بڈھے نے مجھے نفرت زدہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

لیکن نرملا میرے پاس رک گئی۔ اس نے بڑی دل آویز مسکراہٹ سے مجھے دیکھا۔

"کب آئے تم اختر؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"بہت دیر ہوئی انہیں آئے ہوئے۔" چندرا نے جلدی سے کہا۔ "آپ سو رہی تھیں اس لئے میں نے اطلاع نہیں دی۔"

"میں چندرا کو لینے آیا تھا۔" میں نے وضاحت کی۔

نرملا کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

"آؤ.......... پہلے کھانا کھا لیں' پھر باتیں ہوں گی۔" اس نے مجھے اشارہ کیا۔

کھانے پر راجہ مہندر پرتاب' نرملا اور چندرا کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ان گنت ملازمین انواع و اقسام کے کھانے لا کر دسترخوان پر لگا رہے تھے اور تعجب کی بات یہ تھی کہ کھانے میں گوشت کی بھی مختلف ڈشز موجود تھیں۔ چندرا نے گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا اور جیسے ہی میں نے اس ڈش کی سمت ہاتھ بڑھایا' اس نے اس طرح مجھے گھورا کہ میں

نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھلانے کے لئے داسیاں طشت لے کر آئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں مغل اعظم کے دستر خوان پر بیٹھا ہوں۔

کھانا ختم ہوتے ہی فضا میں موسیقی کی آواز ابھری۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ جانے کب سازندے آکر بیٹھ گئے تھے اور ان کے سامنے دو بے حد خوبصورت نوعمر رقاصائیں پیروں میں گھنگھرو باندھ رہی تھیں۔ میں نے ایک دو بار نرملا سے چندرا کے متعلق بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹال گئی۔ راجہ مہندر پرتاب اس دوران بالکل خاموش رہے تھے۔

انہوں نے آہستہ سے نرملا کے کان میں کچھ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو رخصت کرنے کے لئے ہم سب بھی تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر مجھے نفرت انگیز انداز میں گھورا اور پھر سیڑھیاں طے کرکے اوپر چلے گئے۔

میں نے محسوس کیا کہ باپ کے جاتے ہی نرملا میں اچانک تبدیلی آئی تھی۔ اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا اور چہرے پر شگفتگی آ گئی تھی۔ شاید وہ اپنے باپ سے ڈرتی تھی۔ سازندے اپنے سازوں کو سنبھال کر تیار ہو گئے تھے۔ رقاصائیں لہراتی ہوئی کھڑی ہو گئی تھیں۔

"نرملا دیوی۔" میں نے پھر اسے مخاطب کیا۔ "میں صبح سویرے ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے اختر۔" نرملا نے بڑے پیار سے جواب دیا۔ "اور پھر صبح ہونے میں ابھی بڑی دیر ہے۔"

"جی.......... دراصل مجھے آج ہی واپس پہنچنا تھا' چندرا کا انتظار ہو رہا ہوگا۔ شیکھر.........."

"شیکھر اب ٹھیک ہے۔ بخار اتر گیا ہے۔"

"جی۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ میں نے اسے شیکھر کی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتلایا تھا۔ "لیکن.........."

"اطمینان سے بیٹھو۔ مجھے معلوم ہے اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیا بھیا بیمار ہیں؟" چندرا نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" نرملا کا لہجہ اچانک درشت ہو گیا تھا۔ "اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"لیکن آپ کو کیسے معلوم؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

نرملا نے مجھے ملامت آمیز نظروں سے گھورا۔ "باتیں پھر کرلیں گے' ابھی تو راگ اور رنگ سے مزہ لے لو۔" اس نے اچانک مسکرا کر کہا۔ "تم چندرا کے لئے جتنے بے تاب ہو اس کا مجھے احساس ہے لیکن تم جانتے ہو یہ محبت کتنی مہنگی پڑے گی؟"

میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ چندرا خوفزدہ نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔ "لیکن نرملا دیوی میں.........."

"اب چپ بھی رہو اختر۔" نرملا نے بڑی لگاوٹ سے مجھے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ "محبت کبھی چھپتی نہیں یہ کم بخت آنکھوں سے بولتی ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "لیکن دل پر کسے اختیار ہے۔"

رقاصاؤں کے گھنگھرو بجے' طبلے پر تھاپ پڑی اور رقص شروع ہو گیا اور پھر فضا میں ایک ایسا مدھر اور سحر انگیز نغمہ ابھرا کہ روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ میں نے سکتے کے عالم میں دونوں خوبرو رقاصاؤں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ ہمارے قریب آکر رقص کرنے لگیں۔ مجھے نغمے کے بول یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان میں شہد کی سی مٹھاس اور جادو کی سی اثر انگیزی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری کائنات گنگنا رہی ہو' جیسے ہر چیز رقصاں ہو' جیسے ہوش و حواس پر خمار سا چھا گیا ہو۔ نرملا مجھ سے اور قریب آ گئی تھی۔ اس نے چاندی کا ایک جام میرے لبوں سے لگایا' اس کی بڑی بڑی سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ان کی گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ دونوں حسین رقاصائیں اچانک رقص کرتے کرتے میرے قریب آ کر بیٹھ گئیں اور پھر انہوں نے پیر پھیلا کر اپنے جسموں کو کمان کی طرح خم کیا اور میری سمت دیکھ کر ایک نیا نغمہ شروع کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہر سمت محبت کی شمعیں روشن ہو گئی ہوں' نرم نرم' شبنم کی طرح ٹھنڈی روشنی فضا میں بکھر گئی۔ رقاصاؤں نے اپنے ہاتھ فضا میں لہرائے اور پھر ان کے ہاتھ بلوریں جام لئے ہوئے آہستہ آہستہ میرے لبوں کی سمت بڑھنے لگے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا اپنا وجود اس سحر زدہ ماحول میں تحلیل ہو کر رہ گیا ہو۔ جیسے میں عمر خیام کی کسی رباعی کا ایک کردار ہوں۔ نغمہ کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ حسن میرے قدموں میں رقصاں تھا اور شباب میرے پہلو میں جھوم رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک نرم و گداز بستر پر دراز تھا۔ چھت پہ لٹکا ہوا خوشنما جھاڑ تاریکی میں چمک رہا تھا۔ نہ وہ بزمِ موسیقی تھی نہ وہ روح پرور نغمے اور نہ رقص و

سرود۔ میں ایک تاریک کمرے میں تنہا لیٹا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ مجھے یاد آتا گیا اور پھر میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ہلکی سی سرسراہٹ دریچے کی جانب سے سنائی دی تھی۔ میں نے گھور کر دیکھا تو تاریکی میں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ کوئی دریچے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا باریک ریشمی لباس ہوا کے ساتھ اڑ رہا تھا اور اس کے سیاہ ریشمی بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"چندرا۔" میں نے بے ساختہ پکارا۔

وہ تیزی کے ساتھ پلٹی اور جھپٹ کر میرے بستر کے قریب آئی۔ "چندرا کو تم کبھی نہ حاصل کر سکو گے مورکھ۔" اس نے غضبناک لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں غصے سے شعلے کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ چندرا نہیں راجکماری نرملا تھی۔

"راجکماری.......... تم؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

وہ چند لمحے مجھے اس عالم میں گھورتی رہی۔ پھر آنکھوں میں دہکتی ہوئی آگ ماند پڑ گئی۔ ایک دلنواز مسکراہٹ لبوں پر نمودار ہوئی۔

"صرف نرملا کہو مجھے۔" اس نے توبہ شکن انداز میں سرگوشی کی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید یہ بھی کوئی خواب تھا۔ شاید میں نشے میں تھا لیکن پھر نرملا کا حسین جسم اپنی جیتی جاگتی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ میرے قریب آ گیا۔ اس کے جسم کا گداز اور اس کی مرمریں بانہوں کا لمس میرے ہوش و حواس پر چھانے لگا اور شاید میں تمام تر بندشوں کو توڑ کر اس خواب کی تعبیر حاصل کر لیتا لیکن اچانک وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ.......... یہ تمہارے بازو پر کیا ہے؟" اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے اپنے بازو کو دیکھا۔ پھر یاد آیا کہ اس پر امی کا باندھا ہوا تعویذ موجود تھا جس پر چاندی کا پتر چڑھا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں، تعویذ ہے۔" میں نے کہا۔ شاید تعویذ اس کے نرم و نازک بازو پر گڑ گیا تھا۔ "تم بلا وجہ ڈر گئیں۔"

"اسے اتار دو۔" نرملا نے حکم دیا۔

"کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ ہمارے درمیان حائل ہے۔" نرملا سانپ کی طرح پھنکاری۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ ہندو ہے شاید اس لئے یہ

کہہ رہی ہے۔ میں مسکرایا۔

میرا ہاتھ تعویذ کھولنے کے لئے بڑھا پھر خود بخود رک گیا۔ کوئی انجانی قوت مجھے روک رہی تھی۔

"نہیں نرملا۔ یہ میری ماں نے باندھا تھا۔ اسے میں نہیں اتار سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا میرے کہنے سے بھی نہیں؟" اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر پوچھا۔

ایک لمحہ کے لئے میرا عزم ڈگمگایا لیکن پھر مجھے چندرا کا خیال آیا۔ میں اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا تھا۔

"تم چندرا کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے۔" نرملا نے غصے میں کہا۔ اس نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

"میں صبح اسے یہاں سے لے جاؤں گا نرملا۔" میں نے بھی غصے سے جواب دیا۔ "اور.......... اور اسے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوا تو اپنا مذہب بھی تبدیل کر لوں گا۔"

نرملا نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔ "تم اسے پھر بھی نہ حاصل کر سکو گے۔ چندرا میری ہے۔ وہ میری اجازت کے بغیر یہاں سے کبھی نہ جائے گی۔"

"بے شک وہ میری کوئی نہیں ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے دیدی نے اسے لینے کے لئے بھیجا ہے۔ میں ابھی واپس جا رہا ہوں اور ان کو لے کر آؤں گا۔"

"وہ پھر بھی نہ جا سکے گی۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "تم نے میری توہین کی ہے اختر تم کو اس کی سزا ملے گی۔"

مجھے اس کے لہجے پر سخت غصہ آیا۔ میں اس کا نوکر تو نہیں تھا۔ وہ ہو گی راجکماری لیکن اسے میرے ساتھ اس انداز میں گفتگو کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ میں نے سرہانے رکھا ہوا اپنا لباس پہنا اور جانے کے لئے مڑا۔

نرملا کا طنزیہ قہقہہ بلند ہوا۔ میں نے غصے میں پلٹ کر دیکھا لیکن.......... کمرہ خالی تھا۔ نرملا وہاں نہیں تھی۔ میں چند لمحے حیران کھڑا رہا پھر دروازے کی سمت بڑھا۔ دروازہ مقفل تھا۔ میں نے بار بار زور لگایا لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔ وہ مجھے زبردستی یہاں قید رکھے گی۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی میں نے پھر دروازے کا ہینڈل گھمایا لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔

"دروازہ کھول دو نرملا۔" میں نے غصے میں چلا کر کہا۔

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ مجبوراً میں واپس آ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ صورت حال پریشان کن تھی۔ میں یہاں بالکل تنہا تھا۔ نرملا کے پاس ملازموں کی فوج تھی اور پھر مجھے یاد آیا کہ ان میں بعض خوفناک شکل والے مضبوط حبشی بھی تھے۔ یہاں کوئی مدد بھی نہیں مل سکتی تھی دور دور کہیں آبادی نہ تھی۔ اچانک میری نظر دریچے پر پڑی اور میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ میں نے باہر جھانکا اور سہم گیا۔ یہ کمرہ زمین سے اتنی بلندی پر واقع تھا کہ اس راستے سے نیچے اترنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاید یہ حویلی کے بلند مینار پر واقع کوئی کمرہ تھا۔ پھر کیا کروں؟ میں اسی عالم میں کھڑا باہر جھانک رہا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ سورج کی پہلی کرن پہاڑ کے دامن سے ابھری تو مجھ میں ایک نئی ہمت پیدا ہوئی۔ میں دروازے کے قریب آیا اور زور زور سے اسے پیٹنے لگا لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔

غصے میں ایک بار پھر میں نے پوری قوت سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ بلا کسی دشواری کے کھل گیا۔

چند لمحوں تک مجھے یقین نہ آیا' میں کھلے ہوئے دروازے میں کھڑا رہا۔ ممکن ہے یہ بھی نرملا کی کوئی چال ہو۔

لیکن پھر آہستہ آہستہ میں زینہ اترنے لگا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ یہ کمرہ حویلی کے قدیم مینار پر واقع تھا۔ میں نیچے پہنچا تو ہر سمت سناٹا طاری تھا۔ نہ کوئی ملازم نظر آ رہا تھا نہ نرملا اور نہ ہی چندرا۔

ایک لمحہ کو میں نے سوچا کہ چندرا کو تلاش کر کے خاموشی سے ساتھ لے چلوں لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہوگی اور اگر نرملا نے مجھے روک لیا تو مشکل ہو سکتی تھی۔

میں دبے پاؤں چلتا ہوا اصطبل تک پہنچا۔ گھوڑے پر جلدی جلدی زین کسی اور حویلی کی چاردیواری سے باہر نکل آیا۔ کسی نے میرا راستہ نہیں روکا۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

ابھی سورج پوری طرح نہیں نکلا تھا اور گھنے جنگل میں اب تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک بہت تنگ اور ناہموار تھی۔ ایک جانب گہری کھائی تھی اور ذرا سی لاپرواہی مجھے سینکڑوں فٹ گہرائی میں پھینک سکتی تھی۔ اس لئے میں نے رفتار سست کر دی۔ کروی جانے والی سڑک پر پہنچنے کے لئے مجھے اب چند منٹ درکار تھے۔

اور عین اسی لمحہ جھاڑیوں سے کسی چیز نے گھوڑے پر چھلانگ لگائی۔ میں اپنے

خیالات میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ میرا گھوڑا خوف سے ہنہنا کر اچھلا اور پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا گھوڑے کی پشت سے لڑھک کر گہری کھائی کی سمت گرنے لگا۔ میں نے خلا میں ہاتھ مارے لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں گہرائیوں میں گرتا چلا گیا اور پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

☆======☆======☆

وہ چندرا تھی.......... غم زدہ' پریشان اور پُرنم آنکھیں بھی چندرا کی تھیں اور وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔

میں ایک بار پھر آرام دہ بستر پر دراز تھا۔ جلتی ہوئی شمعوں سے ظاہر تھا کہ رات ہو چکی تھی۔ شاید چندرا کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں نے مجھے بیدار کر دیا تھا۔

"چندرا؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

چندرا نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر خوشی سے مسکرا دی۔ ہاں یہ خواب نہ تھا وہ چندرا ہی تھی۔

"بھگوان! تُو نے میری پرارتھنا سن لی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ درد کی ٹیسوں سے سارا بدن دکھ رہا تھا۔ چندرا نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر مجھے لٹا دیا۔

"نہیں نہیں۔ تم اٹھنے کی کوشش نہ کرو۔" اس نے گھبرا کر کہا۔ "زندگی تھی جو بچ گئے' ورنہ جس طرح گرجو بابا تمہیں لے کر آئے تھے میں تو سمجھی تھی کہ تم.......... تم.........." وہ سسکیاں لینے لگی۔

اور مجھے یاد آ گیا۔ میرا گھوڑا اچانک بدک گیا تھا اور میں اس کی پشت سے کھائی کی سمت گر گیا تھا۔ حیرت تھی کہ بچ کیسے گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر چندرا کے چہرے سے آنسو پونچھ دیئے۔

"ابھی تو میں زندہ ہوں پگلی۔ رو کیوں رہی ہے؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

چندرا نے پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تم مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔

ایک لمحہ کو دل چاہا کہ اسے نرملا کی ساری باتیں بتا دوں پھر سوچا یہ مناسب نہ ہوگا۔

"تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں گا چندرا۔ بس دل گھبرا رہا تھا۔ یونہی ٹہلنے نکل گیا تھا اچانک گھوڑا بدک گیا۔"

"میں نے منع کیا تھا کہ یہ جگہ اچھی نہیں لیکن تم نہیں مانے۔"

"اسی کی تو سزا ملی ہے۔"

وہ مسکرا دی۔ "اس حالت میں بھی شرارت سے باز نہیں آئے۔"

"کیا بہت چوٹ لگی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں لیکن بھگوان کی کرپا سے تم بچ گئے۔ گرجو بابا کہہ رہا تھا کہ ایک درخت میں پھنس کر تم نیچے گرنے سے بچ گئے ورنہ............؟"

"ورنہ اب تک سورگ باش ہو گئے ہوتے۔" میں نے کہا۔

چندرا نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیسی بدشگونی کرتے ہو۔" اس نے غصے میں مجھے گھورا۔ "اگر............ اگر تم کو کچھ ہو جاتا تو............"

"تو کیا ہوتا............؟"

"میں بھی جان دے دیتی۔" اس نے نظریں جھکا کے بڑے عزم سے کہا۔

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔

وہ واقعی چندرا تھی۔ اس کے چہرے پر بکھرا ہوا حسن چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ چوم لیا۔

چندرا نے شرما کر جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"یہ گرجو بابا کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک غریب لکڑہارا ہے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر حویلی میں دیتا ہے۔ اس نے تم کو گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اٹھا کر یہاں لایا تھا۔" چندرا نے بتلایا۔ "گرجو بابا نے بتلایا تھا کہ تمہیں صرف معمولی چوٹیں آئی ہیں وہ دوا لگا کر کہتا تھا کہ صبح تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"نرملا کہاں ہے؟"

"وہ کچھ دیر پہلے تم کو دیکھ کر گئی ہیں۔"

"تمہاری واپسی کے بارے میں اس نے کیا کہا؟"

"کہہ رہی تھیں کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو پھر وہ اپنی بگھی میں ہم دونوں کو کروی بھیج دیں گی۔" چندرا نے بتلایا۔

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ کیا واقعی نرملا نے اپنا فیصلہ بدل دیا تھا یا محض چندرا کو تسلی دینے کے لئے ایسا کہہ دیا ہے۔

"فکر نہ کرو۔ نرملا دیدی نے آدمی کو بھیج کر گھر پر کہلوا دیا ہے کہ ہم دو تین دن بعد

واپس آئیں گے۔" چندرا نے مجھے فکرمند دیکھ کر کہا۔

"چندرا............ کبھی تم نے ایک بات سوچی؟"

"کون سی بات؟"

"نرملا............ اس کا باپ............ اس کے تمام نوکر دن میں کہاں غائب ہو جاتے ہیں؟"

"اس میں بھلا سوچنے کی کیا بات ہے؟" چندرا نے کہا۔ "جب رات بھر جاگیں گے تو دن کو سوئیں گے ہی۔"

"کیا اس رات میں بے ہوش ہو گیا تھا؟"

"بے ہوش؟ تم کب کی بات کر رہے ہو؟"

"کل رات۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اس کمرے میں کیسے پہنچا تھا؟"

چندرا بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر اس نے پریشان نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیسے میری ذہنی حالت پر شبہ ہو رہا ہو۔

"تم نرملا دیدی کے ساتھ خود ہی چل کر گئے تھے۔" اس نے کہا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔"

"تم آرام کرو............ شاید چوٹ کی وجہ سے............"

"نہیں چندرا۔ میرا دماغ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نرملا............ یہ حویلی............ اور یہاں کا سب کچھ حقیقت نہیں ایک خواب ہے۔"

چندرا اب واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ "اختر............ اب تم سو جاؤ............ لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔"

وہ سر دباتی رہی۔ میں سوچتا رہا نرملا نے دھمکی دی تھی کہ چندرا اب کبھی واپس نہ جائے گی لیکن اب کیا وہ زبردستی چندرا کو روک سکتی تھی۔ وہ چندرا کی رشتہ دار تھی اور پھر راجکماری بھی۔ اگر اس نے شیکھر اور دیدی سے چندرا کو مزید روکنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ یقیناً انکار نہ کر سکیں گے اس لئے میرا ضد کرنا بے کار تھا۔ جیسے ہی طبیعت ٹھیک ہو گی میں واپس چلا جاؤں گا۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ نرملا کمرے میں داخل ہوئی۔ چندرا کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

شاید اسے ناگوار ہوا تھا کہ وہ میرا سر دبا رہی تھی۔ چندرا نے سہم کر ہاتھ روک لئے لیکن نرملا دوسرے ہی لمحے مسکرا کر آگے بڑھی۔

"کیسی طبیعت ہے اختر؟" اس نے قریب آکر پوچھا۔

"سارا بدن دکھ رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"چندرا تم ذرا جا کر دیکھو کھانا لگ جائے تو ہمیں بلا لینا۔" اس نے بڑے پیار سے کہا۔

"اچھا نرملا دیدی۔" چندرا فوراً چلی گئی۔

نرملا میرے بستر کے سرہانے آکر بیٹھ گئی۔ "تم نے مجھے ناراض نہ کیا ہوتا.......... تو یہ سزا کیوں ملتی؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ.......... تو یہ سزا اس وجہ سے ملی ہے؟" میں بھی ہنس دیا۔ "مجھ پر تمہارا قابو نہ چل سکا۔ شاید میرے گھوڑے پر چل گیا۔"

"اختر.......... تم بہت نادان ہو۔" اس نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج تک کسی نے میری محبت کو نہیں ٹھکرایا ہے۔"

میں چونک پڑا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ مجھ پر کیوں مہربان ہے۔

"لیکن تم شادی شدہ ہو نرملا دیوی۔"

"تھی.......... اس بے وقوف نے بھی ایسی ہی غلطی کی تھی۔"

"تو کیا تم نے اپنے شوہر کو.........."

"نہیں.......... تم غلط سمجھ رہے ہو۔ شیر سنگھ کی موت واقعی ایک حادثہ تھی۔ ہماری آپس میں تکرار ہو گئی تھی اور وہ غصے میں یہ دھمکی دے کر گیا تھا کہ واپس نہیں آئے گا۔ پتا جی اس بات پر ناراض ہو گئے تھے۔ راستے میں اسے حادثہ پیش آیا اور وہ مر گیا۔"

"پھر بھی تم بیوہ ہو۔ ہندو مذہب میں بیوہ.........."

"جہنم میں ڈالو مذہب کو۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ "میں صرف نرملا ہوں۔ اپنی مرضی کی مالک۔" اس نے فرعونی انداز میں کہا۔

میں ہنس دیا۔ "بڑی ضدی اور ظالم بھی ہو تم۔"

وہ مسکرا دی۔ "مجھے جو چیز پسند آئے اسے حاصل کر کے چھوڑتی ہوں۔"

"لیکن اس وقت تو میں ہل بھی نہیں سکتا۔" میں نے بہانہ کیا۔ "اس مسئلے پر پھر

بات کریں گے۔"

اس نے مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔ "مجھ سے جھوٹ بولنا بے کار ہے اختر۔" اس نے کہا۔ "چندرا کا خیال چھوڑ دو۔ وہ تمہاری کبھی نہیں ہو سکتی۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ کوئی ہندو اپنی لڑکی تم سے بیاہ دے گا؟"

"تم بھی تو ہندو ہو نرملا۔"

"میں نے کہا نا.......... میں صرف نرملا ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری ہر خواہش پوری کروں گی۔ تم جانتے ہو مجھے کسی چیز کی کمی نہیں۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں چندرا کا دل توڑ دوں؟" میں نے غصے میں کہا۔

اس نے مجھے پھر ملامت آمیز نظروں سے گھورا اور پھر کھڑی ہو گئی۔ "تم ضدی ہی نہیں، بد قسمت بھی ہو۔" اس نے جواب دیا۔ "تمہارے لئے بگھی تیار ہے۔ بہتر ہے کہ ابھی واپس چلے جاؤ۔" اس نے دروازے کی سمت جاتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس وقت.......... میں اس حالت میں کیسے جاؤں؟"

"یہ تم جانو.......... لیکن میں پھر کہتی ہوں کہ بہتر ہے ابھی چلے جاؤ ورنہ.........."

"اور چندرا..........؟"

وہ غضبناک انداز میں مڑی۔ "چندرا میری بہن ہے۔ میں تم جیسے آوارہ آدمی کے ساتھ اسے نہیں جانے دوں گی۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا وہ جا چکی تھی۔ میرے لئے یہ توہین ناقابل برداشت تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسی وقت روانہ ہو جاؤں گا۔ کوشش کر کے میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ہاتھ پیر سلامت تھے لیکن خراشوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پھر بھی میں اسی حالت میں ہال کے اندر پہنچا۔ نرملا اور چندرا اکٹھی کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔

"چندرا۔" میں نے پکارا۔

نرملا نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر ایک ملازم کو اشارہ کیا۔ "اسے باہر بگھی تک پہنچا دو۔" اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے چندرا کی سمت دیکھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ ملازم حکم کی تعمیل کے لئے میری سمت بڑھا۔ میں غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ نرملا کی فٹن تیار کھڑی تھی۔ کوچوان نے دروازہ کھولا لیکن میں اس مغرور لڑکی کا احسان لینے کو اس حالت میں بھی تیار نہ تھا۔ اس لئے سیدھا اصطبل کی سمت بڑھا۔ میں

نے اپنے گھوڑے پر زین کسی اور شدید تکلیف کے باوجود اس پر سوار ہو کر چل دیا۔ رات کا وقت تھا۔ راستہ خطرناک تھا لیکن غصے کے عالم میں تکلیف اور خطرہ کسی چیز کا احساس نہ رہا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کس طرح سفر طے کیا لیکن رات کے پچھلے پہر میں گھر پہنچ گیا۔

☆------☆------☆

چندرا کی موت کی خبر مجھے بیرا گڑھ میں ملی تھی۔

میں زخمی حالت میں چتر کوٹ سے کروی واپس پہنچا تو تایا کی بیماری اور فوراً پہنچنے کا تار گھر پہنچ چکا تھا۔ حامد بھائی اور بھابی بے چینی کے ساتھ میرے منتظر تھے لیکن میری حالت دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے صبح کی گاڑی سے بیرا گڑھ جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن حامد بھائی بضد ہو گئے کہ مجھے اس حالت میں سفر نہیں کرنا چاہئے اور وہ تنہا جائیں گے۔ بڑی مشکل سے میں ان کو یقین دلا سکا کہ معمولی چوٹیں تھیں اور میں ان کے ساتھ ہی جاؤں گا۔

گاڑی صبح پانچ بجے روانہ ہوئی تھی اس لئے میں شیکھر اور دیدی سے بھی نہ مل سکا۔ خیال تھا کہ چند روز بعد ہی واپس آ جاؤں گا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تایا ہمارے پہنچنے کے چند ہی روز بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بیرا گڑھ ان دنوں جنگی قیدیوں کا بہت بڑا کیمپ تھا.......... اور ابا اور تایا نے مل کر یہاں کھانا سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ لاکھوں کا بزنس تھا اس لئے ابا نے مجھے وہیں روک لیا اور حامد بھائی چند روز بعد بھابی کو لے کر کروی چلے گئے۔

چندرا کی اچانک موت کی خبر مجھے بھابی کے خط سے ملی تھی۔ انہوں نے صرف اتنا لکھا تھا کہ چتر کوٹ میں ایک اتفاقی حادثے میں چندرا ہلاک ہو گئی۔ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ مجھے اس خبر سے شدید صدمہ پہنچا۔ چند روز تک میں بالکل سکتے کے عالم میں رہا۔ دل کہتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔ اسے سانپ نہیں ایک حسین ناگن نے ڈس لیا تھا جس کا نام نرملا تھا لیکن کام کی مصروفیات میں آہستہ آہستہ میں اس غم کو بھول گیا۔ پھر خبر ملی کہ چندرا کا گھر اجڑ گیا اور اس کے بعد دیدی بھی چند ماہ کے وقفے میں چل بسی۔ اس کے بعد کروی جانے کا خیال بھی اذیت کا باعث ہوتا تھا۔ دن گزرتے رہے، یہاں تک کہ جنگ ختم ہو گئی۔ بیرا گڑھ کا کیمپ بھی کچھ دنوں کے بعد ختم ہو گیا۔ اس کیمپ سے ہزاروں افراد کا روزگار کا سلسلہ تھا۔ یہ لوگ جنگ کے خاتمے سے بے روزگاری کا شکار ہو گئے لیکن ہم

نے اتنا کما لیا تھا کہ فوری طور پر کوئی اثر نہ پڑا اور ہم نے جنگلات کے ٹھیکے کا کام شروع کر دیا۔ یہ ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا جب ایک کام سے مانک پور جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا سکول کا دوست اشفاق وہاں ریلوے میں ملازم تھا اور اس کی شادی میں شرکت کے لئے میں وعدہ کر چکا تھا۔ مانک پور پہنچ کر ہم بچپن سے لے کر جوانی کے ان ایام کو یاد کرتے رہے جو کروی میں گزرے تھے۔ اشفاق نے مجھے بتلایا کہ انور ان دنوں کروی کے ہسپتال میں سرجن کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ وہ لندن سے ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کر کے آیا تھا۔ بچپن کے ساتھیوں میں انور اور شیکھر میرے عزیز ترین دوست تھے۔ اس لئے اشفاق کی شادی کے بعد میں انور سے ملنے کے لئے کروی روانہ ہو گیا۔

اسٹیشن پر اترا تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی آبادی اب ایک بڑا شہر بن چکی تھی۔ ہسپتال اسٹیشن سے قریب ہی تھا اس لئے مجھے انور کا پتہ لگانے میں دشواری نہ ہوئی۔ میں دوپہر کو پہنچا تھا۔ انور کو میری آمد کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ ہسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ انور آپریشن تھیٹر میں ہے۔ میں اس کے کمرے میں انتظار کرنے لگا۔ اسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میں اس کا منتظر ہوں۔ اس لئے جب وہ آپریشن تھیٹر سے واپس آیا تو مجھے پہچان نہ سکا۔ اس نے سمجھا کہ شاید میں کوئی مریض ہوں اس لئے قدرے ناگواری کے ساتھ مجھے دیکھا اور واش بیسن میں ہاتھ دھونے لگا۔

"بہت مصروف ہیں ڈاکٹر صاحب؟" میں نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی آج کئی آپریشن تھے۔ آپ لوگ اگر باہر ہی انتظار کر لیا کریں تو کوئی ہرج نہیں۔" وہ ترش لہجے میں بولا۔

"میرا خیال ہے آپ اپنی آنکھوں کا بھی آپریشن کرا لیں تو مناسب ہو گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" وہ غصے میں میری طرف مڑا اور پھر حیرت اور مسرت سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"ابے تو.......... یہاں.......... کب آیا؟" وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ صابن بھرے ہاتھ کا بھی اسے خیال نہ رہا۔ میں نے بمشکل اسے پرے دھکیلا۔

"کمبخت ہاتھ تو دھو لے کپڑوں کا ناس کر دیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"[illegible] قسم تجھے دیکھ کر سب بھول گیا۔ تو ہے بڑا ظالم.......... کبھی بھول کر خط تک نہ بھیجا۔"

"اور تُو نے تو بڑے خط بھیجے تھے۔"

"میری جان مجھے تیرا پتہ نہیں معلوم تھا۔ لندن سے آیا تو حامد بھائی کا تبادلہ ہو چکا تھا اور یہاں ایسا پھنسا کہ کہیں آنے جانے کے قابل بھی نہ رہ گیا۔"

وہ مجھے اپنے بنگلے پر لے گیا جو قریب ہی واقع تھا۔ کھانے کے بعد ہم دیر تک باتیں کرتے رہے اور ماضی کو یاد کر کے دل خوش کرتے رہے۔ اسے شام کو پھر ہسپتال جانا تھا اس لئے میں آرام کرنے لیٹ گیا۔ انور بنگلے میں تنہا رہتا تھا۔ والدین اب بھی اپنے گاؤں میں ہی مقیم تھے جہاں ان کی بڑی زمینداری تھی۔ میں سو کے اٹھا تو شام ہو رہی تھی۔ انور اپنی کار چھوڑ گیا تھا۔ میں سیدھا چندرا کے گھر کی سمت پہنچا لیکن وہاں اب کئی منزلہ عمارت کھڑی ہوئی تھی۔

بہت دیر تک میں گاڑی میں بیٹھا حسرت بھری نظروں سے اس عمارت کو دیکھتا رہا۔ شنکر، چندرا دیدی۔ سب کی صورتیں آنکھوں میں رقص کرتی رہیں۔ مجھے یہ تک احساس نہ تھا کہ میرے رخسار آنسوؤں سے تر ہو چکے ہیں لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف یادیں تھیں ان کا درد تھا اور ایک خلش تھی۔

رات کو میں نے انور سے شنکر کے بارے میں پوچھا لیکن اسے بھی کچھ زیادہ علم نہ تھا کیونکہ وہ ان دنوں اپنی تعلیم کے لئے ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ ہم دیر تک شنکر کو یاد کرتے رہے۔ میرا ارادہ تھا کہ دوسرے دن واپس چلا جاؤں گا لیکن انور بضد ہو گیا کہ چند روز رکنا ہو گا۔ میں یہ سوچ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا کہ دوسرے دن اسے راضی کر لوں گا۔ ہر لمحہ اذیت دے رہا تھا۔ چندرا کے بغیر یہاں رکنا میرے لئے برداشت سے باہر تھا لیکن انور کو میرے دل کی کیفیت کا اندازہ نہ تھا۔

آنکھ لگتے ہی میں نرملا کی حویلی میں تھا۔

وہی کمرہ تھا۔ وہی راگ رنگ کی محفل اور وہی رقاصائیں، اور پھر میں حیرت سے اچھل پڑا۔ کیونکہ میرے قریب نیم دراز رقاصہ نے جب چہرہ اٹھایا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ چندرا تھی۔ میری چندرا۔ اس کے چہرے پر غم و یاس کے بادل چھائے ہوئے تھے اور وہ اس طرح مجھے دیکھ رہی تھی جیسے شدید بے بسی کے عالم میں ہو۔ میں نے نرملا کی سمت دیکھا۔ اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

"چندرا۔" میں نے غصے میں کہا۔ "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

لیکن چندرا خاموش رہی۔ جام لئے ہوئے اس کا ہاتھ میری سمت ہنوز بڑھا ہوا تھا۔

"کیا تم کو چندرا کا یہی روپ پسند نہیں ہے؟" نرملا نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"نرملا! تم چندرا کو اس طرح بے عزت نہیں کر سکتیں۔" میں نے غصے میں چیخ کر کہا۔ "وہ میری............ میری............"

"چندرا میری داسی ہے۔ وہ اب میرے حکم کی پابند ہے۔" نرملا نے جواب دیا۔

"نہیں۔ نہیں............ تم چندرا پر یہ ظلم نہیں کر سکتی ہو۔" میں نے لپک کر چندرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آؤ چندرا ہم یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔"

میں نے اسے اپنی سمت گھسیٹا لیکن چندرا نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے غمزدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر اٹھ کر رقص کرنے لگی۔ اس نے کوئی نغمہ شروع کر دیا تھا۔ بڑا المیہ نغمہ تھا۔ اس کی آواز رس گھول رہی تھی۔ کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں اور نرملا............ وہ فاتحانہ انداز میں قہقہے لگا رہی تھی۔

"چندرا!" میں غصے میں اچانک دھاڑ کر اس کی طرف بڑھا۔

اور اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ تمام جسم پسینے سے تر تھا۔ دل زور زور سے اچھل رہا تھا لیکن میں چترکوٹ میں نہیں اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا۔

میں نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے تھرماس سے پانی انڈیلا اور پورا گلاس خالی کر دیا۔ چندرا کی صورت میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ عالم خواب میں بھی وہ ایک لفظ نہیں بولی تھی لیکن اس کی نگاہیں بہت کچھ کہہ گئی تھیں۔ ان میں غم تھا، بے پناہ شکوہ تھا اور بے انتہا بے بسی اور کرب تھا۔ میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔ بار بار یہ خیال آتا کہ چندرا زندہ ہے۔ وہ میری منتظر ہے۔ نرملا نے اسے قید کر رکھا ہے، اس کو غلام بنا لیا ہے اور اسے مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں نے اسے بھلا دیا۔ اس کرب و اذیت سے نجات دلانے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی انجانی قوت مجھے چترکوٹ بلا رہی تھی۔

میں نے کپڑے بدلے اور باہر نکل آیا۔ انور کی گاڑی گیراج میں موجود تھی۔ چابی گاڑی میں نہ تھی۔ شاید انور کے پاس ہو۔ میں اس کے کمرے کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ دروازہ کھلا۔ انور شب خوابی کے لباس میں کھڑا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" اس نے سوال کیا۔ "میں آہٹ سن کر اٹھ بیٹھا لیکن تم اتنی رات گئے کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا طبیعت گھبرا رہی تھی۔ شاید باہر گھومنے سے تسکین ہو۔" میں نے

بہانہ کیا۔ ”گاڑی کی چابی دے دو۔“

”لیکن تم اتنی رات گئے کہاں جاؤ گے؟“ اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بس ذرا یوں ہی تفریح کروں گا۔“

”اختر تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو اور تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔“ اس نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”اندر آ جاؤ میں تمہیں کوئی مسکن دوا دیتا ہوں۔“

”دوا۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”تم پاگل ہو مجھے دوا کی ضرورت نہیں' کھلی ہوا میں گھومنے کی خواہش ہے۔“

”اتنی رات کو۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں یار' آج کل یہاں اتنی رات گئے گھومنا مناسب نہیں۔“

”کیوں؟“

”قتل اور ڈکیتی کی وارداتیں بہت عام ہو گئی ہیں اور پولیس ان پُراسرار وارداتوں کا پتہ چلانے سے قاصر ہے۔“

”لیکن میرے پاس ہے کیا جو کوئی ڈاکہ ڈالے گا؟“

”تمہاری زندگی جو مجھے بہت پیاری ہے۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں گھسیٹ لیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ انور نے مجھے ایک دوا پلائی۔ جس سے اعصاب کو بڑا سکون ملا اور پھر اس وعدے کے بعد کہ وہ صبح کار میرے پاس چھوڑ جائے گا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ جب میں بستر پر بیٹھا تو صبح کی سپیدی افق پر پھیلنے لگی تھی۔

میں دیر تک سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ غسل کر کے میں نے لباس تبدیل کیا۔ خانساماں نے ناشتہ لگا دیا۔ بھوک لگ رہی تھی اس لئے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا اور جب باہر نکلا تو بارہ بجنے والے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے میں نے چترکوٹ کے راستے پر چھوڑ دی۔ ایک انجانی مسرت کا احساس ذہن پر چھاتا جا رہا تھا۔ جیسے میں واقعی چندرا کے پاس جا رہا ہوں۔

لیکن چندرا تو مر چکی تھی۔

☆-------☆------☆

چترکوٹ جانے والی سڑک اب کچھ چوڑی ہو گئی تھی اور ڈامر ڈال کر اس کو اب ہموار کر دیا گیا تھا اب چونکہ اس پر بس چلنے لگی تھی۔ اس لئے یکے اور گھوڑے کا استعمال

کم ہو گیا تھا۔ سڑک کے کنارے پر لگے ہوئے درخت بھی کم نظر آ رہے تھے اور جھاڑیاں صاف کر دی گئی تھیں لیکن ڈھلوان پر گھنا جنگل اب بھی پہلے کی طرح موجود تھا۔ راستے میں مجھے صرف ایک بس ملی ورنہ زیادہ تر یاتری پیدل یا گھوڑے پر جاتے ہوئے ملے۔ بدھ کا دن تھا اور شدید گرمی تھی۔ ہوا بند تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ شام تک بارش ہو جائے گی۔

رام چندر جی کا مندر نظر آنے لگا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بن باس کے زمانے میں انہوں نے قیام کیا تھا۔ راج محل کے عیش و عشرت میں پلنے والا یہ راج کمار کتنی تکالیف برداشت کر کے یہاں پہنچا تھا۔ ان دنوں آمد و رفت کا یہ راستہ بھی نہ رہا ہو گا یہاں نہ مندر تھا نہ کوئی آبادی لیکن اس ویران جنگل میں بھی سیتا نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ وہ اپنے جیون ساتھی کے دکھ درد میں یہاں بھی شریک تھیں۔ میں سوچنے لگا ان دونوں کو ایک دوسرے سے کتنی محبت تھی۔ یہ مندر یہ پہاڑی اور ہرے بھرے پرانے درخت سب رام اور سیتا کی محبت کے گواہ تھے۔ وہ سیتا کی جانثاری اور شوہر پرستی کے شاہد تھے۔ یہ جگہ ان کی محبت کی یادگار تھی۔ جس طرح یونانی دیومالا میں اپالو نے کوہ اولمپس کو اپنا ٹھکانا بنایا تھا' اسی طرح ہندو دیومالا میں چترکوٹ کو رام چندر جی کے مسکن کی حیثیت سے متبرک حیثیت حاصل تھی۔

میں انہی خیالات میں گم تھا کہ راجکماری نرملا کی حویلی کو جانے والی سڑک کا موڑ آ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ سڑک پہلے سے بھی خراب حالت میں تھی۔ جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ جھاڑیاں سڑک کے درمیان میں بھی اُگ آئی تھیں جیسے برسوں سے اس پر سفر نہ کیا گیا ہو۔ میری کار بہت آہستہ رفتار سے ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی اور مجھے وہ دن یاد آ رہے تھے جب میں چندرا کو لینے یہاں آیا تھا لیکن اب چندرا مجھ سے بہت دور جا چکی تھی۔ میں اسے کبھی نہ اپنا سکوں گا۔ البتہ اس کی یاد میرے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اس کی محبت سے میری یادوں کا چمن ہمیشہ مہکتا رہے گا.......... نرملا.......... مجھے یاد آیا کہ اس نے کہا تھا کہ تم چندرا کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے۔ پھر میں یہاں کیوں آیا تھا؟ نرملا کے پاس کیوں جا رہا تھا۔

قلعہ کا پھاٹک آ چکا تھا۔ اندر داخل ہوا تو ہر سمت ویرانی ہی ویرانی تھی جیسے یہاں اب کوئی نہ ہو۔ شاید نرملا بھی یہاں سے کہیں اور چلی گئی ہو۔ میں نے اس کے بارے میں کچھ پوچھا بھی نہ تھا۔ کار سے اتر کر میں آگے بڑھا۔ اصطبل بھی ویران تھا۔ حویلی میں بھی کسی کی رہائش کے آثار نہیں تھے۔ میرا یہاں آنا حماقت تھی۔ میں نے سوچا اور پھر اسی

پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھ گیا جہاں ہم نے اپنی محبت کا پہلا اقرار کیا تھا۔ چندرا نہیں تھی لیکن اس کے کنوارے بدن کی خوشبو فضا میں رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور مجھے بیٹھے بیٹھے ایسی نیند آئی کہ کچھ ہوش نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ حویلی میں روشنی ہو رہی تھی۔ نوکر اور داسیاں بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا.......... نہیں یہ خواب نہ تھا۔ حویلی میں زندگی کے آثار پہلے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اور پھر گھنگھروؤں کی ہلکی سی چھنک سے میں اچھل پڑا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ درخت کی جس موٹی جڑ کے سہارے میں سو گیا تھا' وہاں کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

"بڑی گہری نیند سوئے تھے۔" فضا میں سرگوشی سی ابھری تھی۔

خدایا! اگر میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا تو یہ کیا تھا۔ آواز چندرا کی تھی۔

"چندرا.......... تم؟"

"ہاں اختر۔ میں تمہاری چندرا ہوں۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کتنے کٹھور ہو تم۔ کبھی ہمیں یاد بھی نہ کیا تھا۔"

"لیکن.......... لیکن میں نے تو سنا تھا تم مر گئیں۔"

"تمہارے لئے میں کبھی نہ مروں گی اختر۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

خدایا۔ تو کیا ان لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے چندرا کی موت کی اطلاع اس لئے دی گئی تھی کہ میں ادھر کا رخ نہ کروں۔ کتنے ظالم ہیں یہ لوگ۔ میں بے ساختہ چندرا کی سمت بڑھا۔

"اوہ چندرا۔ چندرا مجھے معاف کر دو۔ لوگوں نے مجھے دھوکا دے دیا تھا۔"

دوسرے ہی لمحے وہ میرے بازوؤں میں تھی۔ اس کے جسم سے تیز خوشبو کے بھپکے اٹھ رہے تھے اور وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غم کے بادل اسی طرح لہرا رہے تھے جیسے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔

"چندرا۔" میں نے اس کا بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ مجھے شیکھر اور دیدی کی موت کا بڑا دکھ تھا۔ وہ سسکیاں لینے لگی۔

"اب دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ سوائے تمہارے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں روزانہ شام کو اس درخت کے کنارے بیٹھ کر تمہیں یاد کیا کرتی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ ضرور آؤ گے۔"

"مگر مجھے کب معلوم تھا کہ تم زندہ ہو۔" میں نے کہا۔ "میں یہاں دوپہر سے بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ تم مجھے کیوں نظر نہیں آئیں؟"

"مجھے دن میں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"دن میں' میں اپنے کمرے میں بند رہتی ہوں۔"

"لیکن کیوں؟ نرملا کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمہیں اس طرح قید رکھے۔"

"آہ اختر.......... تم کو کچھ نہیں معلوم۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "نرملا.........."

لیکن وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔ تاریکی میں نرملا اتنی اچانک نمودار ہوئی تھی کہ ہمیں پتہ نہ چل سکا۔ چندرا سہم کر مجھ سے دور ہٹ گئی لیکن نرملا مسکرا رہی تھی۔

"ابھی جی نہیں بھرا باتوں سے تم دونوں کا؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیا تم کو معلوم تھا کہ میں آیا ہوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے سب کچھ معلوم رہتا ہے اختر۔" نرملا نے پُراسرار انداز میں مسکرا کر کہا۔ "آؤ کھانا لگ چکا ہے۔"

ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ چندرا نے میرا ہاتھ دبا کر التجا آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ کچھ اشارہ کر رہی تھی لیکن میں نہیں سمجھ سکا۔ ایک بار پھر وہی کمرہ تھا۔ وہی ساحرانہ ماحول' وہی نوکر اور داسیاں اور وہی ساز و نغمہ کی محفل۔ فرق صرف اتنا تھا کہ نرملا کا باپ نہیں تھا اور رقاصہ بھی صرف ایک تھی۔ کھانے کے بعد میں نے نرملا سے اس کے باپ کے متعلق پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ چندرا اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اچانک طبلے پر تھاپ پڑی اور گھنگھروؤں کی جھنکار گونجی۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ رقاصائیں سامنے تھیں اور ان میں سے ایک چندرا تھی۔

"نرملا۔" میں نے غصے میں کہا۔

لیکن چندرا نے مجھے نظروں سے منع کیا۔ میں چپ ہو گیا اور پھر رقص شروع ہو گیا۔ فضا میں چندرا کی جادو بھری آواز رس گھولنے لگی۔ وہ دونوں رقص کرتی پیچ و خم کھاتی میرے سامنے بیٹھ گئیں اور مجھ پر خمار سا چھانے لگا۔ خواب کا سارا منظر حقیقت بن

کر میرے سامنے تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں بھرے ہوئے جام میرے لبوں تک آ رہے تھے۔ وہ میرے سامنے دراز تھیں اور نرملا کسی راجکماری کی طرح شان سے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ صرف چندرا کی شکل میرے سامنے تھی۔ فضا میں ساز و آواز کا سحر رچا ہوا تھا۔ ذہن پر ایک نشہ سا طاری ہوتا جا رہا تھا۔ ایک وارفتگی کا عالم تھا جس میں، میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور جب آنکھ کھلی تو میں پھر اسی مینار والے کمرے میں تھا۔ ہر سمت تاریکی تھی، سکوت تھا۔ ایک عجیب بھینی بھینی خمار آلود خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی اور پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ گداز جسم کا لمس............

گرم گرم سانسیں۔ میں اچھل کر بیٹھ گیا۔

میں تنہا نہیں تھا۔ نرملا میرے ساتھ تھی۔ میں نے غصے میں اسے گھور کر دیکھا۔

"راجکماری تم اس طرح مجھ سے کچھ حاصل نہ کر سکو گی۔" میں نے کہا۔ "تم جانتی ہو میں چندرا سے محبت کرتا ہوں۔"

"اگر تم اس سے محبت کرتے ہوتے تو اتنے ضدی نہ ہوتے۔"

"کیا............ کیا مطلب؟"

"تم اسے میری مرضی کے بغیر کبھی حاصل نہ کر سکو گے پگلے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اور تمہاری مرضی کیا ہے؟"

"اب تم اتنے نادان بھی نہیں ہو۔" اس نے کافرانہ ادا کے ساتھ کہا۔

میں سوچنے لگا۔ چندرا کو حاصل کرنے کی یہ قیمت زیادہ نہیں تھی لیکن میرے ضمیر نے چندرا کی محبت کو اتنے پست داموں خریدنا گوارہ نہ کیا۔

"نہیں نرملا............ میں چندرا سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ میری محبت یہ سودا کرنے پر تیار نہ ہوگی۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تاریکی میں بھی اس کا قیامت خیز حسن دہک رہا تھا اور کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتا تھا۔

"سنو اختر! تم بہت بے وقوف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میں نے کس طرح چندرا کو اب تک بچا کر رکھا ہے۔ اگر میں نہ چاہتی تو پتا جی کی مرضی کب کی پوری ہو جاتی۔"

"پتا جی کی مرضی؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "وہ کیا ہے؟"

"اس کو چھوڑو لیکن میں تم کو آخری بار کہہ رہی ہوں۔ صرف اس لئے میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ چندرا کو دکھ پہنچاؤں۔ آج تک کسی کو مجھے

ٹھکرانے کی جرأت نہیں ہوئی لیکن میں چندرا کو سگی بہن کی طرح پیار کرتی ہوں صرف اس لئے تم کو موقع دے رہی ہوں۔"

"یہ اچھا پیار ہے کہ اس کے پیار پر ڈاکہ ڈالنا چاہتی ہو۔" میں نے طنز کیا۔

"نہیں............ میں صرف اپنے پیار کی تسکین چاہتی ہوں۔ پھر چندرا آزاد ہو گی۔"

"مجھے افسوس ہے نرملا............ میں............"

"مورکھ، کیا تو سمجھتا ہے میں مجبور ہوں۔" اس نے غصے سے پھنکار کر کہا۔ "اس وقت تو میرے اختیار ہے۔ تیرا تعویذ بھی میری راہ میں حائل نہیں ہے۔"

میرا ہاتھ بے ساختہ اپنے بازو پر گیا۔ تعویذ غائب تھا۔

"تعویذ کیا ہوا نرملا؟" میں نے گرج کر پوچھا۔

"یہ اپنی چندرا سے پوچھنا۔" اس نے زہریلی ہنسی سے جواب دیا۔ "میں تمہیں ایک موقعہ اور دیتی ہوں۔ پھر تمہاری قسمت جانے۔"

"تم کبھی مجھے مجبور نہیں کر سکو گی نرملا............ میں............"

لیکن نرملا وہاں نہیں تھی۔ میں نے اندھیرے میں ہر سمت گھورا لیکن کمرہ خالی تھا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ سرہانے رکھے ہوئے شمعدان کو جلانے کے لئے ماچس بھی نہ تھی لیکن تاریکی کی آنکھیں عادی ہو گئی تھیں اور میں نے ہر سمت دیکھا۔ نرملا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کسی انجانے خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں دروازے کی سمت بڑھا لیکن اسی لمحہ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ چندرا تھی۔

"چندرا۔" میں نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ "نرملا تمہاری دشمن ہے چندرا۔ وہ تمہاری محبت کو چھین لینا چاہتی ہے وہ............ وہ............"

"اس کی بات مان لو اختر ورنہ............"

"یہ تم کہہ رہی ہو چندرا؟"

"ہاں اختر۔ اس میں ہم دونوں کی بھلائی ہے ورنہ وہ تم کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لے گی۔"

"نہیں چندرا۔ میں صرف تمہارا ہوں۔ میری محبت، میری زندگی، سب کچھ صرف تمہارے لئے ہے۔ نرملا کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"اختر۔" چندرا نے غصے میں کہا۔ "تم آخر سمجھتے کیوں نہیں؟"

"میں کیا نہیں سمجھتا؟"

چندرا نے بے بسی کے عالم میں سسکی لی۔ "نرملا اور راجہ جی دونوں.........

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے دروازہ زور سے کھلا۔ نرملا سامنے کھڑی تھی۔

"تم جاؤ چندرا۔ اس مورکھ کو بھول جاؤ۔ پتا جی کا یہی حکم ہے......... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں نہیں۔" چندرا مجھ سے لپٹ گئی۔ "اتنی ظالم نہ بنو نرملا دیدی! تم نے مجھے وچن دیا تھا۔"

"وقت گزر گیا نرملا! اب میں مجبور ہوں۔ جاؤ۔ پتا جی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس کا لہجہ اتنا تحکمانہ تھا کہ چندرا میرے پاس سے ہٹ گئی لیکن اس نے کوئی چیز میری مٹھی میں دبا دی تھی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ وہ تعویذ تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ چندرا کرب آمیز اور بے بس نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"جاؤ۔" نرملا گرجی۔

چندرا دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں چونک پڑا۔

"ٹھہرو چندرا۔" میں نے غصے میں آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "نرملا تم کو مجبور نہیں کر سکتی۔"

"یہ تم کو ابھی اندازہ ہو جائے گا۔" نرملا نے درمیان میں آتے ہوئے کہا۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے اور آنکھیں......... وہ انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری سمت بڑھ رہی تھی۔ "اب تم صرف اور صرف میرے ہو......... اور ہمیشہ میرے ہی رہو گے۔"

میں نے خوف زدہ ہو کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میرا ہاتھ جیسے ہی اس کے بازو سے ٹکرایا وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹی۔ آنکھوں کی آگ اچانک بجھ گئی اور وہ دہشت زدہ نظروں سے میرے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس میں میرا تعویذ تھا جو چندرا مجھے واپس کر گئی تھی۔ نرملا اس تعویذ سے خوف زدہ تھی لیکن کیوں۔ اچانک ایک بھیانک شبہ میرے ذہن میں جنم لینے لگا اور عین اسی لمحے کوئی چیز پھڑپھڑاتی ہوئی میرے سر سے گزری۔ میں خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔ خوف سے میرا دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔ فضا میں سیٹی کی سی آواز گونجی اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک چمگادڑ تھی۔ اس نے اچانک مجھ پر ایک زور جھپٹا مارا جیسے حملہ کر رہی ہو۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹا اور اسی لمحے وہ پھڑپھڑاتی ہوئی دریچے سے باہر نکل گئی۔ میں نے پلٹ

کر دیکھا تو نرملا غائب ہو گئی تھی۔

چند لمحہ بعد جب حواس قابو میں آئے تو میں بستر پر گیا۔ تعویذ میں نے اپنے بازو پر باندھا اور فوری طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو چندرا کو لے کر ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں اس عزم کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور زینہ اتر کر پہلی منزل پر پہنچا۔ نرملا اور اس کے پتا جی یہیں رہتے تھے اور مجھے یقین تھا کہ چندرا ابھی یہیں ہوگی۔ اس نے کہا تھا دن میں اسے کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ یقیناً ان لوگوں نے اسے یہیں قید کر رکھا ہوگا۔ میرا دل چندرا کے ساتھ اس ظالمانہ سلوک کے تصور سے غم و غصے سے بھر گیا۔ سامنے ایک لمبی راہداری تھی۔ جس کے دونوں جانب کمرے تھے۔ ہر سمت تاریکی مسلط تھی۔ سناٹا ایسا تھا جیسے میں کسی قبرستان میں پہنچ گیا ہوں۔ جانے چندرا کس کمرے میں ہوگی۔ میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک دروازے سے کسی کے بولنے کی آواز سن کر رک گیا۔ آواز نرملا کے پتا جی کی تھی اور وہ شدید غصے کے عالم میں بول رہے تھے۔

"اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔" وہ گرج کر بولے۔ "تمہاری وجہ سے وہ پہلے بھی بچ گیا تھا اور آج بھی تمہاری حماقت........."

"لیکن وہ تعویذ یقیناً اسے چندرا نے واپس کیا ہوگا۔" نرملا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چندرا......... چندرا۔ تم نے اسے بلاوجہ پال رکھا ہے۔ میں اس کا بھی خون پی جاؤں گا۔"

"نہیں پتا جی! آپ اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔" نرملا نے غصے سے کہا۔

"پاگل لڑکی! اگر تو سمجھتی ہے کہ اسے بچا لے گی تو یہ تیری بھول ہے۔ آج سے صرف میرا حکم چلے گا۔"

مجھے خطرے کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ یہ لوگ چندرا سے انتقام لینے پر آمادہ تھے اور مجھے اس سے پہلے چندرا کو یہاں سے نکال لے جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے ہر کمرے کو کھول کر جھانکنا شروع کیا لیکن تمام کمرے سنسان پڑے تھے۔ ان میں آنے والی سیلن کی بو سے ظاہر تھا کہ یہاں کوئی نہیں رہتا لیکن اگلے کمرے میں جھانک کر جب میں واپس ہونے والا تھا تو اچانک میری نظر مسہری پر پڑی اور میں رک گیا۔ کوئی اوندھے منہ مسہری پر پڑا ہوا تھا۔ میں لپک کر مسہری کے قریب پہنچا۔ تاریکی میں بھی چندرا کو پہچاننا میرے لئے دشوار نہ تھا۔

"چندرا۔" میں نے آہستہ سے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے جلدی سے اس کے شانے ہلائے۔ "چندرا خدا کے لئے جلدی اٹھو وقت کم ہے۔" لیکن وہ پھر بھی پڑی رہی۔ خوف سے میرا دل کانپ اٹھا۔ ان ظالموں نے اسے ختم تو نہیں کر دیا۔ میں نے جھک کر دیکھا.......... نہیں وہ زندہ تھی لیکن بے ہوش تھی۔ میں نے جھک کر اسے بازوؤں میں بھر لیا اور پھرتی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا۔ نیچے پہنچتے ہی میں نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر شیشے چڑھائے اور دروازے کو اندر سے لاک کر کے اسٹیئرنگ سنبھالا۔ کار بلا کسی دشواری کے اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے لائٹ نہیں جلائی تاکہ ان لوگوں کو ہمارے فرار کا پتہ نہ چل سکے اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔

قلعہ سے باہر نکل کر ابھی میں نے چند ہی فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ کوئی سیاہ سی چیز سامنے شیشے سے ٹکرائی۔ میرے پیر بے ساختہ بریک پر چلے گئے۔ دوسرے ہی لمحے میری نظریں دو بہت بڑی بڑی سیاہ چمگادڑوں پر پڑیں جو کار کے سامنے چکرا رہی تھیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے اپنی کھڑکی کا شیشہ بھی چڑھا لیا اور کار پھر آگے بڑھنے لگی۔ دونوں چمگادڑیں غیض و غضب کے عالم میں حملہ کر رہی تھیں اور پھر میں نے محسوس کیا کہ ان حملوں کا مرکز پچھلی سیٹ تھی۔ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ وہ چندرا سے انتقام کی باتیں کر رہے تھے۔ چندرا کی زندگی خطرے میں تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ تعویذ اپنے بازو سے کھولا اور چندرا کے بازو پر باندھ دیا۔

ایک بھیانک سیٹی فضا میں گونجی۔ آواز اتنی تیز اور بھیانک تھی کہ میں وحشت سے کانپ گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کار کے سامنے والے شیشے پر ایک مہیب چمگادڑ بیٹھی مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے کار تیزی سے آگے بڑھائی لیکن چمگادڑ بیٹھی رہی۔ خوف کے باعث میری ہمت نہ ہوئی کہ میں دروازہ کھول کر باہر اتروں اور اسے بھگا سکوں۔ ایک انجانے اور شدید خطرے کا احساس ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھا اور پھر اچانک میری نظریں چمگادڑ کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ایسا لگا جیسے بجلی نے زوردار جھٹکا مارا ہو اور انگاروں کی طرح دہکتی آنکھوں پر میری آنکھیں چپک کر رہ گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے چمگادڑ کا جسم پھیلتا جا رہا ہو۔ یہاں تک کہ مجھے سامنے سیاہی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تمام جسم میں ایک عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی اور میں تاریک گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

☆======☆======☆

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے تمام جسم میں آگ بھر دی ہو۔ سر پہ ہتھوڑے چل رہے تھے۔ دم گھٹا جا رہا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سورج کی تیز روشنی سے کار آگ ہو رہی تھی۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں، اس لئے شدید حبس سے دم گھٹا جا رہا تھا۔ کوئی کھڑکی پر دستک دے رہا تھا۔ سورج کی وجہ سے آنکھیں چکاچوند ہو رہی تھی، اس لئے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ تمام جسم پسینے سے تر تھا۔ پچھلی سیٹ پر چندرا آرام سے سو رہی تھی۔ کسی نے پھر زور زور سے شیشے پر تھپکی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا اور پھر شیشہ نیچے گرا دیا۔ تازہ ہوا کا جھونکا اندر آیا تو جیسے جان آ گئی۔ میں نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔

دو باوردی پولیس والے اندر جھانک رہے تھے اور کار چتر کوٹ جانے والی سڑک کے ایک خطرناک ڈھلوان پر بیچ میں کھڑی تھی۔

مجھے کچھ یاد نہ تھا۔ میں یہاں کب پہنچا اور کار کیسے رکی۔ ذرا سی غفلت مجھے موت کے منہ میں لے جا سکتی تھی کیونکہ سینکڑوں فٹ گہری کھائی تھی۔

"ذرا باہر تشریف لے آیئے۔" ایک نوجوان سب انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔

میں بلا تامل کار سے نیچے اتر آیا۔ کچھ فاصلے پر پولیس کی ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی جس میں چند اور پولیس والے بھی بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

"جی فرمایئے۔"

"یہ کار پارک کرنے کی جگہ ہے؟"

"نہیں اور مجھے خود نہیں معلوم کہ میں یہاں کیسے پہنچا اور کیسے کار یہاں رکی۔"

"کیا آپ نشے میں تھے؟"

"نہیں.......... لیکن.........." میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کیا بتاؤں۔

"آپ کا نام اختر ہے؟"

"جی ہاں لیکن آپ کو کیسے معلوم؟"

"ڈاکٹر انور آپ کے لئے پریشان ہیں۔ ہم آپ کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور آپ یہاں داد عیش دے رہے ہیں.......... بیچ سڑک پر۔" اس نے پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی چندرا کو گھورتے ہوئے کہا۔

میرا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ چندرا کے متعلق ایسی رکیک بات کیسے سن سکتا تھا۔

"تمیز سے بات کرو انسپکٹر۔" میں نے غصے میں کہا۔ "یہ کوئی آوارہ لڑکی نہیں ہے۔"

"اسی لئے رات سے تمہارے ساتھ یہاں سنسان اور ویران جنگل میں سو رہی ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔"

"مسٹر اختر۔ اگر تم ڈاکٹر انور کے دوست نہ ہوتے تو تم کو بھی اچھی طرح سمجھتا۔ ادھر آؤ۔" وہ مجھے لے کر کار کے پیچھے آیا۔ "کھولو نریش۔" کانسٹیبل نے ڈگی کا ڈھکن اوپر اٹھایا۔

میں دم بخود رہ گیا۔ خوف سے میرا جسم لرز کر رہ گیا۔ اندر ایک لڑکی سکڑی ہوئی پڑی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور لباس سے کسی دیہات کی رہنے والی لگتی تھی لیکن وہ مردہ تھی.......... مرچکی تھی۔ اتنے فاصلے سے بھی اس کی خوف سے کھلی آنکھیں موت کا پتہ دے رہی تھیں۔

"اب آپ مجھے سمجھا سکیں گے کہ یہ کیا ہے؟"

"مم.......... میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے بمشکل کہا۔ "نہ مجھے یہ پتہ ہے کہ اسے کس نے یہاں بند کیا ہے اور نہ یہ کہ یہ کیسے مری۔"

"اور وہ لڑکی کون ہے؟" اس نے چندرا کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ چندرا ہے۔"

"یہ آپ کی کار میں کیا کر رہی ہے؟"

"میں اسے لے کر کروی جا رہا تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔"

"خوب۔ آپ اسے کہاں سے لا رہے تھے؟"

"راجکماری نرملا کی حویلی سے۔"

اس نے مجھے غور سے گھورا۔ "یہ وہاں کیا کر رہی تھی؟"

"نرملا نے اسے زبردستی قید کر رکھا تھا۔"

اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "بہت اچھا۔ آپ نے نرملا کو دیکھا تھا؟"

"جی ہاں۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ چندرا سے انتقام لے گی' اس لئے میں اس حویلی سے لے جا رہا تھا۔"

اب وہ عجیب انداز میں مسکرایا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو۔

"آپ اس طرح کیوں ہنس رہے ہیں' میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں - کیوں نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے مجبور ہوں۔ اس لئے آپ ایسا کیجئے کہ فی الحال کروی چلئے - ہم پہلے تھانے میں آپ کا بیان لیں گے۔ پھر سوچیں گے کہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی تھانے چل کر پوچھ لیجئے گا۔" اس نے کہا۔ "کیا اتنا کافی نہیں کہ آپ کی کار کی ڈگی سے ایک لاش برآمد ہوئی ہے۔"

"لیکن میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"یہی حال ہمارا اپنا بھی ہے مسٹر اختر! لیکن چند ماہ سے اس علاقے میں ہر روز کسی نہ کسی جوان لڑکی یا لڑکے کی لاش برآمد ہو رہی ہے اور ان کی اموات کا سبب ہم اب تک نہیں معلوم کر سکے ہیں۔ نہ ہی قاتل کے بارے میں کچھ پتہ چل سکا ہے۔ پہلی بار ہمیں کوئی مشتبہ شخص ملا ہے لیکن خیر یہ گفتگو تھانے پہنچ کر ہوگی۔"

مجھے اپنی حالت کا احساس پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ صورت حال بڑی نازک تھی۔ میں لاش کے سلسلے میں کوئی وضاحت کرنے سے قاصر تھا لیکن وہ میری کار سے مشتبہ حالت میں برآمد ہوئی تھی۔ اس لئے پریشانی قدرتی تھی لیکن سب انسپکٹر کے حکم کی تعمیل کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

☆------☆======☆

تھانے پہنچ کے ذرا دیر بعد انور بھی وہاں پہنچ گیا۔ نامعلوم لڑکی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی۔ انور بھی صورتِ حال سے بڑا پریشان تھا۔ میری واحد گواہ چندرا تھی جو میری صفائی میں کچھ کہہ سکتی تھی لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود اسے بیدار نہ کیا جا سکا۔ اس پر پُراسرار بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی اس لئے اسے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ میں نے انور سے کہا کہ پولیس کو بیان دینے سے پہلے میں اس سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ انور کے لئے اس کا انتظام کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ چند منٹ بعد ہم دونوں ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھے تھے۔

"سب سے پہلے تو میں یہ بتلا دوں کہ میں بے قصور ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ لڑکی کی لاش ڈگی میں کس نے رکھی اور اسے کس نے ہلاک کیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" انور نے جواب دیا۔ "پولیس بھی تم کو مجرم نہیں سمجھتی لیکن جن حالات میں یہ لاش ملی ہے۔ وہ تم کو مشتبہ ضرور بنا دیتے ہیں۔"

"بے شک لیکن میں اب تک یہ معمہ نہیں حل کر سکا ہوں۔"

"چند ماہ سے چترکوٹ کے گرد و نواح سے ہر روز ایک لاش ضرور ملتی ہے۔" انور نے بتلایا۔ "اسی لئے پولیس وہاں تعینات ہے لیکن تمام تر نگرانی کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے اور کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔" اس نے کہا۔ "عام طور پر پوجا کے لئے جانے والے یاتری شکار ہوتے ہیں۔ میں نے خود کوئی پانچ چھ لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ ہر ایک کی موت خون کی کمی سے واقع ہوئی ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے خون کا قطرہ قطرہ نچوڑ لیا ہے۔ جسم پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ سوائے گردن کے جہاں دو متورم باریک سوراخ ملتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کسی پُراسرار درندے کا شکار ہوتے ہیں۔"

میں سوچتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں نرملا کے پتا جی کے الفاظ گونجے۔ "میں اس کا بھی خون پی جاؤں گا۔" اور میں اچھل پڑا۔

"سنو انور! مجھے نہیں معلوم کہ میرا شبہ کس حد تک صحیح ہے لیکن پہلے تم میری داستان کی تفصیل سن لو۔"

اور پھر میں نے چندرا، شیکھر اور ویدی سے اپنے تعلقات سے لے کر نرملا کی پہلی ملاقات سے اب تک کے تمام واقعات اسے تفصیل سے سنائے۔ وہ دم بخود سنتا رہا۔ ایک دو بار میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے لیکن پھر چپ ہو گیا اور جب میں تمام تفصیلات سنا چکا تو اس نے پوچھا۔

"تم کہتے ہو کہ گزشتہ رات نرملا اور اس کے پتا جی سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ تم کو یقین ہے یہ بھی کوئی خواب تو نہیں؟"

"نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ میں نے بیداری کے عالم میں یہ بات کی ہے۔"

"سب انسپکٹر نے مجھے تمہاری گفتگو کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"لیکن جھوٹ میں کیوں بولوں گا؟"

"اختر! تمہاری اس بات پر کوئی یقین کیسے کر سکتا ہے۔ کیا تمہیں یہ علم نہیں کہ نرملا اور اس کے باپ کو مرے ہوئے مدت ہو چکی ہے۔"

"کیا...........؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"یہ حقیقت ہے۔ تمام لوگ اس کے گواہ ہیں۔" اس نے یقین دلایا۔

"تو پھر میرے خدا........... تو کیا میرا شبہ صحیح ہے کہ..........." میں نے شدید کشمکش کے عالم میں کہا۔

"بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" انور نے جواب دیا۔ "لیکن آج کے سائنسی دور میں کوئی ویمپائر کے وجود پر یقین نہیں کرے گا۔ بلاشبہ بعض قدیم کتابوں میں ان کے وجود کا اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسے مردے رات کو انسانوں کی مانند زندہ ہو جاتے ہیں اور ان میں اور عام انسانوں میں تمیز کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ سنا ہے کہ وہ انسانوں اور جانوروں کے خون سے سیراب ہو کر زندہ رہتے ہیں اور اپنے شکار کو سحرزدہ کر کے قابو میں کر لیتے ہیں لیکن اگر ہم کہانی پولیس کو سنائیں گے تو کون یقین کرے گا؟"

"مجھے احساس ہے انور لیکن یہ حقیقت ہے۔"

"پھر انہوں نے تم کو کیسے چھوڑ دیا؟"

"شاید نرملا نے سچ کہا ہو........... شاید اسے واقعی مجھ سے محبت ہو گئی اور شاید..........."

"لیکن پیارے عدالت اس شاید پر تو یقین نہیں کرے گی۔ ہمیں اس دور کے قانون سے واسطہ ہے جو ویمپائر کے وجود کو نہیں مانتا۔"

"صرف ایک صورت ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

میں نے اسے اپنی تجویز بتلائی۔ "اس صورت میں پولیس خود چشم دید گواہ بن جائے گی۔"

"ہاں تجویز معقول ہے۔" انور نے کہا۔ "میں ابھی ایس پی ماتھر سے بات کرتا ہوں۔"

"اس سے پہلے میں چندرا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں خود یہی سوچ رہا تھا۔ شاید اسے ہوش آ گیا ہو اور اس کا بیان تمہاری بات میں وزن پیدا کر سکتا ہے۔" اس نے کہا۔ "آؤ........... ہم پہلے ہسپتال چلتے ہیں۔"

☆————☆————☆

ہم ہسپتال پہنچے تو چندرا بے ہوش تھی۔

انور اور انسپکٹر شنکر میرے ساتھ تھے۔ وہ اس طرح بے خبر پڑی تھی جیسے گہری نیند سو رہی ہو۔ میں نے سرہانے پہنچ کر اس کا شانہ ہلایا لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ اچانک میری نظر

اس کے سرہانے رکھے ہوئے تعویذ پر پڑی اور میں چونک گیا۔ شاید نرس نے انجکشن وغیرہ دیتے ہوئے اسے کھول کر رکھ دیا ہو گا۔ میں نے فوراً تعویذ اس کے بازو پر باندھ دیا۔

"کیا کر رہے ہو اختر؟" انور نے پوچھا۔

"تم اس بات کی سختی سے ہدایت کر دو کہ یہ تعویذ ایک لمحے کے لئے بھی اس کے بازو سے نہ کھولا جائے۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟" انور نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"اس کی زندگی بچانے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے تم کو بتلایا نہیں تھا کہ نرملا تعویذ سے دور بھاگتی ہے؟"

"ٹھیک ہے تم دونوں یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آیا۔" اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"اختر صاحب۔" انسپکٹر نے اچانک کہا۔ "شاید میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آپ کو دیوانہ یا مکار تصور کرتا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کا شبہ صحیح ہے۔"

"واقعی انسپکٹر۔" میں خوش ہو کر بولا۔ "تم کو میری بات پر یقین ہے؟"

"ہاں۔ کیونکہ میں چھٹیوں میں گھر گیا تھا۔ تو ایک دن میں نے ان پُراسرار وارداتوں کا ذکر اپنے پتا جی سے کیا تھا۔ انہوں نے بھی یہی شبہ ظاہر کیا تھا اور مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں مولوی پیارے میاں سے اس سلسلے میں ملاقات کروں لیکن میں نے ان کی بات پر توجہ نہ دی تھی۔"

"یہ پیارے میاں کون ہیں؟"

"ہمارے گاؤں کے ایک بزرگ ہیں۔ کہتے ہیں کہ بڑے عالم ہیں اور ایسے معاملات میں بہت عبور رکھتے ہیں۔"

"تو پھر کیوں نہ آزمائش کر لیں۔ ممکن ہے اس سے بہت سے بے گناہوں کی زندگی بچ جائے۔"

"ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" انسپکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پر معلوم نہیں پیارے میاں یہاں آنے پر تیار بھی ہوں گے یا نہیں۔"

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

"ٹھیک ہے لیکن میرا گاؤں بہت دور ہے۔ وہ آج تو یہاں نہیں پہنچ سکیں گے۔ پھر بھی میں آدمی بھیج دیتا ہوں۔"

اسی وقت انور ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ میٹرن اور دو نرسیں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ انور نے ہم سے تعارف کرایا۔

"اختر۔ یہ ڈاکٹر برلاس ہیں۔ ہمارے ہسپتال کے سینئر فزیشن۔" اس نے کہا۔ "چندرا ان کے زیر علاج ہے۔"

میں نے بڑے ادب سے ڈاکٹر برلاس سے ہاتھ ملایا۔ "ڈاکٹر! اس کے ہوش میں آنے کی کب تک امید ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں خود حیران ہوں۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔ "اس کی بے ہوشی کا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ کم از کم کوئی فزیکل وجہ نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح معائنہ کیا ہے اور ہوش میں لانے کی تمام تدابیر کر چکا ہوں۔ صرف یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شاید بے ہوشی کا کوئی نفسیاتی سبب ہو۔ کوئی صدمہ پہنچا ہو یا پھر.........."

"یا پھر کیا ڈاکٹر.........؟" انسپکٹر نے فوراً پوچھا۔

ڈاکٹر برلاس نے ہماری طرف دیکھا۔ "انور نے مجھے تمام تفصیلات بتا دی ہیں اور اگر ان پر اعتبار کر لیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ لڑکی انہی غیر مرئی اثرات کے زیر اثر ہے۔"

"کیا یہ ممکن ہے ڈاکٹر؟" اس نے پوچھا۔

"دنیا میں بہت سے ایسے اسباب ہیں جن پر ہم سائنس کے نکتہ نظر سے یقین نہیں کر سکتے۔ پھر بھی ہمیں ان سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور ہم ان کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، بہر حال وقت اس حقیقت کو ثابت کر دے گا۔"

چندرا کے لئے ایک علیحدہ کمرہ اور دو نرسوں کا بندوبست کر دیا گیا۔ ہم جب باہر نکل رہے تھے تو انور نے کہا۔ "میں نے تعویذ کے بارے میں سختی سے ہدایت کر دی ہے تم مطمئن رہو۔"

ہم پولیس اسٹیشن پہنچے تو پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آ گئی تھی۔ نامعلوم لڑکی کی موت خون کی کمی سے واقع ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔

میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ انور کی ضمانت پر مجھے اس کے بنگلے میں جانے کی اجازت مل گئی۔ نہا دھو کر میں نے لباس تبدیل کر لیا اور سہ پہر کو کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم چائے پی رہے تھے تو ڈاکٹر برلاس بھی آ گئے۔

"اگر تم برا نہ مانو تو میں ایک تجویز پیش کروں؟"

"جی فرمایئے۔"

"اختر کو آج میرے حوالے کر دو۔ ان کو آج میں اپنے نفسیاتی وارڈ میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

انور نے میری سمت دیکھا۔

"ڈاکٹر ویسے میں پاگل نہیں ہوں لیکن مجھے منظور ہے۔ اس طرح میری بھی تسلی ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر برلاس مسکرا دیئے۔ "مجھے تمہاری ذہنی حالت پر شبہ نہیں اختر۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن میں تمہاری ذہنی کیفیت کا بطور معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں حاضر ہوں ڈاکٹر۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نفسیاتی وارڈ کی دو منزلہ عمارت کسی قید خانے سے کم نہیں تھی۔ بلند چار دیواری پر خار دار تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ داخلے کا صرف ایک گیٹ تھا جس پر مسلح پہرہ دار ہر لمحہ موجود رہتا تھا۔ احاطے کے اندر ہر سمت بڑی بڑی سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ مضبوط جسم والے بہت سے وارڈ بوائے عمارت کے مختلف حصوں میں گھومتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر برلاس ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک میرا معائنہ کرتے رہے تھے۔ ایکسرے۔ خون اور پیشاب اور تمام کیمیکل ٹسٹ کے بعد انہوں نے مسکرا کر مجھے صحیح الدماغ قرار دیا تھا۔

اور پھر مجھ سے دوبارہ تفصیلات سنتے رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے اتنے سوالات کئے کہ میں تھک گیا اور بالآخر وہ مجھے اس کمرے تک چھوڑ آئے جو پہلی منزل پر واقع تھا۔

کمرے میں ایک آرام دہ بستر' دو کرسیاں اور ایک میز موجود تھی۔ میز پر تازہ پھل' ایک گلاس میں دودھ اور ایک میں جوس رکھا ہوا تھا۔ کھانے کے لئے ایک پلیٹ میں صرف سینڈوچز تھے لیکن ہر چیز پلاسٹک کی تھی۔ شیشے یا لوہے کی کوئی چیز نہ تھی۔ کمرے کی واحد کھڑکی جس گیٹ کی سمت کھلتی تھی لیکن اس پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں مضبوطی سے لگی ہوئی تھیں۔ روشندان بلندی پر تھا۔ غرض یہ کہ ذہنی مریضوں کو رکھنے کے لئے تمام تر احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں۔ میرا ذہن چندرا میں لگا ہوا تھا لیکن ڈاکٹر نے فون کرنے کے بعد بتلایا کہ وہ اب تک بے ہوش ہے۔

مجھے ابھی بھوک نہ تھی اس لئے بستر پر آرام سے لیٹ گیا۔ ذہن یہ قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ جس ترلا سے میں اتنی بار مل چکا تھا' جس کے گداز جسم کا لمس محسوس کر چکا تھا جس سے اتنی بار بات چیت کر چکا تھا' وہ انسان نہ تھی۔ ویمپائر تھی۔ ایک ایسی

لاش تھی جو نہ زندوں میں تھی نہ مُردوں میں' جس کی غذا خون تھی۔ انسان کا تازہ لہو پی کر جس کے جسم میں زندگی کی توانائیاں بھر آتی تھیں اور جو رات کو زندہ ہو جاتی تھی۔ تاریکی اس کے لئے حیات اور اجالا موت کا پیامبر تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔

وہ مجھ سے محبت کرتی تھی اور چندرا سے پیار کرتی تھی اور اس لئے اس نے ہم دونوں کا لہو نہیں پیا۔ اپنے باپ کو ہم سے دور رکھا۔ وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ شاید اسے زندگی میں پیار نہیں ملا تھا اس لئے وہ پیار کی بھوکی تھی۔ مجھے اس کی التجا آمیز آنکھیں یاد آگئیں اور اس سے نفرت کے بجائے ایک نامعلوم سی ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

تاریکی پھیلتے ہی کمرے کی بجلی روشن ہو گئی اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ بجلی کا سوئچ بھی کمرے میں نہیں تھا۔ اس لمحے ڈاکٹر برلاس کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہمراہ ایک اور شخص بھی تھا۔ اس نے کمرے میں ایک خودکار کیمرہ نصب کیا۔ جس کا رخ دریچے اور روشندان کی سمت تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ میرے بستر کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"تم نے جو تجویز انور کو پیش کی تھی اس میں تھوڑی سے ترمیم میں نے کر دی ہے۔" انہوں نے کہا اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ "شاید کافی آ گئی۔ کم ان۔" انہوں نے کہا۔ ایک باوردی سفید پوش بیرا کافی کے دو مگ ٹرے میں لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔ یہ مگ بھی پلاسٹک کے تھے۔

"لو کافی پیو۔"

"شکریہ۔" میں نے مگ لیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر اختر۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔ "جب میں لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو مجھے روحانیات پر تحقیق کا شوق ہوا اور میں سائمک سوسائٹی کا ممبر بن گیا۔" انہوں نے کافی کا مگ رکھ کر میری طرف دیکھا۔ "یہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو روحانیت پر تحقیق کا سب سے پرانا مرکز ہے اور اس میں دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے ممبر شامل ہیں۔ ہندوستان سے اس کی نمائندگی کا شرف مجھے حاصل ہے۔ ہم روح کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ دنیا میں ہونے والے تمام روحانی واقعات کا ریکارڈ اس سوسائٹی میں موجود ہے اور یہیں پر مجھے ویمپائر کے وجود کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔"

"تو میرا شبہ غلط نہیں تھا؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں، لیکن مجھے یہ بتلاؤ کہ تمہیں یہ شک کیوں ہوا؟"

"نرملا میرے تعویذ سے خوف زدہ ہو جاتی تھی اور گزشتہ رات جب وہ میری سمت بڑھی تو تعویذ اس کے بازو سے مس ہو گیا۔ وہ چیخ کر خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹی اور اس کے بعد ایک چمگادڑ نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ تب میرے ذہن میں اس شبہ نے جنم لیا۔ میں نے ویمپائر پر ایک ناول پڑھا تھا اور جو کچھ اس میں پڑھا تھا وہ میرے حالات سے بڑی مشابہت رکھتا تھا۔"

"تم خوش قسمت ہو اختر۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔ "ورنہ اب تک نرملا تم کو بھی اپنی برادری میں شامل کر چکی ہوتی۔"

"لیکن ڈاکٹر! رات کو حویلی میں وہ نوکر چاکر، وہ رقص و سرود۔ کیا وہ سب بھی خواب تھا؟"

"نہیں، ممکن ہے وہ سب نرملا کے باپ کے شکار ہوں اور ان کی طرح تاریکی میں زندہ ہو جاتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سب کچھ تم کو تنویمی کیفیت میں نظر آتا ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"ویمپائرز ایک تیز اور زود اثر تنویمی قوت کی مالک ہوتی ہیں وہ عموماً اپنے شکار کو ہپناٹائز کر کے بے بس کر دیتی ہیں تاکہ وہ مزاحمت نہ کر سکے۔"

مجھے اچانک نرملا کے باپ کی آنکھیں یاد آئیں اور پھر وہ چمگادڑ جس نے کار کے سامنے بیٹھ کر مجھے بے حس کر دیا تھا۔ اس کی انگاروں کی سی دہکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے ہی میں کمزور سا ہو گیا تھا۔

"ڈاکٹر! اگر یہ سچ تسلیم کر لیا جائے کہ میرا واسطہ ویمپائر کے ایک خاندان سے پڑ گیا تھا تو یہ سب زندہ کیسے تھے۔ ان کو غذا کے لئے اتنا خون کہاں سے مل جاتا تھا؟"

"بڑا اچھا سوال ہے۔ میں نے بھی اس بارے میں سوچا تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"ویمپائر جانوروں یا انسانوں کے خون پر زندہ رہتی ہیں۔ میں نے انسپکٹر شنکر سے معلومات حاصل کی ہیں۔ بہت مدت سے چترکوٹ کے علاقے میں جانوروں کی لاشیں ملتی تھیں جن کے جسم پر کوئی نشان نہ ہوتا تھا۔ جب ابتداء میں یہ سلسلہ شروع ہوا تو لوگوں نے سمجھا کہ سانپ کے کاٹنے سے یہ مرے ہیں۔ بعد میں لوگوں نے اس کو جانوروں کی پُراسرار بیماری

سے تعبیر کیا۔ لیکن جب انسانی لاشیں ملنے لگیں تو پولیس میدان میں آئی۔"

خوف سے میرے جسم میں جھرجھری آ گئی۔

"یہ سوچ کر ہی خوف آتا ہے کہ میں اور چندرا دونوں اتنے عرصے تک لاشوں کے درمیان پھنسے ہوئے تھے۔"

"بے شک، لیکن شاید تم دونوں ہی ان کی موت کا ذریعہ بن جاؤ۔ ورنہ جانے کتنے انجان لوگ ان کے شکار ہوتے رہیں گے۔"

"کیا ان کو ختم کرنے کی کوئی صورت ہے ڈاکٹر؟"

"ہم کوشش کریں گے۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب تم آرام کرو اور سنو، میں نے تمہارے دروازے پر ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ ضرورت ہو تو اسے آواز دے لینا اور دروازہ کھلا رہے گا۔ یہاں کے دروازوں میں تالے نہیں ہیں۔ اسے بند نہ کرنا کیونکہ میں دوبارہ آؤں گا۔"

☆------☆------☆

میں بستر پر پڑا دیر تک سوچتا رہا۔ ٹھیک نو بجے روشنی بجھ گئی.......... یہ مریضوں کے سونے کا وقت تھا۔ تاریکی ہوتے ہی انجانے وسوسوں نے ذہن میں جنم لینا شروع کر دیا اور پھر جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

آنکھ کھلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی پکار رہا ہے۔ ہر سمت تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے بے ساختہ کھلے دروازے کی سمت دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اسی لمحہ پھر کسی نے پکارا۔

"اختر۔ میں یہاں ہوں۔"

میں نے گھوم کر دریچے کی سمت نظر کی تو ایک چہرہ نظر آیا۔ کوئی دریچے سے جھانک رہا تھا لیکن تاریکی اور دریچے پر لگی ہوئی سلاخوں اور جالی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر تیزی کے ساتھ دریچے کی سمت پہنچا۔

"چندرا.......... تم؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ دریچے کے باہر چندرا کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

"ہاں اختر، تم فوراً باہر آ جاؤ۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

لیکن نیند کا خمار آہستہ آہستہ دور ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چندرا کھڑکی کے باہر کیسے پہنچی۔ باہر کوئی بالکونی نہ تھی اور میرا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔

"تم اندر کیوں نہیں آگئیں؟" میں نے سوال کیا۔

"بحث مت کرو۔ وقت نہیں ہے۔ تم فوراً باہر لان میں آ جاؤ۔"

لیکن اب میں سمجھ چکا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں نہیں آ سکتا مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔ باہر کوئی نہیں ہے۔ تم اطمینان سے آ سکتے ہو۔" چندرا نے التجا کی۔

"نہیں نرملا۔ تم اس طرح مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور دوسرے ہی لمحے چندرا کے روپ میں جھانکتی ہوئی نرملا کا چہرہ غصے سے بھیانک ہو گیا اور اچانک اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میں تاریک گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔

"اختر! تم کیا اپنی چندرا کی بات نہیں مانو گے؟" مجھے چندرا کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"میں تمہارے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"بس تو خاموشی سے باہر آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

میرے قدم بے اختیار دروازے کی سمت بڑھے۔ کمرے میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اور کوئی میرے سامنے آ گیا۔

"ہٹ جاؤ۔ میں باہر جا رہا ہوں۔" میں نے غصے سے دھکا دیا۔

"ہوش میں آؤ اختر۔" مضبوط ہاتھوں نے مجھے جکڑ لیا۔

"مکار...... فریبی۔" دریچے سے آواز آئی۔ "مجھے دھوکہ دیتا ہے۔ میں تجھے ایسا سبق دوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

کوئی مجھے جھنجوڑ رہا تھا اور بالآخر مجھے اچانک ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر برلاس اور ان کا اسسٹنٹ مجھے بازوؤں میں دبوچے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔

"آپ......؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں اختر۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ ہم یہاں موجود تھے ورنہ تم اس کے جال میں پھنس جاتے۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔

"خدایا......" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "مجھے کیا ہو گیا تھا ڈاکٹر؟"

"تم اس کی آنکھوں سے سحر زدہ ہو گئے تھے اور اس عالم میں تم اس کی ہدایت پر عمل کر گزرتے۔" ڈاکٹر اپنے ساتھی کی سمت مڑا۔ "فلم ابھی ڈیولپ کرو سدھیر مجھے یقین ہے کہ اس کی تصویر نہیں آئی ہو گی لیکن پھر بھی تصدیق ضروری ہے۔" اس نے کہا۔ "اور جاتے ہوئے دو کپ کافی بھجوا دینا۔"

ڈاکٹر برلاس کا خیال صحیح تھا۔ فلم پر کوئی تصویر نہیں آئی تھی سوائے دریچے کے۔ کافی پیتے ہوئے مجھے اچانک چندرا کا خیال آیا۔ میں اچھل پڑا۔

"ڈاکٹر چندرا اکیلی ہے۔ وہ شدید خطرے میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نرملا......"

"آؤ۔" ڈاکٹر برلاس میرا جملہ پورا ہونے سے قبل کھڑے ہو گئے تھے۔ "مجھے بالکل خیال نہ رہا تھا۔"

زنانہ وارڈ ہماری بلڈنگ کے بالکل سامنے واقع تھا۔ ہم تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ چندرا کا کمرہ تاریک تھا۔ اس کے دروازے پر تعینات وارڈ بوائے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہم ایک لمحہ کے لئے دروازے پر رکے۔ ڈاکٹر نے مجھے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور ہم آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے جیب سے ٹارچ نکالا کر بستر پر روشنی پھینکی۔ چندرا کا بستر خالی تھا۔ اس کے برابر بیٹھی ہوئی نرس بستر سے ٹکی ہوئی بے خبر سو رہی تھی۔

"غضب ہو گیا وہ چندرا کو لے گئی۔" میں بدحواسی کے عالم میں چیخا۔

ڈاکٹر نے ٹارچ کی روشنی میں پورا کمرہ اور غسل خانہ دیکھا اور ہم دونوں بھاگتے ہوئے باہر نکل گئے۔ گیٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے حیرت زدہ ہو کر ڈاکٹر کو دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"تم نے اس لڑکی کو باہر کیوں جانے دیا؟" ڈاکٹر نے گرج کر پوچھا۔

"ج۔ جی میں سمجھا شاید وہ لان میں ٹہلنے جا رہی ہیں۔"

"لان پر؟ کتنی دیر ہوئی اسے گئے ہوئے؟"

"جی۔ بس ابھی گئی ہیں۔ آپ کے آنے سے دو منٹ پہلے۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" ڈاکٹر نے کہا۔

ہم تینوں بھاگتے ہوئے سامنے پھیلے ہوئے وسیع لان پر پہنچے۔ ڈاکٹر نے ٹارچ کی

روشنی میں ہر سمت دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ لان کے کنارے کنارے پھولوں کی کیاریاں اور کنیر کی گھنی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر برلاس نے جھاڑیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا۔ میرا دل انجانے اندیشے سے بیٹھا جا رہا تھا۔ جانے چندرا زندہ بھی ہو گی یا نہیں' ہم ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ جھاڑیوں سے ایک تیز چیخ ابھری اور دوسرے ہی لمحے ایک بڑی سی چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی فضا میں اڑی۔ ہم لپک کر جھاڑیوں کے درمیان آ پہنچے۔ چندرا کا ساکت جسم جھاڑیوں کی آڑ میں پڑا ہوا تھا۔

"چندرا۔" میں چیخ مار کر آگے بڑھا۔ "چندرا......... اوہ چندرا۔" میں اپنی سسکی نہ روک سکا۔

"اسے اٹھا کر کمرے میں لے چلو اختر۔ وقت ضائع نہ کرو۔" ڈاکٹر نے مجھے ڈانٹا۔

ڈاکٹر برلاس کے حکم پر چندرا کے کمرے کی لائٹ جلا دی گئی تھی۔ چندرا زندہ تھی۔ بستر پر ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ چندرا کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے لیکن ہم وقت پر پہنچے تھے۔ اس کے بازو پر بندھا ہوا تعویذ تقریباً کھل چکا تھا۔ اس کے بازو پر جگہ جگہ خراشیں تھیں جیسے کسی نے تعویذ نوچنے کی شدید جدوجہد کی ہو۔

"ڈاکٹر! آپ یہ خراشیں دیکھ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نرملا تعویذ کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھی پھر یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟"

"چندرا کی۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "نرملا کے تنویمی عمل کے زیر اثر اس نے خود تعویذ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ہم کو ذرا دیر ہو جاتی تو بدروح اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔"

"خدایا۔ ہم کس عذاب میں گرفتار ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا اس بلا سے نجات نہیں ملے گی؟"

"ہمت سے کام لو اختر۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب وہ ہمیں اس طرح بے بس کر سکتی ہے تو کسی دن کامیاب بھی ہو جائے گی۔"

"ہم اسے موقع نہیں دیں گے۔ کل ہم اسے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"لیکن کیسے؟"

"وقت آنے پر دیکھ لینا۔ فی الحال اپنے حواس پر قابو رکھو۔"

نرس کو ہوش آ گیا تھا وہ بتلانے سے قاصر تھی کہ اسے نیند کیسے آ گئی۔ اسے کچھ نہ یاد تھا۔ دروازے پر متعین وارڈ بوائے کا کہنا تھا کہ اسے نرس نے کافی لانے کے لئے بھیجا تھا۔ تمام رات کمرے میں روشنی جلتی رہی اور ہم کرسیوں پر بیٹھے انتظار کرتے رہے لیکن نرملا دوبارہ نہ آئی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن ہم سہ پہر کو چترکوٹ میں نرملا کی حویلی پہنچ گئے۔ ہمارے ہمراہ پولیس کی جیپ تھی اور انسپکٹر شنکر مولوی پیارے میاں کو بھی لے آیا تھا۔ ڈاکٹر برلاس بھی اپنے کہنے کے مطابق پوری تیاری سے آئے تھے' ان کا کہنا یہ تھا کہ نرملا رات سے قبل بیدار نہ ہو گی' اس لئے ہمیں دن کی روشنی میں ان کے مسکن کا پتہ چلا لینا چاہئے۔ ہم نے تمام حویلی چھان ماری۔ تمام کمرے خالی تھے۔ ہر چیز پر گرد و غبار کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔ نہ وہ رات والی رونق تھی نہ محفل رقص و سرود کے آثار نہ وہ آسائش و زیبائش۔

مجھے یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ وہی حویلی ہے۔ میں اس کو اپنی آنکھوں سے آباد دیکھ چکا تھا۔ میں یہاں قیام کر چکا تھا۔ رقص و نغمے کی بزم سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر برلاس اور دوسرے تمام لوگ کئی گھنٹے کی تلاش کے بعد تھک گئے۔ ہم نے حویلی کے گرد و پیش قلعے کے کھنڈرات بھی چھان مارے لیکن لاحاصل۔ نہ کہیں کوئی خفیہ مسکن ملا نہ کوئی قبر جس میں زندہ لاشوں کا سراغ ملتا۔

"اب کیا کرنا چاہئے؟" انسپکٹر شنکر نے پوچھا۔

"رات کا انتظار۔" ڈاکٹر برلاس نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ رات کو نرملا اور اس کے ساتھیوں سے ضرور ملاقات ہو گی۔"

"بے شک۔ مجھے بھی یقین ہے۔" میں نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

مولوی پیارے میاں مسلسل دعائیں پڑھنے میں مصروف رہے۔ ساتھ میں آئے ہوئے سپاہیوں نے چائے بنائی اور ہم ناشتہ کر کے چائے پینے لگے۔ گفتگو کا موضوع نرملا تھی لیکن میرا ذہن چندرا کے لئے فکرمند تھا۔ ڈاکٹر برلاس نے اس کی حفاظت کے انتظامات کر دیئے تھے۔ سب انسپکٹر گھوش کو نگرانی کے لئے چندرا کے کمرے میں مقرر کر دیا تھا لیکن میں پھر بھی مطمئن نہ تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی کئی ایک پٹرومیکس جلا لئے گئے۔ ہم اپنے ہمراہ ٹارچیں بھی لے کر آئے تھے۔ میرے پاس بھی ٹارچ موجود تھی۔ ہم

حویلی کے سامنے بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ ہر سمت موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ یہاں تک کہ مکمل تاریکی چھا گئی۔ میری نگاہیں حویلی کی سمت لگی ہوئی تھیں لیکن وہاں مکمل سکوت طاری تھا۔

"تعجب ہے۔" میری زبان سے نکلا۔

"کیا ہوا۔ کس بات پر تعجب ہے؟" انور نے پوچھا۔

"اندھیرا ہوتے ہی حویلی میں چہل پہل ہو جاتی تھی لیکن آج سناٹا ہے۔"

"انہیں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا ہو گا۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔

"وہ دیکھیے۔" انسپکٹر شنکر نے اچانک کہا۔ "اس مینار کے اوپر والے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔"

سب کی نظریں بے ساختہ اوپر اٹھیں۔ بلاشبہ اس کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی جس میں، میں کئی مرتبہ قیام کر چکا تھا۔ انسپکٹر کھڑا ہو گیا۔

"آئیے۔ وہاں ضرور کوئی موجود ہے۔" اس نے پولیس والوں کو اشارہ کیا۔

"ٹھہرو انسپکٹر۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔ "ہمارا واسطہ کسی خطرناک مجرم سے نہیں جسے تم گرفتار کر لو، روحوں سے ہے۔"

"پھر کیا کریں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"صبر و تحمل سے کام لو۔" مولوی صاحب پہلی مرتبہ بولے۔ "اور ہمارے پیچھے آؤ۔ بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"کوئی آدمی تنہا نہ رہے۔" ڈاکٹر برلاس نے ہدایت کی۔ "پیٹرومیکس یہیں رہنے دو، ٹارچیں ساتھ لے لو۔"

ہم ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے حویلی کی سمت بڑھے۔ ڈاکٹر برلاس سب سے آگے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں پستول تھا دوسرے میں ٹارچ۔ ان کے پیچھے مولوی پیارے میاں تھے جن کی سفید داڑھی تاریکی میں چمک رہی تھی، ان کے پیچھے میں، انسپکٹر شنکر اور ڈاکٹر انور تھے۔ ہر ایک کا دل آنے والے لمحات کے خطرے سے اچھل رہا تھا۔ ہم ابھی سیڑھیاں چڑھ کر حویلی کے پھاٹک پر پہنچے تھے کہ انور چلایا۔

"ڈاکٹر برلاس۔ ہوشیار۔"

ڈاکٹر اچھل کر آگے بڑھا اور اسی لمحہ ایک بہت بڑا سا پتھر حویلی کی چھت سے ایک دھماکے کے ساتھ گر کر چکنا چور ہو گیا۔ اگر ایک لمحہ بھی دیر ہو جاتی تو ڈاکٹر کے جسم کا

بھرتہ ہو جاتا۔ بیک وقت کئی ٹارچیں اوپر کی سمت بلند ہوئیں۔ حویلی کی چھت پر بنی ہوئی پتھر کی منڈیر ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ ممکن ہے یہ اتفاقیہ حادثہ رہا ہو لیکن دل قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ چند لمحے انتظار کر کے ہم اندر داخل ہوئے۔ بڑا ہال بالکل خالی تھا۔ فرش پر بچھے ہوئے قالین پہ گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ٹارچوں کی روشنی میں ہر سمت جائزہ لیا گیا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔

"اوپر جانے کا زینہ سامنے ہے۔" میں نے بتلایا۔

ہم سب زینے کی سمت بڑھے۔ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور کوئی زور سے چیخا۔ سب گھبرا کر پلٹے۔ ٹارچ کی روشنی فرش پر پڑی۔ چھت پہ لٹکا ہوا جھاڑ ٹوٹ کر گر پڑا تھا اور پیچھے آنے والا کانسٹیبل پیر پکڑے کراہ رہا تھا لیکن وہ بال بال بچ گیا تھا۔ صرف اس کا پیر زخمی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے لپک کر اسے دیکھا۔ زخم معمولی تھا لیکن اب اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ ہم نرملا کے حملوں کی زد میں تھے۔

"تم دونوں جیپ کے پاس جا کر بیٹھو۔ پیٹرومیکس روشن رکھنا۔" ڈاکٹر برلاس نے کانسٹیبلوں سے کہا جو خوف سے سہمے ہوئے تھے۔

ہم زینہ طے کر کے اوپر والے کمرے میں پہنچ گئے لیکن وہ خالی تھا۔ وہاں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے نظر آنے والی روشنی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہم ایک بار پھر زینہ اتر کر پہلی منزل تک آئے۔ جہاں ان گنت کمرے بنے ہوئے تھے، دن میں ہم ان کمروں کی تلاشی لے چکے تھے لیکن ایک بار پھر دیکھ لینے میں کوئی حرج نہ تھا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے میں ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ میرے پیچھے آتے ہوئے انور اور انسپکٹر بھی رک گئے۔

"کیا بات ہے اختر؟" انور نے پوچھا۔

ڈاکٹر برلاس اور مولوی صاحب بھی مڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔

"یہ مقفل دروازہ ہے۔" میں نے کہا۔ "دن میں ہم نے اس کے اندر نہیں دیکھا تھا۔"

"ہاں شاید یہ اس شکستہ حصے کی سمت کھلتا ہے جو ہم باہر سے دیکھ چکے ہیں۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔ "ضرورت ہوئی تو کل دن میں اسے توڑ دیں گے۔"

دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ ہم اسے کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ ہم پھر آگے بڑھے اور اسی لمحے راہداری کے اگلے حصے سے ایک بھیانک قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

قہقہہ اتنا بھیانک تھا کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر برلاس نے پھرتی سے ٹارچ کی روشنی ادھر پھینکی لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ اچانک ایک پھڑپھڑ کی آواز ہوئی اور ایک چمگادڑ چھت سے اڑ کر ڈاکٹر برلاس کی سمت جھپٹی۔ ڈاکٹر برلاس کے پستول سے فائر ہوا۔ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ بلند ہوئی' سب تیزی سے آگے جھپٹے۔ میں نے جیسے ہی قدم آگے بڑھانا چاہا کسی کے نرم و نازک ہاتھوں نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں گھبرا کر پلٹا۔

نرملا میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اپنی تمام تر قیامت خیز رعنائیوں کے ساتھ۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اس دروازے کی سمت گھسیٹا جو کھلا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ وہی دروازہ جسے ہم کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ نرملا کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں اور ان میں جلتی ہوئی آگ کی چمک نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ خدایا وہ کتنی حسین تھی۔ آج تک میں نے اسے جی بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ میں بلا تامل اس کے ہمراہ دروازے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی سب چونک کر ادھر پلٹے۔ بیک وقت کئی ٹارچ کی روشنیاں ادھر پڑیں اور پھر انور نے چیخ کر کہا۔ "اختر کہاں ہے؟"

وہ بھاگتے ہوئے دروازے کے قریب آئے لیکن دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود دروازہ نہ کھل سکا۔ انہوں نے ہر سمت مجھے تلاش کیا۔ تمام کمرے چھان مارے لیکن میرا کہیں پتہ نہیں تھا۔

"بلاشبہ وہ اسی میں گیا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "وہ پہلے بھی اس کے سامنے رکا تھا۔ مجھے اس شخص کی حرکتوں پر پہلے بھی شبہ ہو رہا تھا۔"

"بیوقوف آدمی۔ وہ خود نہیں گیا اسے لے جایا گیا ہے۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"لیکن کیسے؟"

"انسپکٹر یہ بحث کا وقت نہیں۔ اختر کی زندگی خطرے میں ہے۔" ڈاکٹر برلاس نے غصے سے کہا۔ "اس دروازے کو ہر قیمت پر توڑنا پڑے گا۔"

"میں چند کدالیں ساتھ لایا تھا' وہ جیپ میں ہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔

"میں ابھی لے کر آیا۔" انور بدحواسی کے عالم میں آگے بڑھا۔

"ٹھہرو ہم ساتھ چلیں گے۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔ "کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی تنہا نہ رہے۔"

وہ سب ایک ساتھ نیچے اترے۔ زخمی کانسٹیبل اور اس کا ساتھی خوفزدہ اور سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ جیپ میں چار کدالیں موجود تھیں۔ وہ ان کو لے کر واپس ہوئے لیکن ابھی حویلی میں پہنچے بھی نہ تھے کہ ایک فلک شگاف دھماکے سے فضا گونج اٹھی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ دم بخود کھڑے رہ گئے۔ پھر ڈاکٹر برلاس نے بھاگ کر جیپ کے پاس پڑا پیٹرومیکس اٹھایا اور وہ تیزی سے اندر داخل ہوئے۔

ہال میں ہر سمت گرد و غبار بھرا ہوا تھا جس میں کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ دھول ان کی آنکھوں اور حلق میں گھس گئی۔ سب کھانسنے لگے اور سب کی نگاہیں اوپر جانے والے زینے پر تھیں جو ملبے سے اٹا پڑا تھا۔ اوپر کی چھت اس طرح گری تھی کہ زینہ بھی اس کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا تھا اور اب اوپر جانے کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔

"میرے خدا اب کیا ہو گا؟" انور نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر برلاس بھی بدحواسی کے عالم میں سامنے دیکھ رہے تھے اور اس لمحہ فضا میں ایک بار پھر بھیانک قہقہوں سے گونج اٹھی۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"اب کیا ہو گا ڈاکٹر؟" انور بے بسی کے عالم میں چیخا۔

"خدا پر بھروسہ رکھو بیٹے۔" مولوی پیارے میاں نے کہا۔ "تم کسی بھی طرح اس دروازے تک پہنچ کر اندر جانے کا بندوبست کرو۔ میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو اختر کا بال بھی بیکا نہ ہو گا۔"

وہ سب حویلی سے باہر آ گئے۔ مولوی صاحب ایک صاف سی جگہ مصلہ بچھا کر عبادت کے لئے بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر برلاس اور اس کے ساتھی صورت حال پر غور کرنے لگے۔

"اگر ہم کسی طرح اوپر کی منزل تک پہنچ جائیں تو دروازہ توڑ سکتے ہیں۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔ "کیونکہ چھت صرف زینے کی گری ہے۔"

"لیکن اتنی بلندی پر سیڑھی کے بغیر کیسے پہنچ سکتے ہیں؟" ڈاکٹر انور نے کہا۔

"ٹھہرو سیڑھی کا بندوبست ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر نے فوراً کہا۔ "سامنے بانس رکھے ہوئے ہیں۔"

کلہاڑی جیپ میں رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ اصطبل کے پاس رکھے ہوئے بانسوں سے سیڑھی تیار کرنا شروع کی لیکن تمام تر عجلت کے باوجود کافی دیر لگ گئی اور جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوئے تو بارہ بجنے والے تھے۔ وہ سیڑھی لے کر اس کھڑکی کے نیچے آئے جو پہلی منزل پر کھلتی تھی۔ ڈاکٹر برلاس اپنی کار تک گئے اور وہاں

سے کلام پاک، کا ایک، چھوٹا سا نسخہ نکال کر انہوں نے اسے اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس کے بعد ان کے پاس پہنچے۔

"پہلے میں اوپر جاؤں گا۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن سر یہ مناسب نہیں ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"نہیں مناسب سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

اور پھر وہ اطمینان سے عارضی بنی ہوئی سیڑھی پر اوپر چڑھنے لگے۔ اب تک کے واقعات نے ان سب کو بہت دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس لئے خوف زدہ نگاہوں سے اوپر دیکھ رہے تھے جیسے کسی لمحہ کوئی نیا حادثہ رونما ہونے والا ہو۔

☆======☆======☆

ادھر اختر ایک نئی مصیبت میں گرفتار تھا۔

نرملا اور اس کے باپ میں شدید بحث جاری تھی۔ نرملا کا باپ پیاسی نظروں سے اختر کو دیکھ رہا تھا۔

"ضد نہ کرو لڑکی۔ پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ آج ہم باہر بھی نہ جا سکے ہیں۔ مجھے اپنا حلق تر کر لینے دو۔"

"نہیں پتا جی۔ آپ وعدہ کر چکے ہیں۔ اب اس کا خون آپ کا ہے لیکن کچھ دیر بعد۔"

"تو بڑی ضدی ہے نرملا۔" اس کے باپ نے بالآخر ہار مان لی۔ "ٹھیک ہے تو اپنی خواہش پوری کر لے لیکن جلدی کر۔ میں جب تک ان مورکھوں کی خبر لیتا ہوں۔"

نرملا نے اختر کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر زینہ اترنے لگی۔ یہ زینہ اسی دروازے سے نیچے جاتا تھا جسے وہ نہ کھول سکے تھے۔ وہ زینہ اترتے ہوئے حویلی کے تہہ خانے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی اوپر کی طرح بہت سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ نرملا نے دروازہ مضبوطی سے بند کیا اور اختر کو لے کر ایک کمرے کی سمت بڑھی۔ وہ بھی نرملا کی پیاسی نظروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن پر خمار سا طاری تھا اور دل میں صرف ایک خواہش مچل رہی تھی۔ کسی بھی طرح نرملا کو حاصل کرے۔

"اختر۔ میرے اختر۔ بالآخر میں تم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔" نرملا نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔ نرملا، اور میں کتنا بدقسمت تھا جو آج تک تم سے دور رہا۔"

"نہیں پیارے، اب تم کبھی مجھ سے جدا نہ ہو گے، ہم اپنے محل میں ہمیشہ ساتھ رہیں گے ہمیشہ ہمیشہ۔" وہ کمرے میں بچھی ہوئی مسہری کی سمت بڑھ رہے تھے۔ کمرہ شاہانہ انداز میں سجا ہوا تھا۔ مدھم مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ایک تیز خوشبو ہر سمت فضا میں رچی ہوئی تھی۔ اختر سحر زدہ انداز میں نرملا کو گھور رہا تھا جیسے اس کی پرستش کر رہا ہو۔

نرملا کے ریشمی جسم کا لمس اسے دیوانہ بنا رہا تھا۔ اس نے وارفتگی کے عالم میں نرملا کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ نرملا کے لب بڑے حریصانہ انداز میں اس کی سمت بڑھے اور عین اسی لمحے کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی جیسے سورج نکل آیا ہو۔ نرملا چیخ کر پیچھے گری۔ اس کی پھٹی پھٹی دہشت زدہ نگاہیں خلا میں گھور رہی تھیں اور اختر نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے حیرت زدہ نظروں سے ہر سمت دیکھنا شروع کیا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور پھر اس کی نظر نرملا کے بے حس و حرکت جسم پر پڑیں اور وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

☆======☆======☆

دروازہ توڑنے میں ان کو بڑی دشواری ہوئی۔ اتنا مضبوط دروازہ تھا کہ ان کے ہاتھوں سے خون نکل آیا لیکن بالآخر دروازہ کھل گیا۔ ڈاکٹر برلاس خوشی سے اچھل پڑے۔ ان کے سامنے ایک زینہ تھا جو نیچے چلا گیا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ زینہ اترتے ہوئے آگے بڑھے اور تہہ خانے کے دروازے پر جا کر رک گئے۔ یہ دروازہ بھی مقفل تھا۔ ڈاکٹر کراہ اٹھا۔

"مسلسل دیر ہو رہی ہے، اب اسے توڑنے میں بھی دیر لگے گی۔" انہوں نے مایوس ہو کر کہا۔ اور ابھی وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا۔ تاریکی میں ان کو ایک خوفناک شکل سامنے گھورتی نظر آئی اور ڈاکٹر برلاس کے پستول سے اچانک فائر ہوا۔ فضا میں ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟" انور عقب سے چیخا۔ "شاید اختر ہو۔"

"نہیں انور، یہ اختر نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے ٹارچ کی روشنی سامنے پھینکی۔ فرش پر نرملا کے پتا جی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا مکروہ اور بھیانک تھا کہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے اور اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔

"اب یہ ہمیشہ کے لئے مر گیا۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔

"کیا مطلب؟ یہ کون ہے؟" انسپکٹر شنکر نے کہا۔ وہ اس بڈھے کے سینے کو دیکھ رہا تھا

جہاں ڈاکٹر کی گولی نے چھید کر دیا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس سے خون نہیں نکل رہا تھا۔

"ویمپائر۔ زندہ لاش۔ اور یہ بلا شبہ نرملا کا باپ راجہ مہندر پرتاب ہے۔" ڈاکٹر برلاس نے کہا۔ "انسپکٹر تم پریشان نہ ہو۔ میں نے قتل نہیں کیا ہے صرف ایک زندہ لاش کو ابدی نیند سلا دیا ہے۔"

"لیکن اختر کہاں ہے؟" انور نے پھر پوچھا۔

اور وہ سب ایک بار پھر آگے بڑھے۔ اب ان کا رخ کمروں کی طرف تھا۔ انہوں نے باری باری ہر کمرے کا دروازہ کھولنا شروع کیا اور انہیں یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ کمروں میں دن کی طرح روشنی ہو رہی تھی اور ہر کمرے میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔

☆------☆------☆

میں حیرت اور پریشانی کے عالم میں کھڑا ہوا نرملا کی لاش کو گھور رہا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر برلاس اس کے سامنے کھڑے نظر آئے۔ ہم ایک دوسرے کو سکتے کے عالم میں گھورتے رہے۔ پھر اچانک انور میری سمت لپکا۔

"اختر۔ اوہ۔ خدا کا شکر ہے کہ تم سلامت ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔ "اور میں یہاں کیسے پہنچ گیا؟ مجھ کو یاد نہیں۔"

اس لمحہ ایک فائر کا دھماکہ ہوا۔ ہم دونوں اچھل پڑے۔ میں نے نرملا کی سمت دیکھا۔ اس کے سینے میں سوراخ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر برلاس کے پستول کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔

"ڈاکٹر! یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"تمہیں اس بلا سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دی۔" ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔ "آؤ مجھے اپنا کام مکمل کرنا ہے۔"

اور پھر ڈاکٹر نے ہر کمرے میں جا کر پڑی ہوئی لاش کا سینہ چھلنی کر دیا۔ میں نے ان سب کو پہچان لیا۔ وہ نرملا کے ملازم' داسیاں اور رقاصاؤں کی لاشیں تھیں۔ ہم سب حیرت کے ساتھ ڈاکٹر کو دیکھ رہے تھے اور پھر جب ہم نے تمام کمروں کو دیکھ لیا اور کوئی مزید لاش نہ ملی تو ہم راہداری میں آ گئے۔ اسی لمحہ حیرت انگیز طور پر تمام کمرے تاریک ہو گئے۔

ہم ایک ایک کر کے نیچے اترے۔ پیٹرومیکس جل رہے تھے۔ رات کے چار بج چکے

تھے۔ مولوی پیارے میاں اب تک عبادت میں مصروف تھے۔ انسپکٹر شنکر نے اپنے آدمیوں کو چائے بنانے کا حکم دیا سب پر بری طرح تھکن طاری تھی۔

"ڈاکٹر یہ آپ نے ان لاشوں پر گولی کیوں چلائی؟" انسپکٹر نے پوچھا اور ڈاکٹر مسکرا دیئے۔

"وہ گولیاں چاندی کی تھیں اور بین فائر۔ آپ نہیں سمجھتے جناب! زندہ لاشوں کو صرف انہی سے ہلاک کیا جا سکتا ہے کیونکہ چاندی ایک متبرک دھات ہے۔" ڈاکٹر ہمیں اپنی تحقیق کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے۔

"لیکن یہ کمرے میں تیز روشنی کیسی ہو رہی تھی؟" انور نے پوچھا۔

"یہ روشنی میری دعاؤں کا نور تھا بیٹے!" ہم نے چونک کر دیکھا۔ مولوی صاحب سلام پھیر کر اٹھ رہے تھے پھر وہ کہنے لگے۔

"ان بدروحوں کی موت یہ سمجھو روشنی ہے اور اس کائنات میں جس قدر روشنی بکھری ہوئی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے کلام سے پیدا ہوتی ہے اس ذات باری کا نور تمام تاریکیوں کی موت ہے۔"

"بے شک۔" ڈاکٹر نے عقیدت سے کہا۔

کچھ لمحوں کے بعد ایک جیپ ہمارے پاس آ کر رکی۔ سب انسپکٹر گھوش اور بہت سے کانسٹیبل اتر کر ہماری طرف بڑھے۔ چندرا ان سب سے آگے تھی۔ اسے دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور میں خوشی سے چیخا۔ "چندرا۔"

وہ بھاگتی ہوئی آئی اور میرے بازوؤں میں سما گئی۔ سب کے چہرے خوشی سے کھل گئے تھے۔

"ان کو ہوش آ گیا تھا اور یہ ضد کرنے لگیں کہ ہم یہاں سے چلیں آپ سب کی زندگی خطرے میں ہے آیئے اب ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہئے۔" گھوش نے وضاحت کی۔

اور فوراً ہی وہاں سے واپسی کا پروگرام طے پا گیا۔ بہرحال یہ کہانی انور کی تھی جو غلام شیر کے علم میں آئی تھی غلام شیر جو اب صرف ایک ہوائی وجود تھا۔ ساری دنیا سے کٹا ہوا۔ وہ نہ کسی کو اپنے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا نہ اپنے آپ کو کسی کے سامنے لا سکتا تھا۔ اسے ایک دن یہ احساس ہوا تھا کہ اب وہ ایک بے کار وجود ہے۔ اپنے ماضی پر غور کرتے ہوئے اس کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے وسوسے پیدا ہو جاتے تھے۔ کیا قصور میرا ہے وہ اپنے آپ سے سوال کرتا لیکن اس سوال کا جواب اس کے پاس یہی ہوتا کہ ..

تو بے قصور ہے اس عمر میں گھر سے الگ کر دیا گیا جب کہ زندگی والدین کے زیر سایہ گزرتی ہے۔ بہت سستی قیمت وصول کی گئی اس کی اور اس کے بعد اسے اپنے آپ سے دور کر دیا گیا۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہئے تھا وہ آوارہ روح کی مانند بھٹکتا رہا۔ جانے کہاں کہاں اور پھر اسے احساس ہوا کہ زمین گول ہوتی ہے۔ کافی دن گھومتے پھرتے رہنے کے بعد وہ ایک بار پھر اسی علاقے میں آ گیا جہاں نعمت خان سنگلی کا ڈیرہ تھا۔ نعمت خان سنگلی اور اس کی ماں نے اس کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کیا تھا اور وہاں رہ کر وہ یہ بھول گیا تھا کہ اپنے ماں باپ سے دور ہے۔ نعمت خان سنگلی کے ڈیرے سے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک جگہ گہرائیوں میں اس نے کچھ دیکھا اور چونک پڑا۔ یہ پولیس کی جیپیں تھیں اور پولیس اتنی بڑی تعداد میں تھی کہ اگر یہ نعمت خان کے ڈیرے پر حملہ کر دیتے تو نعمت خان شاید ان سے نہ بچ سکتا۔ غلام شیر کے ذہن میں عجیب تجسس بیدار ہو گیا اور وہ برق رفتاری سے سفر کرتا ہوا آخر کار وہاں پہنچ گیا جہاں پولیس والوں کے افسرانِ بالا موجود تھے۔ وہ لوگ ایک میٹنگ کر رہے تھے اور اس میٹنگ میں نعمت خان سنگلی زیر بحث تھا اور موضوع تھا کہ سنگلی کے ڈیرے پر حملہ کس طرح کیا جائے۔ ایک پولیس آفیسر کہہ رہا تھا۔

"جناب عالی! اس کے جاسوس ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور ڈیرے کے بارے میں ہمیں جو تفصیلات معلوم ہوئی ہیں وہ اس طرح سے ہیں.......... کہ اگر ہم اپنی تمام تر نفری کے ساتھ بھی ان پر حملہ کرتے جاتے ہیں تو ہمیں انتہائی سنگین صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ ہمارے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔ ہم اپنے بہت زیادہ افراد کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتے۔"

"تو پھر کوئی منصوبہ ہونا چاہئے۔ میں زیادہ سے زیادہ آدھی رات تک سنگلی کے ڈیرے پر حملہ کر دینا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر اگلا قدم ہی اٹھانا پڑے گا جناب!"

"جو کچھ بھی ہے۔"

غلام شیر ہوشیار ہو گیا۔ یہ تو کسی طور مناسب نہیں ہے کہ مجھے اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ نعمت خان پر پولیس کا حملہ ہونے والا ہے میں اس بات کو خاموشی سے پی جاؤں یہ تو کسی طور مناسب نہیں۔ کچھ کرنا ہو گا یقیناً کچھ کرنا ہو گا۔ وہ تیزی سے نعمت خان سنگلی کے ڈیرے کی جانب چل پڑا لیکن یہ بھی اس کی زندگی کا نہایت انوکھا تجربہ تھا۔ اس نے

چار قدم ہی بڑھائے تھے کہ سامنے ہی ڈیرہ نظر آنے لگا۔ روح کی حیثیت سے اس کا ہلکا پھلکا وجود لمحوں میں وہاں پہنچ گیا تھا جبکہ فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ یہ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا اور وہ سوچ رہا تھا یہ تجربہ تو زندگی کے لئے بہت سے راستے کھولتا ہے۔ فی الحال کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس سے نعمت خان سنگلی کو یہ علم ہو کہ پولیس اس سے کچھ فاصلے پر موجود ہے اور اس کے ڈیرے پر حملہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ سوچتا رہا لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی، پھر اسے شیرا نظر آیا۔ جب وہ یہاں تھا تو شیرا سے اس کی اچھی دوستی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ سب کچھ بھول کر شیرا کی طرف لپکا اور اسے آوازیں دینے لگا لیکن شیرا کے کان پر جوں بھی نہ رینگی تب وہ غصے سے آگے بڑھا اور شیرا کے بالکل سامنے رک کر بولا۔

"میری آواز تمہارے کانوں میں نہیں آ رہی تم بہرے ہو گئے ہو کیا؟" لیکن شیرا بہرہ ہی نہیں اندھا بھی ہو گیا تھا کیونکہ وہ آگے بڑھا اور غلام شیر کے جسم سے گزرتا چلا گیا۔ تب ایک دم غلام شیر کو احساس ہوا کہ کیا حماقت کر رہا ہے وہ، اس کا تو اب کوئی وجود ہی نہیں۔ شیرا اس کے بدن سے اس طرح گزر گیا ہے جیسے کوئی خیال ہو۔ اس نے جھلاہٹ میں ایک پتھر اٹھایا اور شیرا پر دے مارا پتھر شیرا کی ٹانگ میں لگا تھا اور شیرا ایک دم چونک کر رک گیا تھا۔ وہ حیران نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ زمین کا ٹھوس پتھر بہرحال اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتا تھا۔ شیرا کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آیا تو وہ پھر آگے بڑھ گیا لیکن اچانک ہی غلام شیر کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ زمین سے اس نے پتھر اٹھایا تھا اور شیرا کے مارا تھا۔ پتھر بھی اس کے ہاتھوں نے اٹھا لیا تھا اور نشانہ بھی صحیح تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ چیزیں اٹھا سکتا ہے۔ فوراً ہی اس نے اپنا منصوبہ سوچ لیا۔ اسے یہاں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل تھیں۔ چنانچہ وہ ایک رائفل میگزین کے ساتھ اٹھا کر باہر آیا اور پھر ڈیرے سے کافی دور پہنچ گیا۔ ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھ کر اس نے دھڑا دھڑ فائرنگ شروع کر دی اور فضا میں گولیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ساتھ ہی اس کی نگاہیں ڈیرے کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ گولیوں کی آوازوں نے زبردست ہلچل مچا دی۔ سارے کے سارے ڈاکو مسلح ہو کر باہر نکل آئے۔ غلام شیر کافی دیر تک فائرنگ کرتا رہا۔ ڈاکوؤں نے مورچے سنبھال لئے تھے لیکن ابھی تک انہوں نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی کیونکہ ان کی نگاہوں میں کوئی ایسا وجود نہیں آیا تھا جو گولیاں چلا رہا ہو۔ کام ہو گیا تھا ڈاکو ہوشیار ہو گئے تھے۔ غلام شیر رائفل پھینک کر وہاں سے واپس پلٹا اور آن کی آن

میں ڈیرے پر پہنچ گیا۔ اس نے نعمت خان سنگی کو دیکھا جو خود بھی مسلح ہو کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیتا پھر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"فائرنگ ایک آدھ رائفل سے ہو رہی ہے۔ تم ذرا دور دور تک جاکر دیکھو کہ فائرنگ کرنے والا کون ہے اور آس پاس کا ماحول کیسا ہے؟" غلام شیر نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا کام ہوگیا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ نعمت خان سنگی ہوشیار ہو جائے۔ گھوڑے سوار چاروں طرف دوڑ گئے اور غلام شیر وہاں ایک پُرسکون جگہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ آخرکار ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کچھ گھوڑے سوار ہانپتے ہوئے آئے۔ نعمت خان سنگی اس جگہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا' جہاں غلام شیر موجود تھا۔ آنے والوں نے کہا۔

"سردار۔ پولیس کی بہت بڑی نفری پاس ہی ڈیرے جمائے ہوئے ہے اور وہ لوگ یقینی طور پر ادھر کا پتہ پاکر ادھر آنے والے ہیں۔"

"تعداد کتنی ہے ان کی۔ کیا ہم انہیں گھیر کر ختم کر سکتے ہیں؟"

"نہیں سردار! ایسا لگتا ہے جیسے اس بار وہ بڑے منظم طریقے سے حملہ کرنے والے ہیں۔ سردار ہمیں یہ جگہ چھوڑنی ہوگی۔"

"ہوں! ایسا کرو فوراً ڈیرہ خالی کر دو ہم پیچھے کے علاقے میں چلیں گے۔ پہاڑوں کے اس طرف وہاں مورچہ بندی کریں گے وہاں پولیس ہمیں نہیں گھیر سکتی اور پھر جب وہ ڈیرہ خالی پائے گی تو یہ سوچے گی کہ ہم اس کی آمد کی اطلاع پاکر بھاگ گئے ہیں۔ جلدی کرو۔" تمام ڈاکوؤں نے اپنے اپنے ہتھیار رکھے اور اس کے بعد برق رفتاری سے ڈیرے کا سامان سمیٹا جانے لگا۔ تمام ضروری سامان حاصل کر لیا گیا تھا۔ غلام شیر کو خوشی تھی کہ اس نے بہرحال اپنا فرض پورا کیا۔ نعمت خان نے اس کے ساتھ جو اچھا سلوک کیا تھا۔ آج اس نے اس کا بدلہ دے دیا ہے۔ یہ تمام باتیں سوچ کر وہ بہت زیادہ خوش تھا۔ آن کی آن میں نعمت خان نے اپنا ڈیرہ خالی کر دیا اور وہ لوگ پہاڑوں کی جانب چل پڑے۔ غلام شیر ان کے ساتھ تھا۔ اس نے بھی یہ لمبا سفر ان کے ساتھ ساتھ ہی طے کیا تھا اور پھر اس نے وہ عظیم الشان پہاڑ دیکھے تھے جن میں لاتعداد غاروں کے سوراخ نظر آرہے تھے۔ ان پہاڑوں پر اگر پوری فوج بھی حملہ آور ہو جاتی تو بلندیوں پر پہنچ کر ان غاروں میں چھپے ہوئے لوگوں پر قبضہ نہیں جما سکتی تھی۔ نہ یہاں بمباری کرکے وہ ان پر قابو پا سکتے تھے نہ گولیاں چلاکر۔ نعمت خان سنگی نے غالباً پہلے سے ہی یہاں اپنا ٹھکانہ منتخب کیا ہوا تھا۔ غلام

شیر نے اطمینان کی گہری سانس لی اور پھر ان لوگوں پر آخری نگاہ ڈالتا ہوا یہاں سے چل پڑا۔ اپنا یہ مقصد پورا کرنے کے لئے وہ یہاں تک آیا تھا۔ اس کے بعد اسے ان لوگوں سے کیا لینا تھا جو اسے نہ دیکھ سکتے تھے نہ سن سکتے تھے۔ بہرحال اس کے دل میں دکھوں کا بسیرا تھا اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کس قدر تنہائی' کس قدر ویرانی ہے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ کم بخت ہیرا اچھوت اس کا بدن ہی لے گیا۔ بہرحال وہ چلتا رہا۔ نہ کسی سمت کا تعین کیا تھا نہ کوئی خاص ٹھکانہ ذہن میں تھا۔ بس ویرانوں کے سفر سے اکتا کر ایک آبادی کی طرف چل نکلا تھا لیکن جب اس نے آبادی کو دیکھا تو اس کا دل خون کے آنسو رو پڑا۔ یہ تو اس کی اپنی بستی تھی وہ بستی جس کے کھیتوں کھلیانوں میں کھیل کر وہ جوان ہوا تھا۔ وہ بستی جہاں اس کے اپنے ماں باپ رہتے تھے۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ اپنے ماں باپ کو جاکر دیکھے اور وہ اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ اس نے دیکھا اس کے بابا نے ایک دکان کھول لی ہے۔ اس کے بہن بھائی آرام سکون کی زندگی جی رہے ہیں۔ وہ ان سب کے درمیان جا بیٹھا۔ اس کی آنکھیں ایک ایک کا جائزہ لینے لگیں لیکن اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ سب اپنے اپنے طور پر جی رہے تھے۔ وہ آنسو بہاتا رہا۔ یہ تھے اس کے محافظ۔ بیس ہزار روپے میں انہوں نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ بیس ہزار روپے کے عوض انہوں نے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ ماں باپ ایسے تو نہیں ہوتے' یوں تو نہیں کرتے وہ۔ بہت دیر تک وہ غم کے آنسو بہاتا رہا پھر بے کسی سے قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ آبادیوں اور بستیوں میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ بستی سے باہر نکل کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ اب کہاں جائے۔ تھوڑے فاصلے پر بستی کا قبرستان تھا۔ وہ اس قبرستان کی جانب چل پڑا۔ کچی پکی قبریں بکھری ہوئی تھیں۔ جن کی جیب میں چار پیسے تھے انہوں نے اپنے عزیزوں کی یادگاریں بنا رکھی تھیں۔ مُردوں کی یادگاریں بن جاتی ہیں۔ زندوں کے لئے اس کائنات میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ وہ ایک قبر پر جا بیٹھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ دفعتاً ہی اسے شی......... شی کی آواز سنائی دی اور اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ ایک پکی قبر پر ایک شخص سفید کپڑوں میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات منجمد تھے۔ غلام شیر نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ شخص اسے دیکھ کر مسکرا دیا تو غلام شیر کے چہرے پر حیرت کے شدید نقوش پیدا ہو گئے۔ اس نے تعجب بھرے انداز میں سوچا کہ کیا یہ مجھے دیکھ سکتا ہے۔ [illegible] نے پھر کہا۔

"آپ وہاں اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں ادھر آ جائیے۔ باتیں کریں گے۔" غلام شیر حیرت اور خوشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب پہنچا۔

"بیٹھیے۔" اس نے سامنے والی پکی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"دوست ایک بات بتاؤ۔ کیا تم مجھے بھی دیکھ سکتے ہو؟"

جواب میں اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "کیوں نہیں۔ بھلا آپ کو دیکھنے میں مجھے کیا دقت ہو سکتی ہے؟"

"نہیں میرا مطلب ہے۔ مم.......... میں.......... میں' مجھے تو.......... مجھے تو۔"

"روحیں ایک دوسرے کو دیکھ سکتی ہیں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

"مم.......... مطلب.......... مطلب؟"

"کوئی مطلب نہیں۔ میں صرف آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ روحیں تو ہر چیز کو دیکھ سکتی ہیں۔ یہ تو زندہ انسانوں کا معاملہ ہے کہ ان کی آنکھیں صحیح طور پر کام نہیں کر سکتیں۔"

"مم.......... میں.......... میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم.......... کیا تم بھی مر چکے ہو؟"

اس کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ہاں۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔"

"مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"نہیں۔ میں ایسے ہی۔" غلام شیر نے آگے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور بولا۔ "مگر دوست! تم کیوں اس طرح ویران سے بیٹھے ہوئے ہو۔ کیا تم بھی کسی الجھن کا شکار ہو۔ کیا تمہارے دل میں بھی افسردگی ہے؟"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "جناب! آپ کا کیا خیال ہے وہ جو کہتے ہیں نا کہ سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں۔ ہماری بھی یہی کیفیت ہے۔ نہ سنگ ہے نہ آہن پھر بھلا ہمارا دل غموں سے خالی کیوں ہو گا۔"

"بڑی دکھ بھری باتیں کی ہیں تم نے دوست! مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گے؟"

"کیا ہرج ہے۔ زندگی تو کسی طرح کٹ ہی جاتی ہے لیکن اندازہ یہ ہوا کہ موت کے

بعد بھی کسی غم گسار کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"تم۔ میرا مطلب ہے۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" غلام شیر نے کہا اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"موت ایک بھیانک تصور ہے۔ کون مرنا چاہتا ہے۔ کسی سو سالہ بوڑھے کو موت کی پیشکش کرو۔ وہ آخری کوشش کرے گا کہ زندگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ حالانکہ اس کی ساری زندگی کی خواہشات پوری ہو چکی ہوتی ہیں۔" وہ چند لحات کے لئے خاموش ہوا جیسے گزرے ہوئے واقعات کو اکٹھا کر رہا ہو۔ میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

☆======☆======☆

کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

"کیا آپ یقین کریں گے کہ جس وقت مجھے سزائے موت سنائی گئی میں نے سکون کی گہری سانس لی تھی۔ بعض اوقات انسان کی زندگی اس سٹیج تک پہنچ جاتی ہے جہاں وہ خود زندہ نہیں رہتا بلکہ ایک مقصد اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا رہتا ہے۔ وہی مقصد روح کہلاتا ہے اور جب وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو زندگی مٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ اب اگر آپ اس غلیظ مٹی سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں تو اس کا بوجھ اٹھائے پھریں۔ ورنہ جب مقصد پورا ہو گیا تو زندگی کیا معنی رکھتی ہے۔

اور میں خوش نصیب انسان ہوں۔ جو میرا مقصد تھا میں اسے پورا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ٹھاکر لجن سنگھ کے چھ جوان بیٹے' اس کی بیوی' ایک بیٹی' ایک داماد' پورے دس آدمی ملے اور میں نے ان دسوں کے دسوں کو انہی کے گھر میں بند کر کے جلا دیا تھا۔

ہاں میں نے جو کہا تھا وہ پورا کر دکھایا تھا۔ اپنے باپ کی لاش پر کھڑے ہو کر میں نے اس کے سینے سے ابلتا ہوا خون اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چہرے پر ملا تھا اور پوری بستی کے سامنے کہا تھا۔

"بستی والو! سن لو۔ تم نے دیکھا لجن سنگھ نے میرے بوڑھے باپ کو کس طرح قتل کیا ہے۔ خدا کی قسم' حکومت لجن سنگھ کو اس سلسلے میں کوئی سزا دے یا نہ دے۔ میں اس کے خاندان کو نیست و نابود کر دوں گا۔ میں لجن سنگھ کی نسل کو آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ سنو بستی والو! میں جا رہا ہوں۔ تم میں سے کسی کی جرأت ہو تو میرے باپ کو کفن پہنا دینا نہیں تو اس کی لاش کی تقدیر میں جو بھی ہو۔ میری زندگی کا اب صرف ایک مقصد ہے۔"

اور پھر برسات کی ایک رات جب تین دن بارش لگاتار برسنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے رکی تو بستی والوں نے دیکھا کہ ٹھاکر لجن سنگھ کی حویلی شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کی اور اس کے اہل خانہ کی دردناک چیخیں رات کے سناٹے میں دور دور تک گونج رہی تھیں اور جب بستی کے ہمدرد لوگ حویلی کی طرف دوڑے تو سنسناتی گولیوں نے ان کا استقبال کیا اور رات کے سناٹے میں گونجنے والی آواز میری ہی تو تھی۔

"بستی والو! میں آصف خان تم سے مخاطب ہوں۔ طارق خان کا بیٹا جس کی لاش تمہارے حوالے کر گیا تھا۔ آج میں اپنے باپ کا انتقام لے رہا ہوں۔ میرے نزدیک مت آؤ میں نہیں چاہتا کہ کسی اور کو نقصان پہنچے۔ ہاں اگر تم لجن سنگھ سے وفاداری کا اظہار کرنا ہی چاہتے ہو تو رات گزر جانے دو' ان جسموں کو خاکستر ہو جانے دو۔ صبح کو ان جلی ہوئی لاشوں کے ساتھ میں بھی تمہیں ملوں گا۔"

اور وہی ہوا جو میں نے کہا تھا۔ میں نے انتہائی پُرامن انداز میں خود کو بستی والوں کے سپرد کر دیا اور بستی والوں نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔ بات وہی ہوئی نا یعنی مقصد۔ باپ کی موت کے بعد میں نے قسم کھائی تھی اور قسم کھاتے ہوئے مجھے پورا پورا احساس تھا کہ جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ سو میں نے سوچ لیا کہ لجن سنگھ نے صرف میرے باپ کو قتل نہیں کیا بلکہ مجھے بھی مار دیا ہے کیونکہ اب میں زندہ نہ تھا صرف ایک مقصد زندہ تھا اور جب وہ پورا ہو جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ صرف مٹی کا ڈھیر۔ تو پولیس والوں نے اس مٹی کے ڈھیر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ نہ مجھے یاد ہے اور نہ ہی یاد رکھنا چاہتا ہوں۔ پولیس افسر بھی حیران تھے کہ کس سرپھرے سے پالا پڑ گیا ہے۔ بستی والوں کی بھلا کیا مجال تھی کہ میری ہمدردی کرتے۔ حکومت نے ہی میرے لئے وکیل صفائی مقرر کر دیا تھا اور وہ بے چارہ بھی مجھ سے عاجز آ گیا تھا۔ کیونکہ جو کچھ وہ مجھ سے کہتا میں اس کا اُلٹ ہی کرتا تھا۔ سو نہایت آسانی سے میں نے اپنے لئے سزائے موت کی راہ ہموار کر لی اور مجھے موت کی سزا سنا دی گئی۔

یہ چند روز عجیب و غریب احساسات کے روز تھے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے وقت کا کوئی تعین نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہے۔ آج سے چار دن بعد سوا چھ بجے مجھے سزائے موت دے دی جائے گی۔ کیسے مزے کی بات ہے۔ مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہے۔ ساری روایتیں جھوٹی ہیں۔

لیکن صاحب کیا کہا جا سکتا ہے۔ روایتوں کا قیام بہرحال کوئی معنی ضرور رکھتا ہے اور بعض اوقات انسان جو خود کو بہت زیادہ ذہین سمجھنے لگتا ہے' بری طرح چوٹ کھاتا ہے۔ سو یہی میرے ساتھ ہوا۔ غالباً میری موت میں صرف اٹھارہ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے ایک ایسی کوٹھری میں بند کیا گیا تھا جہاں سزائے موت کے قیدی رکھے جاتے تھے۔

تنگ و تاریک کوٹھری۔ موت کے انتظار کا کوئی مونس نہیں ہوتا۔ ایک قبر کی مانند اور میں خود ہی منکر تھا اور خود نکیر۔ اپنا حساب آپ لے رہا تھا۔ زندگی میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے۔ کس پر ظلم کیا اور کس کے ساتھ نیکی۔ اونہہ! نیکی اور بدی کا فیصلہ ہونے میں اب کتنی دیر باقی رہ گئی ہے۔ جس کا جو کام ہے کرے گا۔ میں کسی کے معاملات میں ٹانگ کیوں اڑاؤں۔

تو صرف اٹھارہ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب تنگ و تاریک کوٹھری میں کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دے گی۔ گویا یہ قبر ہے جو مجھے زندگی میں عطا کر دی گئی ہے لیکن رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جبکہ نیند آنکھوں میں بھر آتی ہے خواہ اس کے بعد موت ہی کیوں نہ نصیب ہو جائے۔ مجھے ہلکی سی چاپ محسوس ہوئی۔ شاید اس کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ پھر روشنی کی ایک رمق اندر آئی اور اچانک کوئی دھڑام سے میرے اوپر آ گرا۔

میں بوکھلا کر اٹھ گیا اور ٹٹول ٹٹول کر اسے دیکھنے لگا۔ اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی انسانی جسم ہے۔ اس نے بھی محسوس کر لیا اور اس کے ہاتھ میرے بدن کو میری مانند ٹٹولنے لگے۔ پھر ایک غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ "ہا۔ کون ہو بھائی اور اس کوٹھری میں کیوں ہو؟"

"پکنک پر آیا ہوں۔" میں نے مسخرے پن سے کہا اور دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ سوچنے لگا تھا کہ پھانسی کی کوٹھری میں یہ کون بے جگر ہے جو اس مزاحیہ انداز میں گفتگو کر سکتا ہے۔ پھر جب حیرت کا دور ختم ہوا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

"نوجوان ہو؟"

"اور تم شاید بوڑھے معلوم ہوتے ہو۔"

"یہی بات ہے۔"

"بڑے میاں یہ پھانسی کی کوٹھری ہے کیا یہ بات بھی تمہیں معلوم ہے۔"

"ہاں میں بھی سزائے موت پانے والا ہوں۔" بھاری آواز نے جواب دیا۔

”میرے بارے میں کیا پوچھا تھا تم نے؟“

”آواز سے جوان معلوم ہوتے ہو؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”ہاں۔ بڑے میاں میری جوانی کے اٹھارہ گھنٹے باقی ہیں۔ پورے اٹھارہ گھنٹے اور اس کے بعد بوڑھا ہو جاؤں گا۔ پھر مر جاؤں گا۔ اب بتاؤ کیا میں پیدا ہو گیا۔ کیا میں جوان ہوں؟ بوڑھا ہو چکا ہوں یا مر چکا ہوں۔ کیا تم اٹھارہ گھنٹے کی زندگی کو کوئی حیثیت دے سکتے ہو۔ ہاں کہو گے تو میں تمہیں احمق سمجھوں گا۔“

چند ساعت خاموشی طاری رہی پھر بوڑھے کی آواز ابھری۔ ”کیا موت کے خوف نے تمہارا ذہن ماؤف کر دیا ہے۔“

اور میرے ذہن میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا۔ ”کیا بکواس کرتے ہو۔ موت کیا ہے۔ خوف ایسا ہوتا ہے۔ میں لاش ہوں' لاش۔ خوف کسی زندہ انسان کے سینے میں بیدار تو ہو سکتا ہے لیکن تم لاش کا دل کہاں سے لاؤ گے۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ تمہیں موت سے پہلے ختم کر دوں گا۔ پورے دس انسانوں کو قتل کیا ہے میں نے۔“

اور بوڑھے کی ہنسی بے حد ٹھنڈی تھی۔

”میرا گریبان چھوڑو نوجوان! دلچسپ انسان معلوم ہوتے ہو۔ زندگی نے کوئی مذاق کیا ہے تمہارے ساتھ۔“

”کہانی سننا چاہتے ہو۔ میں داستان گو نہیں ہوں۔“ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

”کہانی گزری ہوئی داستان کو کہتے ہیں۔ اور جو گزر جائے وہ قابلِ ذکر نہیں ہوتا میں مستقبل کی باتیں کرنا پسند کرتا ہوں۔“

”کیوں آئے ہو یہاں؟“

”یہ لوگ مجھے موت دینے والے ہیں۔“

”آہا۔ سزائے موت کے قیدی ہو۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”ہاں۔“

”کتنے مارے تھے۔ کیوں مارے تھے؟“

”تم مجھ سے وہی بات پوچھ رہے ہو جس پر خود بوکھلا گئے تھے۔“

”اوہ بات درست ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”لیکن بڑے میاں موت کا کوئی

خوف تو نہیں ہے۔ مرنے کا رنج تو نہیں ہے۔“

اور پھر بوڑھے انسان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”موت مجھے پیش کی گئی ہے۔ میں نے اسے قبول نہیں کیا۔“

”کیا مطلب؟“

”ارے میں زندہ انسان ہوں۔ موت نہیں چاہتا اور تم سن لو مروں گا بھی نہیں۔ بھلا کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص مرنا نہ چاہتا ہو اور اسے موت دے دی جائے۔ ہم قدرت کی دی ہوئی موت کو نہیں ٹال سکتے لیکن انسانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ کسی کو مار سکیں۔“

”بجلی کی کرسی پورے بدن میں سرور دوڑا دیتی ہے اور انسان اس قدر لذت محسوس کرتا ہے کہ پھر کبھی آنکھ نہیں کھولتا۔“ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”کہنا یہ چاہتے ہو کہ ہمارے لئے سزائے موت تجویز کرنے والے ہمیں کسی طرح نہ جینے دیں گے۔“

”ہاں میرا مقصد یہی ہے۔“

”تو تم بزدل ہو۔“ بوڑھے نے حقارت سے کہا۔ ”مجھے دیکھو انہوں نے مجھے سزائے موت دے دی ہے لیکن میں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا اور میں قبول کروں گا بھی نہیں۔ اب سے کچھ دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”بہت خوب۔“ میں نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”چلو گے میرے ساتھ؟“

”نہیں۔ دیکھوں گا کہ تم کس طرح باہر جاتے ہو۔“

”زندگی کی آرزو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”اوہ۔ پھر تمہاری بزدلی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ احمق نوجوان مجھے دیکھ کہ میں بوڑھا ہوں۔ معذور ہوں لیکن میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تُو اتنی چھوٹی سی عمر میں کیوں مرنا چاہتا ہے؟“

”میری ایک منطق ہے۔ میں مقصد کو زندگی سمجھتا ہوں اور جب پورا ہو جائے تو زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے۔“

”تو تمہارا مقصد پورا ہو گیا؟“

"ہاں۔"

"لیکن نوجوان تم نے اتنی طویل زندگی کو صرف ایک مقصد کے قابل کیوں سمجھا۔ یہ تو خوش بختی ہے کہ انسان کو کچھ مقصد حاصل ہو جائے۔ تمہارے نظریئے کے مطابق اگر تم زندگی کا سب سے بڑا مقصد حاصل کر چکے ہو اور اپنی دانست میں زندگی ختم کر چکے ہو تو پھر ان بقیہ سانسوں کو کسی اور مصرف میں کیوں نہیں لگا دیتے۔ تمہیں کیا معلوم جس زندگی کو تم اس بے دردی سے ختم کرنے پر تلے ہوئے ہو، ممکن ہے وہ کسی کے کام ہی آجائے۔ نہ جیو اپنے لئے، اپنے آپ کو کسی دوسرے کے حوالے کر دو۔ ممکن ہے اس کی زندگی کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہو۔"

بوڑھے کے الفاظ نے نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے واقعی میری سوچ غلط ہو لیکن بڑے میاں بھی پاگل ہی معلوم ہو رہے تھے۔ زندگی چند گھنٹوں کی رہ گئی تھی اور وہ نکل جانے کی باتیں کر رہے تھے میں خاموشی سے ان کے بارے میں سوچتا رہا وہ بھی خاموش کچھ سوچ رہے تھے پھر بولے۔

"میرے خیال میں تم اپنے فیصلے پر نظرثانی کر رہے ہو۔"

"تم نے میرے ذہن الجھا دیا ہے۔" میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں زندگی کی راہ پر لے جانا چاہتا ہوں۔ تم نہ جانے کیوں موت کی وادیوں میں گم ہو جانا چاہتے ہو۔"

"اوہ تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ زندگی اور موت میرے لئے کیوں یکساں ہیں۔ غور کرو اس دنیا میں اربوں انسان ہیں۔ زندگی کے ایک ایک حصے پر لاکھوں جاندار ہیں۔ ان میں رشتے ناطے ہیں، محبتیں ہیں، اپنائیت ہے۔ میں نہیں کہتا کہ دنیا میں میرے جیسے نہ ہوں گے لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ انہیں میری مانند جینے کی خوشی نہ ہوگی۔ میری زندگی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں مر جاؤں گا تو کوئی آنسو نہیں بہائے گا۔ ایسے بے مقصد انسان کو کیوں جینا چاہیے؟"

"مرنا بھی نہیں چاہیے۔ تم اپنے لئے کیوں جیتے ہو۔ میں نے کہا نا۔ تمہاری زندگی اگر کسی کے کام آجائے تو یہ کتنی خوشی کی بات ہے۔"

"کیوں آجائے۔ جب کوئی مجھ سے ہمدردی نہیں رکھتا۔ ساری دنیا میرے لئے اجنبی ہے تو میں ان اجنبیوں سے محبت کیوں کروں۔ کیوں کسی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دوں۔ ان سے انتقام لینے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ خود کو فنا کر دیا جائے۔"

تب بوڑھے کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے انداز میں بڑی محبت تھی، بڑی اپنائیت تھی۔

"ٹوٹے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ بڑی توڑ پھوڑ ہوئی ہے تمہاری شخصیت میں۔ نہ جانے کون سنگدل تھا جس نے تمہیں زندگی سے اتنی دور دھکیل دیا ہے۔ بہرحال میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔ یوں سمجھو میں ایک خودغرض انسان ہوں اور اپنے لئے تمہاری زندگی چاہتا ہوں۔"

"لیکن میرے بزرگ! ہم دونوں سزائے موت کے مجرم ہیں۔ جیل کی کوٹھڑی میں ہیں اور تم اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہو۔ یہاں سے نکلو گے کس طرح؟"

"بہت آسانی سے۔ بات یہ ہے کہ میں ابھی زندگی چاہتا ہوں۔ میں نے موت نہیں قبول کی اور جو موت قبول نہیں کرتے۔ وہ موت سے جنگ کرنا بھی جانتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد میں موت سے زندگی کے لئے جنگ کروں گا۔ اگر اس جدوجہد میں مارا گیا تو سمجھ لوں گا اس جنگ میں شکست ہو گئی۔ ممکن ہے زندگی ہی کامیاب ہو جائے۔"

"اگر مجھے میری زندگی کا کوئی مصرف بتا دو تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"مصرف ہے۔ اور ایسا ہے کہ تمہیں اس سے دلچسپی ہو جائے گی لیکن یہاں سے نکلنے کے بعد بتاؤں گا۔"

"ہوں۔" میں اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ درحقیقت میں نے پہلے اس انداز میں نہیں سوچا تھا ورنہ خود کو اس طرح بستی والوں کے حوالے نہ کرتا۔ اسی وقت اپنے بچاؤ کی جدوجہد کرتا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی واقعی ایسی بے حقیقت چیز نہیں ہے۔ زندگی کے بہت سے دور ہوتے ہیں۔

"میں تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا اور بوڑھے نے مجھے ٹٹول کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"یقین کرو زندگی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اسے گزارنے کے گر سیکھ لئے جائیں۔ میں اب بھی اور کبھی بھی تم سے یہ بات نہیں پوچھوں گا کہ تم یہاں تک کس طرح پہنچے، لیکن اپنے بارے میں اتنا ضرور بتاؤں گا کہ میں جان بوجھ کر یہاں تک آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے صرف چند روپوں کے لئے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ بھرے بازار میں تاکہ مجھے یہاں تک پہنچا دیا جائے۔ مجھے ان روپوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"اوہ۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ حقیقت ہے میرے بچے۔ میں تمہیں اس کا ثبوت دوں گا۔"

"لیکن آخر کیوں؟ تم یہاں کیوں آنا چاہتے تھے؟"

"اس داستان کو ہم کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ برسات کا موسم دور ہے اور امن کا دور ہے۔ ہم کچھ وقت سکون سے گزار سکتے ہیں۔" بوڑھے کی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن بہرحال مجھے اس کی شخصیت دلچسپ محسوس ہوئی تھی اور میں اس کی باتوں میں بھی دلچسپی لے رہا تھا۔

"پھر اب کیا کیا جائے؟"

"کیا وقت ہوا ہو گا؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔"

"اوہ۔ کیا یہاں بہت تاریکی ہے؟"

"تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟" میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔

"مجھے۔" بوڑھا چند ساعت کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "یا تو یہاں گہری تاریکی ہے یا پھر تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"میں اندھا ہوں۔" بوڑھے نے جواب دیا اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ اب تک کی گفتگو سے کہیں یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ بوڑھا اندھا بھی ہے۔ میری خاموشی سے ہی بوڑھے نے اندازہ لگا لیا کہ میں ابھی تک اس بات سے لاعلم تھا۔ چنانچہ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس وقت گہری تاریکی ہے اور تم میری صورت نہیں دیکھ پائے۔"

"ہاں۔ یہ حقیقت ہے لیکن میرے محترم دوست! کیا تمہاری ساری باتیں ناقابل فہم نہیں ہیں۔ تم اندھے بھی ہو۔ تم نے ایک قتل بھی کیا ہے اور تم یہاں سے نکل جانے کی باتیں بھی کرتے ہو۔"

"بلاشبہ تمہیں میری یہ باتیں حیرت انگیز محسوس ہو رہی ہوں گی لیکن میرے پیارے بیٹے! کچھ عرصے کے لئے اپنے تجسس کی آنکھ کو بند کر لو اور صرف میری ہدایات پر

عمل کرو۔ میرا خیال ہے بہت مختصر وقت میں تمہیں میرے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔" بوڑھے کے لہجے میں عاجزی تھی اور میں کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ اب تک صرف میں نے جذباتی انداز میں سوچا تھا۔ میں یہی سوچتا رہا تھا کہ مقصد کے حصول کے بعد زندگی ضروری نہیں ہوتی لیکن بوڑھے سے گفتگو کرنے کے بعد نہ جانے کہاں سے میرے ذہن میں بھی زندگی کی روشنی کی ایک کرن آئی تھی اور میں زندہ رہنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ تب بوڑھے کی آواز ابھری۔

"کیا تم تیار ہو؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "میں تیار ہوں۔"

"بہت خوب۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہیں زندگی کی اہمیت سے آشنا کر دیا۔ بہت عمدہ۔ تو میرے بچے! ہم اب سے چند منٹ کے بعد کام شروع کر دیں گے۔ ہاں تمہیں اس جیل میں کتنا عرصہ گزر گیا؟"

"تقریباً ڈیڑھ سال۔" میں نے جواب دیا۔

"یقیناً۔ تم اس کی پوری پوزیشن سے واقف ہو گے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس وقت تم کہاں موجود ہو یہ جگہ جیل کی آخری دیوار سے کتنی دور ہے میں چاہتا ہوں کہ تم صرف ایک بار مجھے اس کا نقشہ سمجھا دو۔" بوڑھے نے کہا اور میں اپنی یادداشت کے سہارے اسے صورتِ حال سمجھانے لگا۔ بوڑھا بہت غور سے سن رہا تھا۔ پھر اس نے غالباً گردن ہلائی۔

"ٹھیک ہے۔ اس طرح تو ہم معمولی چالاکی سے جیل کی دیوار عبور کر سکتے ہیں بیٹے۔"

"لیکن اس آہنی کوٹھڑی سے کیسے نکلو گے؟"

"سنتری یہاں سے خاصی دور ہے اور تم بتا چکے ہو کہ کوٹھڑی کے پیچھے ایک ناکارہ گلی موجود ہے جو کوڑا کرکٹ پھینکنے کے کام آ سکتی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر ممکن ہے ہم سنتری کو قتل کئے بغیر ہی دیوار تک پہنچ جائیں اور پھر باہر نکلنے کے لئے ہم گٹر لائن استعمال کریں گے۔ وہی گٹر لائن جو دیوار کے قریب سے شروع ہوتی ہے۔"

"لیکن چچا جان! اول تو اس کوٹھڑی کی موٹی سلاخیں' اور پھر جس گٹر لائن سے آپ

فرار کا پروگرام بنا رہے ہیں اس کے اوپر بھی آہنی جنگلا زمین کی خاصی گہرائی میں نصب ہے۔ وہاں سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے اس طرف محافظ خاص نگرانی بھی نہیں رکھتے۔"

"واہ۔" بوڑھا خوش ہو کر بولا۔ "اور تم کہتے ہو کہ فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چلو آؤ۔" بوڑھا اٹھ گیا اور پھر وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور دوسرے لمحے کوٹھڑی کے آہنی جنگلے کے قریب پہنچ گیا۔ میں متحیرانہ انداز میں اس کے سائے کو دیکھتا رہا اور پھر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے جنگلے تک پہنچ گیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ کچھ ہو رہا تھا۔ تاریکی کی کسی حد تک عادی آنکھوں نے اس کے چوڑے سائے کو محسوس کیا تھا اور پھر کچھ اور بھی محسوس ہوا۔ اس کے بعد بوڑھے کی طویل سانس ابھری۔

"آؤ۔" اس نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ باہر نکل گیا ہے۔ میں متحیرانہ انداز میں جنگلے کو ٹٹولنے لگا اور پھر مجھے سلاخوں کے درمیان کافی بڑا خلاء نظر آیا۔ اتنا چوڑا کہ میں باآسانی اس سے نکل گیا۔ اب نہ جانے کیوں مجھے بوڑھے کی شخصیت پر کسی حد تک اعتبار آ گیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ شاید ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" بوڑھے نے کہا اور میری ڈھال بنا رہا۔ ایک بار پھر میرا ذہن ڈانواں ڈول ہونے لگا تھا۔ بوڑھا جس انداز میں چل رہا تھا' اس سے قطعی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اندھا ہے۔ محافظ اس کوٹھڑی سے کافی دور تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ رات کی خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھی اور پھر وہ اس گٹر کے قریب رک گیا جس کے بارے میں' میں نے اسے بتایا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے مجھے سرگوشی میں پکارا۔

"سنو۔ کیا یہ وہی جگہ ہے؟"

"ہاں۔" میں نے بے ساختہ کہا اور پھر خود ہی اپنی حماقت پر مسکرا دیا۔ بوڑھا مجھے بے وقوف بنا رہا تھا لیکن وہ خاموشی سے زمین پر ہاتھ پھیرنے لگا اور پھر اس نے گٹر کی سلاخیں پکڑ لیں۔

"تھوڑے پیچھے ہٹ جاؤ۔" اس نے کہا اور میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ تب میں نے مٹی کا ایک تودہ زمین سے ہٹتے دیکھا۔ خوفناک بوڑھے نے گٹر کا ڈھکن اٹھا لیا تھا جو اپنے ساتھ قرب و جوار کی مٹی اکھاڑ لایا تھا اور زمین میں ایک چوڑا سا سوراخ بن گیا۔ جس کے نیچے پانی بہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

بوڑھے نے آواز پر کان لگایا پھر آہستہ سے بولا۔ "گہرائی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ہم باآسانی نیچے کود سکتے ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ گٹر کافی کشادہ ہے۔ آؤ میری تقلید کرو۔" اس نے کہا اور دوسرے لمحے غڑاپ سے اندر کود گیا۔ اب میں بھی اتنا بزدل نہیں تھا کہ سوچنے میں وقت گنواتا۔ یوں بھی مجھے زندگی سے کوئی ایسی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ہر وہ کام کر سکتا تھا جو دوسرے نہ کر سکیں۔

چھپاک سے میں غلیظ پانی میں جا پڑا جس میں شدید تعفن تھا لیکن پانی ٹخنوں سے تھوڑا سا اونچا تھا اور اس کا بہاؤ بہت آہستہ تھا۔

بوڑھا بھی میرے نزدیک ہی کھڑا تھا پھر اس نے کہا۔ "ہمیں بہاؤ کی مخالف سمت چلنا چاہئے ظاہر ہے پانی نشیب کی طرف بہتا ہے اور یہ نشیب کسی گہرے نالے یا ندی پر ختم ہوتا ہوگا۔ اس لئے اس طرف جانا خطرناک ہے۔"

"یقیناً۔" میں نے تائید کی۔

"آؤ۔" بوڑھے نے کہا اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ پھر تھوڑی دور چلنے کے بعد بوڑھا بولا۔ "میرا خیال ہے تم آگے آ جاؤ۔ کیونکہ تم آنکھیں رکھتے ہو۔ کسی بھی خطرے سے آگاہ کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے یہاں بھی گہری تاریکی ہوگی۔"

"ہاں۔ یہاں بھی گہری تاریکی ہے۔" میں نے کہا۔

حالانکہ خود مجھے اپنی آواز عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے لہجے میں خود شکوک و شبہات تھے۔ میں اس کو اندھا کیونکر تسلیم کر لیتا۔ کس بناء پر کرتا۔ اس کی ساری حرکتیں آنکھوں والوں کی سی تھیں وہ اندھا کیسے ہو سکتا تھا۔

کشادہ گٹر میں جس قدر تعفن پھیلا ہوا تھا اس کے پیش نگاہ بڑی مشکلات سے گزرنا پڑ رہا تھا لیکن بہرحال ایک منزل تک تو پہنچنا ہی تھا۔ موت کے قریب جاتے جاتے جس طرح زندگی کے قریب لوٹ آیا تھا۔ وہ بس انہونی ہی تھی۔ زندگی نے مجھے ایک اور موقع دیا تھا تو اب میں اس سے گریزاں نہ رہا۔ یوں ہم چلتے رہے چلتے رہے۔ پھر ایک جگہ چھت میں روشنی نظر آئی تو میں نے بوڑھے کو اس سے آگاہ کیا۔

"اوہ میرا خیال ہے ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔ اب اوپر نکل جانا مناسب ہوگا۔" بوڑھے نے کہا۔

چھت کافی اونچی تھی لیکن گٹر میں اترنے کے لئے سیڑھیاں تھیں چنانچہ میں نے پہلے بوڑھے کو ہی ان سیڑھیوں تک پہنچایا کیونکہ ابھی تو صورت حال کا اندازہ کرنا تھا وہ

خود کو اندھا کہہ رہا تھا اس لئے اس کا احساس تو رکھنا ہی تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد بوڑھے نے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر وہ انتہائی اطمینان سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ کر مین ہول سے باہر نکل گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں اوپر تھے۔ پتلی سی ایک گلی تھی جس کے دونوں طرف مکانات بنے ہوئے تھے۔ زیادہ روشنی نہیں تھی بس دور دور پولز پر اسٹریٹ بلب لگے ہوئے تھے یا کہیں کہیں لیمپ پوسٹ لگے ہوئے تھے جن کی روشنی تھوڑے سے حصے کو منور کر رہی تھی۔ کافی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات چونکہ زیادہ گزر چکی تھی۔ اس لئے جاگتے ہوئے لوگ نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید گلیوں کے کتے بھی سو گئے تھے۔

"کیا کیفیت ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔" میں نے جواب دیا۔

"یوں لگتا ہے جیسے رات کا آخری پہر ہو۔ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ خاموشی چھائی ہو۔"

"ہوں۔" میں نے گردن ہلائی۔

"کیا تمہارے بدن پہ بھی قیدیوں جیسا لباس ہے؟"

"ظاہر ہے۔" میں ہنس پڑا۔

"ہاں واقعی یہ کچھ بے تکا سوال تھا لیکن مسئلہ یہ ہے دوست کہ سب سے پہلے ہمیں اس لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔"

"لیکن کس طرح؟"

"چوری۔" اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں چوری۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔"

"لیکن یہ ترکیب بے حد خطرناک ہوگی محترم بزرگ۔"

"خطرناک۔ بھئی تم نے اس لفظ کو اہمیت دے رکھی ہے ورنہ تو خطرات زندگی کے کس لمحے نہیں ہوتے۔ کون سا وقت ایسا ہوتا ہے جب ہم خطرات سے دور ہوتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے نوجوان دوست کہ ہمارا آنے والا وقت کتنے خطرناک لمحات سے بھرپور ہوگا۔ مجھے بتاؤ کیا سڑک پر چلتے وقت تمہیں یہ احساس نہیں ہو سکتا کہ کسی کار کا ٹائی راڈ ٹوٹے گا اور وہ تمہارے اوپر آچڑھے گی۔ کیسے بچ سکتے ہو میرے بچے۔ خطرات تو ہر جگہ

موجود ہیں۔ میرے دوست! انہیں نظر انداز کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"شاید تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

بوڑھا دلچسپ انسان معلوم ہوتا تھا اور بہرحال اس کی باتیں حقیقت سے دور نہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ مجھے پسند آتا جارہا تھا۔ "لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم کسی مکان میں داخل ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ یہی بہتر ہے۔"

"تب ٹھیک ہے۔ کسی بھی مکان کا انتخاب کر لیا جائے۔"

"لیکن اس سلسلے میں میں ناکارہ ثابت ہوں گا سوائے اس کے کہ باہر کھڑا قدموں کی چاپ سنتا رہوں۔ میرے دوست تم کوشش کرو۔ یہاں صرف تم کام کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ تم اس جگہ کھڑے ہو جاؤ اور ہاں اگر کوئی خاص خطرہ محسوس کرو تو سیٹی بجا دینا۔" میں نے کہا اور بوڑھے نے گردن ہلا دی۔

عجیب و غریب حالات تھے۔ خطرناک بھی اور نہیں بھی۔ اب سے کچھ گھنٹے پہلے میرے ذہن میں تصور بھی نہ تھا کہ میں زندگی کے لئے کوئی جدوجہد کروں گا لیکن اب......... اب میں مکمل طور سے زندہ رہنے کا خواہش مند تھا۔

مکان میں داخل ہونے کے بعد اور اپنی مرضی کے لباس چرانے میں جو حالات پیش آئے ان میں ایسا کوئی دلچسپ واقعہ نہیں تھا جو خاص طور پر قابل ذکر ہو۔ بس ہوا یوں کہ کچھ کرنسی اور چند لباس جو میری دانست میں ہم دونوں کے بدن پر آسکتے تھے، حاصل کر لئے گئے اور میں باہر نکل آیا۔

شاید قسمت ہی یاور تھی کہ ان حالات میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا نہ کوئی ناخوشگوار بات ہوئی۔ بوڑھے کے نزدیک پہنچا تو اس نے بڑے تپاک سے میری طرف اپنے ہاتھ بڑھائے۔

"کیا کامیاب آئے ہو میرے بچے؟" اس نے پوچھا۔

اور ایک بار پھر میں حیران رہ گیا۔ اس کا انداز ایسا نہیں تھا جس سے وہ اندھا معلوم ہوتا۔ تاہم میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔ کام بن گیا۔"

"بہت خوب۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ہم ایک دیوار کی سمت بڑھ گئے۔ سب سے پہلے میں نے اور پھر بوڑھے نے اپنا لباس تبدیل کر لیا۔ جیل کے کپڑے

ہم نے وہیں ایک طرف گٹھڑی بنا کر ڈال دیئے تھے۔ یہ لباس جو میں نے پہنا تھا وہ تو میرے بدن پر فٹ تھا لیکن بوڑھے کی جسامت اچھی خاصی تھی۔ اس بنا پر لباس اسے ذرا تنگ تھا۔ تاہم کام چل سکتا تھا میں نے کرنسی احتیاط سے جیب میں رکھی اور ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

"اب کیا خیال ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"یہ تو تمہی بتا سکو گے۔ میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس وقت ہم ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ میں نے بوڑھے کے چہرے پر نگاہیں دوڑائیں پہلی بار میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا اور ایک بار پھر مجھے ذہنی جھٹکا لگا۔ میرے خیال کے مطابق بوڑھا اندھا ہونے کا فریب کر رہا ہے۔ ورنہ اس میں کوئی بات بھی اندھوں جیسی نہ تھی لیکن اب میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں تو احساس ہوا کہ روشنی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں دو گڑھے تھے جن میں کچھ نہ تھا۔ یقیناً وہ اندھا تھا۔

لیکن ایک اندھا اس قدر تیز حسیات کا مالک۔ یہ بات بہت متحیر کن تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے نوجوان؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"آصف خان۔" میں نے جواب دیا اور بوڑھا گردن ہلانے لگا۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی اس بوڑھے کا نام پوچھوں۔

"اور تمہارا؟"

"میرا نام۔" بوڑھا چند لمحات کے لئے رکا اور پھر بولا۔ "سوما۔"

"سوما؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں سوما۔"

"تمہاری قومیت کیا ہے؟" میں نے اس نام پر حیران ہو کر پوچھا۔

"قومیت کچھ بھی سمجھ لو۔ کچھ بھی کہہ لو۔ یہ سب کچھ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بس ہم دوست ہیں' یہی کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اب ہم کہاں چلیں؟" چند منٹ کے بعد میں نے پوچھا۔

"آصف!" بوڑھے نے مجھے پکارا۔

"ہاں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ' اگر تمہیں زندگی مل جاتی تو تم کہاں صرف کرتے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"یہ بات مجھ سے بار بار کیوں پوچھتے ہو؟ میں بتا چکا ہوں کہ پوری دنیا میں میرے باپ کے سوا میرا کوئی نہ تھا اور وہ مر چکا ہے۔ اس کی موت کے بعد میں نے بھی مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور تم نے دیکھا میں موت کے کتنا نزدیک تھا۔ اب تم مجھے زندگی کے قریب لے آئے ہو تو مجھ سے ایسی باتیں مت کرو' میرا کوئی نہیں ہے میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔"

"اوہ میرے بچے آصف! میں تمہارے زخموں کو نہیں کریدنا چاہتا تھا۔ میں تو صرف تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمہارے دل میں کوئی خاص خواہش تو نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"گڑھی مہابت خان۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"ہاں۔ میں اسی طرف کا رہنے والا ہوں۔"

"اوہ ٹھیک ہے۔ ظاہر ہے جب میرا اس دنیا میں ٹھکانہ ہی نہیں تو پھر کہیں بھی چلو۔"

"تب پھر میرے دوست ہمیں اسی وقت اسٹیشن چلنا چاہئے۔"

"چلو۔" میں نے لاپرواہی سے کہا اور ہم دونوں اسٹیشن کی جانب چل پڑے۔ لباس تو بدلے ہوئے تھے ہی' اس لئے کسی نے خصوصی طور پر ہماری طرف توجہ نہیں دی اور ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل پر ہم نے گڑھی مہابت خان کے لئے ٹرین کا ٹائم دیکھا۔ اتفاق ہی کی بات تھی کہ اب سے پون گھنٹے کے بعد ایک ٹرین گڑھی مہابت خان سے گزرنی تھی۔ ہم نے فوراً ٹکٹ خرید لئے اور پلیٹ فارم پر ٹہل ٹہل کر وقت گزارنے لگے۔ رات کا چونکہ آخری پہر تھا' اس لئے پلیٹ فارم پر مسافر اکا دکا ہی تھے۔ چند دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ایک چائے خانے پر پہنچ گئے۔ چائے طلب کی اور دونوں چائے پینے لگے۔ بوڑھا سوما خاموش تھا۔ ویسے اس کے نام پر میں جب بھی غور کرتا' مجھے عجیب سا لگتا۔ نہ جانے یہ کیسا نام تھا' کون سے علاقے کا تھا۔ ویسے تو یہ بوڑھا ہی پراسرار تھا' اس کی کون کون سی بات پر غور کرتا۔ بہرحال مجھ جیسے انسان کو ان ساری باتوں کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

☆--------☆--------☆

پون گھنٹہ گذر گیا اور ہماری مطلوبہ ٹرین آ گئی۔ کافی مسافر نیچے اترے، ہم دونوں کو بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ بوڑھا سوما ٹرین میں بھی آنکھوں والوں کی طرح ہی چڑھا تھا۔ اس کے انداز میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔ البتہ سیٹ پر بیٹھنے میں اس نے میری مدد طلب کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین روانہ ہو گئی۔ سوما بالکل خاموش تھا اور جب یہ خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے ہی اسے مخاطب کیا۔

"کیا بات ہے، تم ضرورت سے زیادہ خاموش ہو؟"

"کچھ سوچ رہا تھا، تم ہی گفتگو شروع کرو۔" سوما نے جواب دیا۔

"کیا گفتگو کروں، تم بتاؤ کیا سوچ رہے تھے؟"

"اوہ۔ میری بات مت کرو، میرا ذہن تو خیالات کا دفینہ ہے، بس نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔"

"دراصل ہم لوگوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا ہے یعنی ایک دوسرے کا ماضی نہیں کریدیں گے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ تمہاری پچھلی زندگی بے شمار واقعات سے پُر ہوگی اور یقیناً وہ واقعات میرے لئے بہت دلچسپ ہوتے۔ خیر، ہم دوسری گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔"

"یہی مناسب ہے میرے دوست، ماضی کریدنے سے کچھ نہیں ملتا۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن اب تم گڑھی مہابت خان پہنچ کر کیا کرو گے؟"

"تمہیں اپنی قدیم رہائش گاہ دکھاؤں گا۔ بڑی انوکھی جگہ ہے تم اسے دیکھ کر یقیناً حیران ہو گے۔"

"کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"بس دیکھو گے تو اندازہ ہو گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اس کی بات اس وقت تک گئی۔ تمہارے عزیز و اقارب تو ہوں گے؟"

"تم خوش ہو جاؤ بیٹے کہ اتفاق سے اس دنیا میں میرا بھی کوئی نہیں ہے۔"

"اس میں خوشی کی کیا بات ہے؟"

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔" بوڑھے نے روا روی میں کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کیا تم پیدائشی اندھے ہو؟"

"نہیں۔" بوڑھے کی آواز میں اچانک سختی سی آ گئی۔ "میں پیدائشی اندھا نہیں ہوں لیکن آنکھیں کھوئے مجھے دو سال سے زیادہ نہیں گزرے، میرے دشمن نے میری دونوں آنکھیں نکالی ہیں۔"

"ارے۔" میں چونک پڑا۔ "کون تھا وہ دشمن؟"

"تھا نہیں، تھی......... بلکہ ہے۔"

"اوہو کوئی عورت تھی؟"

"ہاں......... عورت نہیں ناگن، ایک خوفناک ناگن۔" بوڑھا نفرت زدہ آواز میں بولا۔

"کیا دشمنی تھی اس سے؟"

"ابھی نہیں بتاؤں گا دوست، اس کے لئے کچھ انتظار کرو۔"

"اچھا تمہاری مرضی، لیکن ایک بات پہ مجھے حیرت ہے وہ یہ کہ تم کسی طور پر اندھے نہیں معلوم ہوتے۔ تمہاری حرکات آنکھوں والوں کی ہیں۔ جیل کی تاریک چاردیواری میں تم نے جس انداز میں راستہ تلاش کیا تھا وہ میرے لئے بڑی حیرت انگیز بات تھی۔"

"ہاں......... انسان جب کسی حس سے محروم ہو جاتا ہے تو اس حس کی کمی دوسری چند خصوصیات پوری کر دیتی ہیں۔ میرا ذہن میری آنکھیں ہیں، تم نے جیل کے راستوں کا جو نقشہ کھینچا تھا میرے ذہن کی آنکھ نے اسے پہچانا اور میری رہنمائی کی، اس طرح میں اس کے مطابق چلتا رہا۔ میرے کان ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ میں ہوا کی سرسراہٹ سے بہت سی باتوں کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ میں قدموں کی چاپ سے انسان کی پوری شخصیت پہچان لیتا ہوں۔ اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں مجھ میں جو تم پر آہستہ آہستہ کھل جائیں گی۔ انتظار کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا اور پھر راستے بھر میں بوڑھے سوما کی پُراسرار شخصیت کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے ذہن کی چولیں ہل گئی تھیں۔ بالآخر وہ پہاڑی اسٹیشن جس کا نام گڑھی مہابت خان تھا، آ گیا۔ میں نے تو اس وقت تک اسٹیشن کا بورڈ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن بوڑھا سوما اس وقت اونگھ رہا تھا اور اچانک وہ اونگھتے اونگھتے چونک پڑا۔ اس نے چہرہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھا اور پھر مجھے ٹٹولنے لگا۔

"کیا تم سو رہے ہو آصف؟ اگر سو رہے ہو تو جاگو ہماری منزل آگئی ہے۔"

"میں جاگ رہا ہوں سوما لیکن تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ آنے والا اسٹیشن گڑھی مہابت خان ہے؟" اور میری اس بات پر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ نہ پوچھو' یہ سب کچھ نہ پوچھو۔ اپنی زمین کی خوشبو روئیں روئیں میں بسی ہوتی ہے بشرطیکہ تمہارے دل میں وطن کی سچی محبت ہو۔ یہ ہوائیں مجھے میری سرزمین کی آمد کا پیغام دے رہی ہیں۔" اس نے جواب دیا اور درحقیقت آنے والا اسٹیشن گڑھی مہابت خان ہی تھا۔

ہم دونوں ٹرین سے نیچے اتر گئے' بوڑھا اس انداز میں آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے سارے رستے اس کے جانے پہچانے ہوں' میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ اچھی خاصی پکی آبادی تھی۔ جھٹپٹا وقت تھا۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ زندگی کی گہما گہمی ماند نہیں پڑی تھی' لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

بوڑھا سوما چلتے چلتے چند ساعت کے لئے رک جاتا اور پھر چلنے لگتا۔ ایک جگہ رک کر اس نے کہا۔

"اپنے بائیں سمت دیکھو آصف! کیا تمہیں سرخ رنگ کا ایک مینار نظر آرہا ہے؟"

"ہاں۔ مینار موجود ہے۔" میں نے بائیں سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"اندازاً کتنے فاصلے پر ہوگا؟"

"تقریباً سو گز پر ہے۔"

"ہوں۔" بوڑھے نے گردن ہلائی اور پھر تقریباً پچیس تیس قدم چلنے کے بعد وہ دائیں سمت مڑ گیا۔ اس طرف ایک پتلی سی گلی تھی جو کافی طویل معلوم ہوتی تھی۔ اس گلی کے آخری سرے پر بستی کا آخری مکان تھا۔ اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا اور ہم کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر ہو لئے۔ بوڑھا سوما خاموشی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ اب کھیتوں پر تاریکی کی دبیز چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے میں تنگ آگیا تھا۔ تب میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"تم نے کہا تھا یہی بستی تمہاری بستی ہے؟"

"ایں۔" بوڑھا چونک پڑا۔ "کیا کہا تم نے؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ تم تو دیکھ نہیں سکتے' اپنے ذہن کی آنکھوں سے دیکھو کہ سورج

چھپ چکا ہے اور تاریکی پھیلتی جا رہی ہے اور ہم طویل و عریض کھیتوں کے درمیان چلے جا رہے ہیں۔ بستی کا آخری مکان بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"اوہ بس تھوڑی دور اور۔ ان کھیتوں کے اختتام پر جنگلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے بس وہیں ہماری قیام گاہ ہوگی۔"

"جنگلوں میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں کسی قدر تنہائی پسند بھی ہوں اور پھر ایک طویل عرصے تک میں اپنی قیام گاہ سے دور رہا ہوں۔ بہرحال اب ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑے گا۔"

کھیتوں کے اختتام پر پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ جنگلات کا سلسلہ گہری تاریکی میں لپٹ گیا تھا۔ مجھے تو تھوڑے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن ساعت کی بینائی سے مرصع سوما اس وقت حیرت انگیز ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اچھی خاصی رفتار سے چل رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور سچ مچ میں اس عمارت کو نہیں دیکھ سکا جس کے دروازے پر اس نے مجھے لا کھڑا کیا تھا۔ پتہ تو اس وقت چلا جب دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے کسی پرانی عمارت کا طویل عرصہ سے بند دروازہ کھلا ہو۔ چوں چر کی آواز بند ہو گئی اور پھر بوڑھے سوما کی آواز سنائی دی۔

"کیا تم خوف زدہ ہو؟"

بوڑھے کی بات مجھے پسند نہیں آئی تھی' اس لئے میں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ اس نے چونک کر میرے ہاتھ کو ٹٹولا اور پھر اسے پکڑ کر بولا۔

"غیر معمولی طور پر خاموش ہو' کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔ تم بار بار احمقانہ گفتگو کرنے لگتے ہو۔ بھلا میں دنیا میں کس چیز سے خوفزدہ ہو سکتا ہوں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اوہ۔ مجھے افسوس ہے۔ واقعی میں نے غلط جملے استعمال کئے ہیں۔ مگر تمہاری خاموشی کیا معنی رکھتی ہے؟"

"بس میں حیران ہوں' میں اس عمارت کو بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔" میں نے جواب دیا اور سوما نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"کافی تاریکی ہے شاید۔"

"ہاں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میرا ہاتھ پکڑ کے چلتے رہو۔ آؤ۔" اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیسی عمارت ہے۔ مجھے تو اس کے در و دیوار تک نہیں نظر آرہے تھے لیکن اندھا سوما بہ آسانی موڑ مڑ رہا تھا۔ ویسے کافی وسیع عمارت معلوم ہوتی تھی' کیونکہ اندر داخل ہونے کے بعد کافی دیر تک چلنا پڑا۔

پھر بوڑھا رکا اور اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں ایک گہری سانس لے کر اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا تھا لیکن اندر تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کمرے میں سیلن کی بو بالکل نہیں محسوس ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کشادہ اور ہوادار ہے اور کسی طرف سے اس میں ہوا آتی ہے۔

"ٹھہرو میں تمہارے لئے روشنی کر دوں۔ میں نے لفظ تمہارے لئے ٹھیک استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے میرے لئے روشنی اور تاریکی یکساں ہیں' ہے نا؟" اس نے کہا۔ میں نے اس وقت بھی خاموشی مناسب سمجھی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں ایک شمع دان روشن ہو گیا۔ پہلے ایک شمع جلی تھی اس کے بعد متعدد......... خاصی روشنی ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا' میں کمرے کی آرائش دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف انتہائی نفیس پرانے طرز کا فرنیچر موجود تھا۔ فرش پر سرخ رنگ کا ایک دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف حسین مسہری بھی تھی۔ غرض ہر لحاظ سے اسے ایک قیمتی کمرہ کہا جا سکتا تھا جس سے بوڑھے کے ذوق کا پتہ چلتا تھا۔

"یہ عمارت تمہاری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں......... آبائی' پشتوں کی۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن کیا یہاں تمہارے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے؟"

"ہے!" اس نے کہا۔

"کون ہے؟"

"میرے دو ملازم۔"

"اوہ۔ مگر عمارت تو ویرانے میں ہے' یہاں وہ لوگ کس طرح رہتے ہوں گے؟"

"وہ بھی میری طرح سکون پسند ہیں۔ اس لئے انہیں یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" سوما نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

"یہ سکون کی جگہ ہے' مجھے خوشی ہے کہ ہم نہایت کامیابی سے یہاں تک آ پہنچے۔ اب یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اول تو پولیس جیل سے مفرور قیدیوں کی تلاش کرتی یہاں تک پہنچ نہیں سکتی اور اگر پہنچ بھی گئی تو اسے اس ویران عمارت میں کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں داخل ہونے والے باہر کے لوگ یہاں کچھ نہیں تلاش کر سکتے۔"

"ہاں یہ جگہ مجھے ایسی ہی لگتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم بھوکے ہو گے' میں تمہارے لئے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ تم بے جگر انسان ہو اور خوف زدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہو' یہاں تمہیں جو کچھ نظر آئے' اس سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہاں سب ہمارا اپنا ہے۔"

"ٹھیک ہے بڑے میاں! آپ میرے لئے پریشان نہ ہوں۔" میں نے جواب دیا اور پُراسرار بوڑھا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ درحقیقت میں یہاں خوف زدہ نہیں تھا اور میری اس کیفیت کا جواز یہ ہے کہ میں نے طویل عرصہ موت کے تصور میں گزارا تھا۔ خوف کی بنیادی وجہ "تکلیف' آزار یا موت ہوتی ہے' یعنی موت اس سلسلے میں آخری اسٹیج ہوتا ہے اور میں اس اسٹیج میں تھا۔ ایک جذباتی مقصد کے تحت میں نے موت اپنالی تھی اور مجھے زندگی سے دلچسپی ہوتی تو اول تو میں اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کے لئے اتنا بھیانک کھیل ہی نہیں کھیلتا یا پھر انتقام لینے کے بعد وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا' لیکن میں نے خوشی سے خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ گویا مجھے اب زندگی کی ضرورت نہیں تھی اور اب میں سپر مین بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جب مجھے سزائے موت سنائی گئی تو میں نے موت کے بارے میں سوچا ضرور تھا لیکن وہی عزم و استقلال برقرار رہا تھا۔ یعنی میں نے اپنی زندگی کی حدیں اپنے مقصد سے منسلک کر دی تھیں۔ اس لئے موت سے ڈر نہیں لگا تھا۔

نہ جانے اس بوڑھے کی باتوں نے کیوں اس قدر جلد مجھے متاثر کر لیا تھا اور اب زندگی کی طرف آ کر بھی میں پشیمان نہیں تھا بلکہ اب تو مجھے زندگی سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی' لیکن میں عام انسانوں سے زیادہ بے جگر تھا۔ میں اس ماحول سے قطعی خوف زدہ نہیں تھا۔ ہاں اس کے بارے میں سوچ ضرور رہا تھا اور سوچ کی وجہ قدرتی تھی۔

بوڑھا بے حد پُراسرار تھا۔ وہ آنکھوں سے اندھا تھا۔ اگر اس کی آنکھیں موجود

ہوتیں اور صرف بینائی کھو جانے کی بات کرتا تو شاید ذہن تسلیم نہ کرتا۔ میں سوچتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن آنکھوں کی جگہ دو غار اس کی سچائی کا ثبوت تھے اور پھر اس کی بے پناہ صلاحیت جو شاید آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں تھی' حیرت انگیز بات تھی۔ پھر اس عمارت کا ماحول' لیکن وہ مجھے یہاں لایا کیوں ہے' اور اب عمارت میں آ کر میں کیا کروں گا۔

نہ جانے ان سوچوں میں کس قدر وقت بیت گیا۔ پھر دروازے پر ہلکی سی آہٹ سن کر ہی میں چونکا تھا۔ دروازہ کھل رہا تھا اور پھر بوڑھے کے بجائے ایک اور شخص اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی جو اس نے انتہائی تہذیب سے ایک میز پر رکھ دی اور پھر پانی کا جگ درست کرنے لگا۔

لیکن جب وہ پانی وغیرہ رکھ کر سیدھا ہوا تو میں بری طرح چونک پڑا۔ آہ اس کی بھی دونوں آنکھیں غائب تھیں اور ان کی جگہ دو گہرے غار تھے۔ سیاہ گہرے غار۔ میں ششدر رہ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ کھانا لانے والے نے اپنے قریب میری موجودگی کو بخوبی محسوس کر لیا تھا پھر وہ نرم آواز میں بولا۔ ”کھانا کھا لیجئے جناب!

”اوہ۔ ہاں ٹھیک ہے۔ سنو' کیا تم اندھے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

لیکن وہ اس طرح واپس مڑ گیا جیسے اندھا ہی نہ ہو' بہرا بھی ہو اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے طویل سانس لے کر شانے ہلائے اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جہنم میں جائے سب کچھ۔ خواہ یہ اندھوں کی نگری ہو یا بہروں کی۔ میں جیل سے باہر نکل آیا ہوں اور اب زندگی کی طرف چل پڑا ہوں۔ یہ زندگی میری اپنی ہے۔ بوڑھا سوما بے شک مجھے جیل سے نکالنے میں میرا معاون ہے' میرا مددگار ہے' لیکن اب میری زندگی میری اپنی ہے۔ میں اس کا پابند تو نہیں ہوں۔ جب تک دل چاہے گا یہاں رہوں گا اور دل چاہے گا تو یہاں سے نکل جاؤں گا۔

میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا' بہت عمدہ کھانا تھا اور پھر میں برتن ایک طرف سرکا کر ملحقہ باتھ روم میں گیا۔ دانت وغیرہ صاف کئے' شیو کافی دن سے نہیں بنا تھا' وہ بنایا۔

اس وقت میں نے اس کمرے سے نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ جاتا بھی کہاں' چنانچہ مسہری پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ عرصے کے بعد احساس ہو رہا تھا کہ جیل کی بجائے گھر میں ہوں' اب وہ گھر کسی کا بھی ہو زمین پر ٹاٹ بچھا کر سوتے ہوئے نہ جانے

کتنا وقت گزر چکا تھا۔ آرام دہ مسہری عجیب سی لگی اور نیند تو جیسے تلی بیٹھی تھی۔ گہری نیند سو گیا اور دوسرے دن صبح کو ہی آنکھ کھلی۔

ناشتہ بوڑھے سوما نے میرے ساتھ ہی کیا تھا اور ناشتہ کے لئے ہم جس کمرے میں گئے وہ بھی باقاعدہ ڈرائنگ روم تھا' جس میں اخروٹ کی لکڑی کی منقش میز اور کرسیوں کا سیٹ تھا۔ برتن بھی نہایت قیمتی تھے۔ بوڑھا خاصا صاحب حیثیت تھا۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا۔

”سوما' میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہاں کے حالات دیکھ کر' تمہاری شخصیت کو محسوس کر کے تجسس اس قدر بڑھ گیا ہے کہ میں تمہارے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہو گیا ہوں' کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ہم دونوں اپنا عہد توڑ دیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ اور میں تمہیں اپنے بارے میں۔“

میری بات سن کر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اس کے بجائے کیوں نہ ہم کام کی باتیں کریں۔“ اس نے کہا۔

”لیکن میرا تجسس؟“

”تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

”نہیں' لیکن میں تمہارے اندھے ملازم کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

”اس.......... کیا جاننا چاہتے ہو اس کے بارے میں؟“

”کیا تمہارا دوسرا ملازم بھی اندھا ہے؟“

”ہاں۔“

”واقعی؟“ میں اچھل پڑا۔

”ہاں۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔“

”لیکن معاف کرنا یہ اندھوں کی ٹیم تم نے کیوں جمع کی ہے؟“

”اسے میرا کمپلیکس سمجھ لو۔ میں خود اندھا ہوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھی بھی اندھے ہوں۔“ بوڑھے نے مسکرا کر جواب دیا۔

”لیکن تم خصوصی حسیات کے مالک ہو' کیا یہ ملازم بھی تمہاری طرح ہیں۔“

”ہاں۔ یہ پوری عمارت کی نگرانی کرتے ہیں' باورچی خانے میں کھانے پکاتے ہیں۔ کمروں کی صفائی کرتے ہیں' کوئی کام ایسا نہیں جو نہ کر سکیں۔“

”لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اور تم کہہ چکے ہو کہ تم

پیدائشی اندھے نہیں ہو۔"

"ہاں۔ میں نے غلط نہیں کہا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو' آؤ میں تمہیں یہ عمارت دکھاؤں۔"

ناشتہ کی میز سے بوڑھا اٹھ گیا' اس نے میرا یہ سوال بھی تشنہ چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کے ساتھ اٹھ آیا اور پھر اس نے مجھے یہ کھنڈر نما عمارت دکھائی۔ درحقیقت تاحدِ نگاہ ویران جنگلوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس کھنڈر کی موجودگی بھی حیرت انگیز تھی۔ نہ جانے آبادی سے دور یہ عمارت کس لئے بنائی گئی تھی۔ بوڑھا مجھے ایک ایک جگہ کے بارے میں بتاتا رہا اور پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

"بیٹھو۔"

اس نے ایک طویل سانس لے کر خود بھی بیٹھتے ہوئے کہا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا اور بوڑھا کسی سوچ میں گم تھا۔ کافی دیر خاموشی سے گزر گئی۔

"میرا خیال ہے تم خصوصی طور سے مجھے اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں بہت جلد اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا......... بہت جلد۔" اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔

اور میں خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے بارے میں چھپانا چاہتا ہے تو مجھے بھی اتنی کرید نہیں ہے' میرا کیا ہے جب دل چاہے گا یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کس کی مجال ہے کہ مجھے روک سکے' اس کے بعد میں نے اس بوڑھے سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی تھوڑی دیر خاموش رہا پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم آرام کرو' میں چلتا ہوں اور ہاں ذہن میں کسی وسوسے کو جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے' میرے ساتھ رہ کر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"تم بالکل فکر مت کرو۔ میں نے دوبارہ زندگی قبول کر لی ہے اور اب میں اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔"

"یقیناً۔ یقیناً۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں اب یہاں سے کسی حد تک اکتاہٹ محسوس کرنے لگا اور......... دوسرے انداز میں سوچ رہا تھا' کیوں نہ راہِ فرار اختیار کی جائے' جو فاصلہ طے کر کے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ اس سے واپس بھی جا سکتا ہوں' کون روکنے والا تھا' تھوڑی دیر اور سہی۔

اور پھر میں مسہری کی طرف بڑھ گیا' لیٹ گیا۔ اس کے علاوہ اور کام بھی کیا تھا لیکن .... کیا کرنا چاہئے؟ یہاں سے کہاں جاؤں' کس طرح زندگی بسر کروں؟ ظاہر ہے پولیس میرا تعاقب کرے گی' دس آدمیوں کا قاتل تھا اور سزائے موت کا مجرم۔ مہذب دنیا میں پتہ نہیں میرے خلاف کیا کیا کارروائیاں ہو رہی ہوں لیکن جب زندگی سے ہاتھ ہی دھو لئے تھے' جب اپنے آپ کو مردہ ہی تصور کر لیا تھا' تو اب زندہ رہنے کے لئے خوف بے معنی تھا۔ آنکھ مچولی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ زندہ بچ گیا تو ٹھیک ہے اور پولیس کی گولی دل میں اتر گئی تو بہرحال موت تو آنی ہی ہے لیکن اب اس بوڑھے سے کچھ گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اونہہ اس بور ماحول میں زندہ رہنا ہی بے مقصد ہے۔ جب زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں تو پھر کیوں نہ چند سانسیں زندگی سے بھرپور ماحول میں گزاری جائیں۔

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔

دوپہر ہوئی اور پھر شام ہو گئی۔ رات کے کھانے پر بھی بوڑھا میرے ساتھ تھا۔ کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی اور مجھے کھانے کے بعد آرام کی تلقین کر کے چلا گیا۔ میں بھی بیزار سا کمرے میں واپس آ گیا۔ اب تو بالکل ہی دل اکتا گیا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی اور ذہن نیم غنودہ ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے اس کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہو۔ اس کا احساس گہرے گہرے سانسوں کی آواز سے ہوا تھا اور سانسوں کی آواز اتنی تیز تھی جیسے خراٹے لئے جا رہے ہوں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید میری سماعت کا دھوکہ ہے لیکن سانس اتنے تیز تھے کہ ذہن کی غنودگی دور ہو گئی اور میں آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن شمعدان کی روشنی میں کوئی نظر نہیں آیا۔

پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ پورے طور سے غور کیا تو احساس ہوا کہ مسہری کے نیچے سے تیز سانسوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں اچھل کر نیچے کود آیا۔ یہ تو حیرت انگیز بات تھی' بھلا یہاں کون ہو سکتا تھا۔ بے ساختہ میں نیچے جھکا اور پھر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ یقیناً کوئی موجود تھا' دو پاؤں سامنے ہی نظر آ رہے تھے۔ چونکہ شمعدان کی روشنی مسہری کے اس رخ پر نہیں آ رہی تھی اس لئے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ پاؤں بوڑھے سوما کے ہیں یا اس کے نوکر کے' بہرحال میں نے کوئی تکلف نہیں کیا اور اطمینان سے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور زور سے باہر گھسیٹ لئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ

کمرے میں گونج اٹھی۔ چیخ کے ساتھ ہی میں نے گھبرا کر پاؤں چھوڑ دیئے اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

لیکن میں نے جس طاقت سے اسے گھسیٹا تھا اس سے وہ پوری باہر نکل آئی تھی اور اپنے کمرے میں ایک حسین اور نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر میری آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں۔ جو کچھ ہو رہا تھا ناقابل یقین تھا کیونکہ اب تک میں نے صرف بوڑھے سوما کو دیکھا تھا یا اس کے دونوں اندھے ملازموں کو۔ اب تک نہ تو کسی سے کسی لڑکی کے بارے میں سنا تھا نہ ہی ایسے آثار نظر آتے تھے' لیکن یہ اچانک لڑکی کہاں سے ٹپک پڑی۔

وہ متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہی تھی۔ جیسے سونے سے جاگنے والے وقتی طور پر خالی الذہن ہو جاتے ہیں۔ اس کے چہرے کی تراش عجیب سی تھی۔ عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک نگاہ میں محسوس ہوتا کہ وہ ایک سادہ سی لڑکی ہے لیکن بغور دیکھنے سے چہرے پر بے حد سفاکی نظر آتی تھی۔ ہونٹوں کی تراش میں ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اس کے بدن پر سیاہ چست پتلون اور سفید مردانہ قمیض تھی بالوں کا اسٹائل کافی خوبصورت تھا اور اس کے پلکیں جھپکانے کا انداز۔

پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ حواس کی دنیا میں واپس آ گئی ہو' اس نے دونوں کہنیاں زمین پر ٹکائیں اور بدن کو تھوڑا سا اٹھایا اور پھر ایک بے تعلق سی کراہ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی' اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"کب آئے تم؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا جیسے برسوں کی شناسا ہو۔

"کیا مطلب' کون ہو تم؟" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

"سونی۔" اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر' لیکن آپ کون ہیں اور کہاں سے نازل ہو ہیں؟"

"اس مسہری کے نیچے سے۔"

"سبحان اللہ۔ کیا ابھی ابھی پیدا ہوئی ہیں؟"

"نہیں میری عمر بائیس سال ہے۔"

"تو اے بائیس سالہ حسینہ اب اپنی شانِ نزول بھی بتا دے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔ پورے چار گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ ڈک اور ہیگ یقیناً مجھے تلاش کر رہے ہوں گے بلکہ شاید مایوس بھی ہو چکے ہوں۔ بس میں

چھپ کر آئی اور سیدھی مسہری کے نیچے آ گھسی۔ پتہ نہیں کس وقت نیند آ گئی تمہارا انتظار کرتے کرتے۔"

"اوہ!" میں نے پریشانی سے گردن ہلائی' نہ جانے اس بھوت خانے میں کیا کیا تھا۔ اب اس لڑکی سے کیا کہا جائے اور یہ جو کچھ کہہ رہی ہے اسے کیا سمجھا جائے۔ پتہ نہیں کون ہے اور اس عمارت میں کہاں سے آ گئی۔ سوما سے اس کا کیا تعلق ہے۔ بہت سے سوالات میرے ذہن میں مچل رہے تھے۔ چند ساعت میں اس کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے سہارا دینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سہارا قبول کر لیا گیا۔ اس کا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ تب وہ اٹھ گئی اور شکریہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"خدا کے لئے اب تو بتا دو کہ کون ہو تم؟"

"ارے تم یہ نہیں جانتے؟"

"جی نہیں۔"

"کہہ تو چکی ہوں کہ سونی ہوں' اور تمہیں ایک اہم اطلاع دینے آئی تھی۔"

"اچھا تو فرمایئے۔" میں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر کہا۔

"بھاگ جاؤ فوراً.......... فوراً بھاگ جاؤ۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔"

"کیوں خیریت' یہاں میری موجودگی آپ کو گراں گزر رہی ہے؟" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "اور اگر تم سونی ہو تو سونی ہوتی کیا چیز ہے؟"

"بس بس رہنے دو' میں سمجھ گئی تم میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے۔ بھگتو گے خود۔ میں نے دوستانہ طور پر تمہیں بتا دیا ہے اور اس کے لئے میں چار گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" لڑکی کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی جیسے وہ صحیح الدماغ نہ ہو' میں غور سے اسے دیکھتا رہا اور پھر میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"سوما سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"موت کا رشتہ ہے' مارے جاؤ گے تم کتے کی موت اور پھر یاد کرو گے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔ ارے مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے تمہارے لئے وقت ضائع کیا ہو۔" وہ جھلاتے ہوئے انداز میں بولی اور پھر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے نہیں نہیں بیٹھو' تم تو مجھے بہت اچھی لڑکی معلوم ہوئی ہو۔" میں نے آگے

بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور اس نے ایک جھٹکے میں شانے چھڑا لیئے۔

"بولو' جاؤ گے یا نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"تم یہیں رہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"تب تو مجھے یہاں سے نہیں جانا چاہیئے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کہتی ہوں فضول باتیں مت کرو اور.........."

اچانک اس کے حلق سے چیخ نکل گئی' دروازہ بہت زور سے کھلا تھا۔ سب سے آگے سوما اور اس کے پیچھے دونوں ملازم اندر گھس آئے' تینوں کے چہروں پر خوفناک تاثرات تھے۔ سوما منہ اٹھا کر کتے کی طرح سونگھنے لگا اور پھر غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہوں۔ تو تم یہاں موجود ہو۔"

"مم.......... میں تو ابھی آئی تھی۔" لڑکی نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور اس کی آنکھوں سے خوف ٹپکنے لگا۔

"چلو ہیک! اسے یہاں سے لے جاؤ۔" اور دونوں ملازموں نے آگے بڑھ کر لڑکی کے بازو پکڑے اور اسے خاصی بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ لڑکی نے منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔ سوما کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔ چند ساعت وہ سوچتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا بکواس کر رہی تھی یہ بیوقوف لڑکی؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"جو کچھ بھی کہہ رہی تھی اس سے تمہیں سروکار نہیں ہونا چاہیئے۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا' کیونکہ تم نے مجھے یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔" میں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آصف تم بہت بے صبرے انسان معلوم ہوتے ہو' میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا' لیکن نہ جانے کیوں تمہیں اس سلسلے میں اتنی جلدی ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں سنو' وہ میری بیٹی ہے سونی' اس کا دماغ الٹ چکا ہے' مکمل طور سے پاگل ہے' اس کی کسی بات کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب بتاؤ۔ وہ کیا کہہ رہی تھی تم سے؟"

"بس میرا خیال ہے کوئی عقل کی بات نہیں کی تھی۔ کہہ رہی تھی یہاں سے بھاگ

جاؤ ورنہ مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے' بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا تھا اس نے۔" میں نے کہا اور یوں محسوس ہوا جیسے بوڑھے نے اطمینان کا سانس لیا ہو' پھر وہ غم زدہ انداز میں بولا۔

"میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ بچی ہے۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے وقت ہی مر گئی تھی اور اس کے بعد میں نے ہی اسے پرورش کیا' بے حد حساس ہے' ذرا ذرا سی بات کو ذہن میں چپکا لیتی ہے' اور بالآخر یہی بات اس کے ذہنی انتشار کا باعث بنی۔ اب وہ صحیح الدماغ نہیں ہے' اس کی غیر موجودگی سے ہم بڑے پریشان ہو گئے تھے۔ بہرحال شکر ہے کہ وہ تمہارے کمرے میں مل گئی ہے اور ہمیں اس کی تلاش میں جنگلوں کا رخ نہ کرنا پڑا' میرا خیال ہے تمہیں نیند آ رہی ہو گی۔ آرام کرو۔ احمق لڑکی نے تمہیں پریشان کیا۔"

"بیٹھو سوما۔ مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی' تم مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

"صبح کو سہی آصف۔ میں خود بھی تھکن محسوس کر رہا ہوں۔" سوما نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"تمہاری مرضی سوما' ویسے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم مجھ سے بہت سی باتیں چھپا رہے ہو' اور مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے۔ بہرحال میرے محسن ہو' تم نے مجھے جیل سے فرار ہونے میں مدد دی ہے' میں تمہیں کسی سلسلے میں مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر تم اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ بلکہ سچ کہو اگر تمہیں میری یہاں موجودگی ناگوار گزر رہی ہے تو میں یہاں سے چلا جاؤں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دوست کی حیثیت سے یاد رکھیں گے۔"

"غلط فہمی کا شکار نہ ہو آصف' ایک رات کی مہلت اور دے دو۔ کل صبح تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا' کوئی بھی بات تم سے پوشیدہ نہیں رہے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ بس اب مجھے اجازت دو۔"

وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ گیا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میرا ذہن الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر مسہری پر آ گرا۔ لعنت ہے اس پاگل خانے پر' بوڑھا سوما کچھ بتائے یا نہ بتائے میں کل یہ کھنڈر چھوڑ دوں گا' بعد میں جس انداز کی بھی زندگی گزارنی پڑے' اور یہ فیصلہ کرنے کے

بعد خاصی سکون کی نیند آئی تھی۔ ساری رات شاید کروٹ بھی نہیں بدلی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو ذہن پر بڑا خوشگوار تاثر تھا' بدن ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا انگڑائی لینے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور میں بری طرح اچھل پڑا۔ کیونکہ اب محسوس ہوا کہ نہ صرف ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بلکہ بدن پر جگہ جگہ ایسی بندشیں ہیں جو بظاہر محسوس نہیں ہوتیں لیکن ہلنے جلنے کی کوشش کی جائے تو اسے ناکام بنا دیتی ہیں۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا' یہ کیا ہو گیا تھا' کس نے باندھ دیا تھا مجھے' اور کیوں؟ میں نے گردن گھمانے کی کوشش کی' لیکن اس میں بھی ناکام رہا۔ سر کے دونوں طرف بھی ایسی رکاوٹیں کر دی گئی تھیں کہ گردن نہ ہلائی جا سکے۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا اور صاف اندازہ ہو گیا کہ میں اس کمرے میں نہیں ہوں جس میں پچھلی رات سویا تھا لیکن میں یہاں کیسے آ گیا اور یہ کون سی جگہ ہے' مجھے یہاں لانے والا کون ہے۔ عجیب بے بسی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

اور پھر اسی وقت سوما کی کریہہ آواز کانوں میں گونجی۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

میں چونک پڑا' لیکن گردن گھما کر سوما کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اور اس وقت سوما کا چہرہ میرے چہرے کے مقابل آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس وقت اس کے چہرے میں تبدیلی تھی اور یہ تبدیلی بڑے بڑے شیشوں والی عینک سے ہوئی تھی' جو اس کی منحوس آنکھوں پر چڑھی ہوئی تھی۔

"کیا تمہیں اپنے بدن میں ایک خصوصی توانائی محسوس ہو رہی ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"یہ.......... یہ سب کیا ہے؟" میں نے غصیلے انداز میں پوچھا۔

"میری بات کا جواب دو۔"

"بکواس مت کرو' مجھے بتاؤ تم نے مجھے کیوں باندھ دیا ہے؟" میں نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ۔ تم بضد تھے نا کہ تمہیں سارے حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔" بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے اور.......... اور مجھے میرے کمرے سے کیسے

لایا گیا؟"

"بے ہوش کر کے' بہرحال تمہیں یہاں آنا ہی تھا۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"اس عمارت کا تہہ خانہ' لیکن میں نے اس میں ترمیمیں کرائی ہیں۔ یہ میری لیبارٹری ہے۔"

"لیبارٹری؟" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں لیبارٹری۔" بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ "بہت کم لوگ ڈاکٹر سوما کو جانتے ہیں۔"

"ڈاکٹر سوما۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر سوما' آنکھوں کا ماہر' میں نے آنکھوں کی متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کئے لیکن بہت سے لوگوں کو میرے طریق کار سے اختلاف تھا۔ میری لیبارٹری پر کئی بار چھاپے مارے گئے اور مجھے کبھی سکون سے کام نہیں کرنے دیا گیا۔"

"مگر تم.......... تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے؟"

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ میرے بارے میں پوری تفصیل سنو' یہ تو تمہاری سب سے بڑی خواہش تھی۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں نے آنکھوں کی متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کئے اور انہیں عام کر دیا۔ یہ جو آنکھیں بدلنے کے آپریشن عام ہو گئے ہیں۔ یقین کرو ان کا بنیادی تصور میں نے ہی دیا تھا' لیکن ہر تعمیر کے لئے پہلے قربانیاں دینا ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے مؤثر علاج کے لئے مجھے انسانی آنکھوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے لئے میں نے مردہ انسانوں کی آنکھیں خریدنا شروع کر دیں' عام طور سے لاوارث مرنے والوں کی آنکھیں مل جایا کرتی تھیں لیکن موت کے بعد بینائی پر جو جھلی چڑھ جاتی تھی' وہ میرے اس منصوبے کے لئے ناکارہ تھی جس پر میں نے سوچا تھا۔ اس پر عمل کرنے کے لئے زندہ انسانوں کی آنکھوں کی ضرورت تھی۔ میں نے بے اندازہ دولت خرچ کر کے بھی انسانی آنکھیں حاصل کرنے کی کوشش کی' لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ دوسری طرف میں اپنے تجربے کے لئے پاگل ہو رہا تھا اور اس جنون کے عالم میں' میں نے ایک زندہ انسان کی آنکھیں نکال لیں لیکن عجیب قانون ہے' عجیب لوگ ہیں' میری کوششوں سے بے شمار ایسے انسانوں کی آنکھوں کی روشنی واپس آئی جو اندھے ہو چکے تھے' مجھے کچھ نہیں ملا' لیکن میں نے انہی کے فائدے کے لئے صرف ایک انسان کی

آنکھیں ضائع کر دیں تو دنیا میری دشمن ہو گئی اور میری زندگی دوبھر کر دی گئی۔ بالآخر مجھے اس دنیا کو خیرباد کہنا پڑا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کے بعد میں لوگوں کی فلاح کے لئے کام کرنا بند کر دیتا' لیکن تم جانو شوق کا نشہ اتنا ہلکا نہیں ہوتا کہ آسانی سے زائل ہو جائے' میں اپنے تجربات کو اس حد تک وسعت دینا چاہتا تھا کہ میں کسی ایسے انسان کو بینائی دے سکوں جو پیدائشی طور پر اندھا ہو' اس کی آنکھ کی شریانیں تک نہ ہوں۔ جس طرح پلاسٹک کے دوسرے اعضاء بنا لئے گئے ہیں جن میں ہاتھ پاؤں یہاں تک کہ نازک ترین اعضاء یعنی دل' گردے' پھیپھڑے وغیرہ شامل ہیں اور وہ انسانی زندگی کے تار قائم رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں اسی طرح میں مصنوعی آنکھیں بنانا چاہتا تھا کہ ہم ان آنکھوں کے محتاج نہ رہیں جو عطیہ کے طور پر دی جاتی ہیں۔ تم غور کرو کیسی اچھی بات ہے کہ دنیا میں کوئی انسان بینائی سے محروم نہ رہے لیکن یہ دنیا والے کسی اچھے کام کی اس وقت تو تعریف کر دیتے ہیں جب وہ ہو چکے لیکن اگر اس کی تکمیل کے مراحل میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ ہو تو اسے قطعی نہیں برداشت کرتے' ہم لوگ بہت سے مسائل میں اس لئے مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمیں تعاون نہیں ملتا۔

"لیکن میرا نظریہ مختلف ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ٹھیک ہے' دنیا سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے جو کرنا ہے کر ڈالو' چنانچہ میں نے آبادیوں کی گہماگہمی سے دور ان کھنڈرات کا انتخاب کیا' اور یہاں اپنی تجربہ گاہ قائم کی۔ مجھے زیادہ معاونوں کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا۔ میرے ساتھ میری بچی سوتی بھی تھی' یہی میری معاون ہے اور یہی میری اسسٹنٹ' جو بھی سمجھو' میں نے اپنا کام شروع کر دیا' لیکن مسئلہ وہی تھا یعنی انسانی آنکھوں کی ضرورت۔ بالآخر میں نے ایسے دو انسانوں کا انتخاب کیا جو دنیا کی سردمہری سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ معاشی مسائل نے انہیں خودکشی کی منزل تک لا پھینکا تھا' وہ مرنا چاہتے تھے تب میں نے ان سے سودا کیا' میں نے ان سے ان کی آنکھیں خرید لیں۔ بھاری رقم کے عوض۔ اس دولت نے ان کے بچوں کے لئے اچھا مستقبل مہیا کر دیا اور میں نے ان کی زندگی بھی برباد نہ ہونے دی' میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور اب وہ دونوں میرے معاون ہیں' تم سمجھ گئے ہو گے۔ یعنی ہیگ اور ڈک۔ اور اس کے بعد مسٹر آصف' اس کے بعد میں نے اپنی آنکھیں بھی تجربے کی نذر کر دیں' میں اپنے کام میں اس سے زیادہ مخلص نہیں ہو سکتا تھا' مجھے بتاؤ فلاحِ انسانیت کے لئے اس سے بڑی قربانی اور کیا دی جا سکتی تھی کہ میں نے اپنی کائنات تاریک کر لی' اب

بھی لوگ میرے خلوص پر شک کریں تو میں کیا کر سکتا ہوں.......... اس کے لئے مجھے کسی چیز کی ضرورت پیش آئے تو میں کیا کروں سوائے اس کے کہ جائز ذریعوں کی تلاش میں وقت ضائع نہ کروں اور یہی ہوا تھا۔ میں نے شہر جا کر ایک انسان کو قتل کر دیا اور پھر اس کی آنکھیں نکالی تھیں لیکن اس جرم میں پکڑا گیا' دنیا کو تو میں نے اصلیت کی کوئی ہوا نہ لگنے دی۔ ہاں مجھے سزائے موت ضرور سنا دی گئی۔ نکلنا تو تھا ہی' میں نے سوچا کہ کوئی ساتھی بھی مل جائے۔

"سو میں نے تمہارا انتخاب کیا اور تمہیں یہاں لے آیا۔ اب دیکھو نا میرے دو دو کام ہو گئے۔ ایک ساتھی بھی مل گیا اور اپنے تجربے کے لئے دو آنکھیں بھی۔"

"کیا مطلب؟" میں پھر اچھل پڑا۔

"انسانیت کی فلاح کے لئے میرے دوست!"

"کیا بکواس ہے۔" میرے بدن میں خوف کی لہریں دوڑ گئیں۔

"تھوڑی سی فراخ دلی سے کام لو' غور تو کرو' اگر تمہاری آنکھیں میرے تجربے کا آخری دور پورا کر سکیں تو اس سے سینکڑوں ایسے لوگوں کو روشنی مل جائے گی جنہوں نے کبھی یہ دنیا نہیں دیکھی' جنہوں نے کبھی باغوں میں کھلے پھولوں کے رنگ نہیں دیکھے' جنہوں نے کبھی معصوم بچوں کی مسکراہٹیں نہیں دیکھیں' کائنات کی سب سے انمول شے بینائی جس سے وہ محروم ہیں' تمہاری آنکھیں ان کے درد کا درماں ہو جائیں تو اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"نہیں نہیں' میں تمہاری بات نہیں مان سکتا۔"

"کیوں آخر کیوں؟ تم تو سزائے موت کے مجرم تھے' تم تو موت اپنا چکے تھے۔ پھر اگر میں تمہاری زندگی میں تھوڑا سا خلاء پیدا کر رہا ہوں تو تم اس سے اس قدر منحرف کیوں ہو رہے ہو' خود کو اس تجربے کے لئے وقف کر دو' وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کامیاب ہو گیا تو تعاون کرنے والوں میں تمہارے نام کو نظرانداز نہیں کروں گا۔ تم بھی محسنِ انسانیت کہلاؤ گے۔"

"لیکن آنکھوں کے بغیر زندگی کا تصور بے حد بھیانک ہے۔"

"تم ہمیشہ اندھے نہیں رہو گے دوست' تمہاری بینائی واپس مل جائے گی' تم نے دیکھا کہ میں خود بھی اس کیفیت میں ہوں' ہمارا تجربہ ہماری آنکھوں کے ان دو گڑھوں کو دو خوبصورت اور روشن آنکھوں سے پُر کر دے گا۔"

بوڑھے کی آواز میری سماعت پر ہتھوڑے برسا رہی تھی' لیکن اس کے ساتھ ہی متحیر بھی تھا۔ بھلا یہ اندھا بوڑھا یہ تجربات کیسے کر رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بھی داؤ پر لگا دی ہیں' کیسی انوکھی بات ہے۔

"تم نے اب تک ایک دلیر انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے آصف! میں چاہتا ہوں تم اب بھی اسی انداز سے پیش آؤ اور خوشی خوشی اپنی آنکھوں کا عطیہ پیش کر دو' تم یہاں رہو گے' میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم تینوں کو سب سے پہلے آنکھیں واپس کروں گا۔"

میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب تھا۔ آنکھیں کھونے کا تصور بڑا ہی اذیت ناک تھا' بھلا آنکھوں کے بغیر بھی زندگی کو زندگی کہا جا سکتا ہے' بوڑھا پاگل کیا ضروری ہے کہ اپنے تجربات میں کامیاب رہے' وہ دونوں بے چارے اندھے جو زندگی گزار رہے تھی وہ افسوس ناک تھی' نہ جانے انہیں کب تک انتظار کرنا پڑے اور بوڑھا کامیاب ہو یا نہ ہو۔

"تم نے کیا سوچا؟" بوڑھے کی آواز ابھری۔

"کیا تم مجھے سوچنے کا موقع دو گے؟"

"فیصلے لمحوں میں کئے جانے چاہئیں' ان کے لئے وقت درکار نہیں ہوتا۔"

"لیکن یہ فیصلہ........." میں نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"آصف خان! میں نے تمہیں جس انداز میں پایا تھا اس کے بعد میں نے سوچا تھا کہ تم جیسا دلیر انسان زندگی کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا' کیوں نہ تم خود کو مردہ ہی تصور کرو۔"

"تب میں تمہیں رائے دیتا ہوں میرے دوست کہ پہلے مجھے ختم کر دو اور اس کے بعد میری آنکھیں نکال لو۔"

"نہیں تم اس قدر مایوس نہ ہو' ایک وعدہ تو کرتا ہوں کہ جب تم دنیا دیکھنا چاہو گے' دیکھ سکو گے' وقتی طور پر سہی' مصنوعی طور پر سہی۔"

"میں نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔

"سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرو۔ نہیں آصف! میں اپنی سانسوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔ موت کا تو کوئی وقت معین نہیں ہوتا' جب بھی آجائے' پھر ہم انتظار میں کیوں وقت ضائع کریں جو کام کرنا ہے جلد از جلد کر لیا جائے۔"

"بکواس مت کرو' مجھے کھول دو۔"

"ہرگز نہیں دوست' ہرگز نہیں۔ تم اس خوبصورت موقع کو ضائع کرنے کا مشورہ

دے رہے ہو۔ میری زندگی میں یہ آپریشن بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے' بہتر تھا کہ تم رضاکارانہ طور پر خود کو اس کے لئے پیش کر دیتے لیکن تم اتنے فراخ دل نہیں ہو' جتنا میں سمجھا تھا' مجھے اجازت دو کہ میں اپنا کام کروں۔" اس کا چہرہ میرے سامنے سے ہٹ گیا۔

میں بری طرح بدحواس ہو گیا تھا' یہ سب کچھ تو توقع کے بالکل خلاف تھا۔ ظاہر ہے میں بزدل انسان نہیں تھا' میں نے تو موت کو گلے لگا لیا تھا لیکن اس وقت جب زندگی سے محبت ہوئی تو یہ تکلیف وہ دور شروع ہو گیا آنکھوں کے بغیر تو کچھ نہیں۔ اندھا رہ کر زندہ رہنے سے کیا فائدہ اور اب جب کہ یہ بوڑھا خبیث اپنی مقصد براری کے لئے مجھے زندگی کے بدترین لمحات سے آشنا کرنے والا تھا تو میں ہر قیمت پر اس سے بچاؤ چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بدن کے گرد کی بندشوں کو توڑنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی لیکن خبیث اور طاقتور بوڑھے نے جس طرح مجھے باندھا تھا اس سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں تھی' نہ جانے میرے بدن کے کون کون سے حصوں پر زخم آئے لیکن میں اس وقت تک جدوجہد کرتا رہا جب تک سکت رہی یا پھر میرا ذہن جواب دینے لگا۔ بوڑھا کتا نہ جانے کون سے کاموں میں مصروف تھا۔

☆======☆======☆

پھر نیم غنودگی کی کیفیت میں ہی میں نے اپنے بازو میں انجکشن کی چبھن محسوس کی۔ ہلکی سی 'سی' میرے منہ سے نکلی اور اس سے بعد کی کیفیت عجیب سی تھی۔ پتہ نہیں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا' آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں لیکن ذہن ان کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا۔ ہاں البتہ جب مکمل طور سے ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی۔

رات.......... یہ کیسی رات تھی۔ میں نے سوچا' پھر مجھے بوڑھا خبیث یاد آ گیا اور میں نے اپنے ہاتھوں میں اینٹھن محسوس کی۔ ایک بار پھر میں نے بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی' لیکن بندشیں تو اب میرے گرد نہیں تھیں۔ سر بھی ہلا سکتا تھا' ہاتھ پاؤں بھی ہلا سکتا تھا۔ شاید رات کا آخری پہر ہے۔ ورنہ اس قدر گھور تاریکی۔ میں نے پلکیں جھپکانے کی کوشش کی اور اچانک میری گھگھی بند گئی۔

آہ۔ یہ کیا؟ میری پلکیں آنکھوں کے درمیان کے ان ڈیلوں کو محسوس نہیں کر رہی تھیں جن میں بینائی ہوتی ہے' دہشت زدہ ہو کر میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ٹٹولیں اور آنکھوں کے گڑھوں میں خون کی چپچپاہٹ میری انگلیوں سے ٹکرائی اور پھر میرے حلق سے جو آواز نکلی وہ بڑی دہشت ناک تھی۔

"نہیں.......... نہیں.......... یہ.......... یہ کیا کیا تو نے کتے.......... سوما.......... سوما کتے میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ آہ میری آنکھیں۔ میری آنکھیں.........."

میرے دماغ میں شعلے بھڑک چلے تھے' میں طوفان کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا' جو چیز میرے سامنے آئی میں اسے نیست و نابود کرنے پر تل گیا۔ شیشے ٹوٹنے کی آوازیں' میز کرسیوں کا شور اور پھر میں سامنے کی دیوار سے ٹکرایا اور اسے ٹٹول ٹٹول کر دروازے تک پہنچ گیا' میرے بدن کی ٹکروں نے دروازہ توڑ دیا۔

"سوما.......... سوما تو کہاں ہے' میرے سامنے آ کتے' تو نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے' میری آنکھیں مجھے واپس دے دے' میں کہتا ہوں' میری آنکھیں مجھے واپس دے

دے ورنہ اچھا نہ ہو گا' میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ تو سوچ نہ سکے گا۔ سو..........
ما.........."

میں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ نیچے گر گیا۔

میرا سر زور سے کسی پتھر سے ٹکرایا تھا اور ذہن پھر تاریکیوں میں کھو گیا۔ نہ جانے کب تک.......... نہ جانے کب تک.......... لیکن زندگی تھی تو ہوش بھی آ گیا اور ذہن جاگا تو کسی کے گفتگو کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس طرف کان لگا دیئے۔

آہ۔ یہ اس ذلیل بوڑھے کی آواز تھی' کسی سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں اسے پائپ سے خوراک دو' ہوش میں لانا ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی وہ برداشت نہیں کر سکے گا۔"

"جو حکم سر' کیا اس کی آنکھوں پر دوا لگا دی جائے؟"

"اوہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس کی شریانیں بند کر دی ہیں آنکھوں کے گڑھے بالکل بے جان ہیں۔ اسے تکلیف محسوس نہ ہو گی' لیکن بس اسے ہوش میں نہیں آنا چاہئے۔"

"بہت بہتر جناب۔" دوسرے شخص کی آواز آئی اور پھر کوئی مجھے نزدیک آتا ہوا محسوس ہوا' میرے دانت ایک دوسرے پر بھنچ گئے تھے' میں نے اس کے قدموں کی چاپ کو محسوس کیا اور جونہی آنے والا میرے قریب آیا' میری دونوں ٹانگیں پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑیں اور وہ ایک بے ساختہ چیخ کے ساتھ شاید دوسری طرف الٹ گیا۔

میں پھرتی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ درحقیقت آنکھوں کے خالی حلقوں میں کوئی تکلیف نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ بوڑھے کتے نے میری آنکھیں نکال کر کوئی ایسی دوا ان حلقوں پر لگا دی تھی جس سے تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بدن میں توانائی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

تب ہی میں نے بوڑھے سوما کی آواز سنی۔

"اوہ۔ ہیگ کیا ہوا۔ کیا تم ٹھیک ہو؟"

"نہیں جناب' شاید وہ ہوش میں آ گیا ہے۔"

"اوہ۔" سوما نے مخصوص انداز میں منہ اٹھا کر فضا میں سونگھنے کی کوشش کی اور پھر اس نے مجھے آواز دی۔

"آصف کیا تم نے ہیگ کو نقصان پہنچایا ہے؟"

"میرے نزدیک آ کتے' دھوکے باز' کیا تو مجھے اس لئے جیل سے نکال لایا تھا۔ دیکھ' میری آنکھیں مجھے واپس کر دے ورنہ میں تجھے کتے کی موت مار دوں گا۔" میں نے دونوں ہاتھ فضا میں نچاتے ہوئے کہا تب اچانک میرے ہاتھ کسی کے جسم سے ٹکرائے اور میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

یہ بوڑھا سوما ہی تھا۔ "کتے.......... کتے۔" میں نے اس کی گردن ٹٹولی اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا تب بوڑھے سوما کے چوڑے ہاتھ میری کلائیوں پر آ جمے اور اس نے نہایت اطمینان سے اپنی گردن میری گرفت سے چھڑا لی۔

"آصف خان میں آخری بار کہہ رہا ہوں ہوش میں آ جاؤ۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ ایک خوبصورت مستقبل کے لئے تم تھوڑے سے عرصے کے لئے تاریکی برداشت کر لو۔"

"میں.......... میں تجھے مار ڈالوں گا۔" میں نے دانت بھینچ کر اس کا لباس کھینچا۔

"اچھا تو مار ڈالو۔" اس نے سرد لہجے میں کہا اور میں اپنی جدوجہد کرنے لگا' لیکن جیل کی سلاخوں کو موم کی طرح توڑ دینے والا' زمین میں ایک فٹ گہرے گڑے ہوئے آہنی جنگلے کو اکھاڑ پھینکنے والا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے دونوں بازو پکڑے اور دوسرا ہاتھ میری کمر میں ڈال کر اٹھایا اور کندھے پر ڈال دیا اور پھر نہایت اطمینان سے بستر پر لا پٹخا۔

"اگر تم شرافت سے باز نہ آئے تو اب تمہارے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا' تمہاری آنکھوں کے گڑھوں میں کوئی تکلیف نہ ہوگی' میں جانتا ہوں اور اب بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے تعاون کرو اور اگر تم نے تعاون نہ کیا تو پھر یہی ہوگا کہ میں تمہیں کسی بھری پُری بستی میں چھوڑ آؤں گا اور پھر تم ایک اندھے کی حیثیت سے بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہ کر سکو گے۔"

بوڑھے نے جس طرح میری جدوجہد کو ناکام بنا دیا تھا اس سے یہ احساس تو یقین پا گیا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چنانچہ میرا دل چاہا کہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں' کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا میں لیکن بہرحال شانِ مردانگی کے خلاف تھا۔ چنانچہ دل گھونٹ کر رہ گیا۔ چند ساعت خاموشی رہی' پھر سوما کی آواز سنائی دی۔

"اگر تم نے فیصلہ اثبات میں کیا ہے تو مجھے بتا دو۔ اگر تم اب بھی کوئی جدوجہد کرنا چاہتے ہو تو ظاہر ہے تمہاری جدوجہد تمہیں آنکھیں واپس نہیں دے سکے گی' سوائے اس کے کہ میں تمہیں عدم تعاون کرنے والوں میں شمار کروں گا۔"

پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ سب باہر چلے گئے تھے اور درحقیقت میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

زندگی چلی جاتی تو کوئی غم نہ تھا لیکن آنکھیں.......... آنکھوں کے بغیر زندگی بے کار تھی اور اب کوئی جدوجہد بھی بے مصرف ہی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر کیا زندگی کو ڈک اور ہیک کی طرح گزارا جائے۔ آہ' بڑی غلطی ہو گئی' اے کاش اس سے تو موت ہی آ جاتی۔

شاید زندگی میں پہلی بار رو دیا تھا' آنسو نہ جانے کہاں سے نکلے تھے۔ یہ نمکین پانی بڑا ہی وزنی ہوتا ہے۔ ذہن پر اس طرح چھا جاتا ہے جیسے منوں بوجھ۔ بہہ جاتا ہے تو طبیعت کیسی سبک ہو جاتی ہے۔ رونے سے میں بھی خود کو ہلکا محسوس کرنے لگا تھا اور پھر میں سنجیدگی سے آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔

زندگی کی جو امنگ سینے میں جاگی تھی وہ تو اب ختم ہو گئی تھی' اب اس بے کار بوجھ کو لئے لئے جگہ جگہ گھسٹتے رہنا کیا معنی رکھتا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ اسی ویران کھنڈر میں دوسروں کی مانند زندگی گزار دی جائے' بڑی مایوسی بڑی بددلی چھا گئی تھی میرے ذہن پر اور پھر میں اپنے اس فیصلے پر اٹل ہو گیا۔

چنانچہ جب مجھے خوراک دی گئی تو میں نے خاموشی سے قبول کر لی۔ ٹٹول ٹٹول کر کھانا کھایا' پانی پیا اور پھر لیٹ گیا اور جب میں نے کئی دن تک کوئی حرکت نہ کی تو جیسے بوڑھے سوما کو میرے اوپر اعتبار آ گیا۔ پانچویں یا چھٹے دن اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

"آصف! کھنڈرات کے حصوں میں چہل قدمی کیا کرو۔ آواز کے سہارے چلنے کی کوشش کیا کرو' میرا خیال ہے تم بہت جلد اس کے عادی ہو جاؤ گے۔ جتنا وقت تاریکی میں گزرنا ہے' ایک جگہ پڑے گزارنے سے کیا فائدہ' چلنے پھرنے سے بدن میں قوت بھی رہے گی۔"

"ٹھیک ہے مسٹر سوما! آپ مجھے میرا کام بتا دیں' میں کیا کام کروں گا؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا آپ ہیک اور ڈک کی مانند کوئی کام میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں مسٹر سوما؟"

"احمقانہ انداز میں مت سوچو' تمہاری حیثیت ان سے مختلف ہے' میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے انہیں ان کی زندگی کی پوری پوری قیمت ادا کر دی تھی جبکہ تم میرے دوستوں میں شامل ہو' ٹھیک ہے تم نے میرے ساتھ اس انداز میں تعاون نہیں کیا جیسے

میں چاہتا تھا' پھر بھی تم سے انسیت رکھتا ہوں' یہاں سکون سے رہو میرے دوست' تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

اور میں صرف ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے خلاف میرے دل میں جو نفرت تھی اسے تو کوئی نہیں نکال سکتا تھا لیکن میں خاموشی کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ خود کو ذلیل و خوار کرنے سے کیا فائدہ۔ کئی دن مزید گزر گئے۔ اب یہاں رہنا میں نے اپنی عادت بنالی تھی۔ چہل قدمی بھی کر لیتا تھا لیکن اس ویرانے سے باہر جانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ آنکھیں کھونے کے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک شام میں عمارت کے ایک حصہ میں ایک ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ خاموش اور سوچ میں گم۔ میری زندگی میں جو ویرانے در آئے تھے' ان سے نجات تو اس زندگی میں ممکن نہیں تھی۔ موت چونکہ میرا مقدر بن گئی تھی اور میں تقدیر کے خلاف زندگی کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ اس لئے مجھے اس دوڑ کی سزا مل رہی تھی۔ دفعتاً مجھے اپنی پشت پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ ہو گا کوئی۔ میں نے لاپرواہی سے سوچا اور پھر مجھے اپنے قریب وہی نسوانی آواز سنائی دی جو میں پہلے سن چکا تھا۔

"ارے تم یہیں موجود ہو۔" اس نے کہا اور پھر شاید وہ میرے سامنے آ گئی۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ "نہیں نہیں۔ آہ نہیں!" وہ شاید رو پڑی تھی۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ آہ یہ کیا ہو گیا۔" اس نے میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر میرا رخ اپنی جانب کیا اور پھر بے اختیار مجھے سینے سے بھینچ لیا۔ بڑی بے اختیارانہ کیفیت تھی اس کے انداز میں۔ میں نے بھی تعرض نہ کیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کے درمیان وہ کہتی جا رہی تھی۔

"کہا تھا نا میں نے تم سے' بھاگ جاؤ لیکن نہ سنی تم نے۔ پاگل سمجھا تھا نا۔ دوسروں کی مانند۔ کیوں نہیں گئے بتاؤ۔ کیوں نہیں چلے گئے یہاں سے؟" وہ روتی رہی۔

درحقیقت میرے ذہن میں اب اس کی باتیں آ رہی تھیں۔ بلاشبہ اس نے مجھے چلے جانے کے لئے کہا تھا لیکن سوما نے اسے پاگل قرار دیا تھا اور اس وقت میں نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے شاید میرا چہرہ اپنے چہرے کے مقابل کیا۔ مجھے دیکھتی رہی اور پھر غمزدہ لہجے میں بولی۔

"آہ کس قدر بدنما کر دیا تمہارا چہرہ۔ کیسی حسین آنکھیں تھیں لیکن اب کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ بتاؤ اب میں تمہارے لئے کیا کروں؟"

"شکریہ سونی۔ تمہاری ہمدردی نے مجھے کافی سکون بخشا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"لیکن میرا سکون ختم ہو گیا ہے' پپا جو کچھ کرتے رہے وہ مجھے سب ناپسند تھا لیکن انہوں نے یہ جو کیا ہے اس پر.......... اس پر میں انہیں معاف نہیں کر سکتی۔" اس نے مسلسل روتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے سونی؟"

"کس بارے میں؟"

"جو کچھ تمہارے پپا کرتے رہے ہیں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"کیا تم نے کبھی ان سے اس بات پر اختلاف کیا؟"

"ہاں میں سخت احتجاج کرتی رہی ہوں۔"

"ظاہر ہے سوما نے تمہاری بات قبول نہیں کی ہو گی؟"

"ہاں پپا بہت سنگدل ہیں لیکن انہوں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ اس پر میں انہیں معاف نہیں کروں گی۔"

وہ پھر رونے لگی اور میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس لڑکی کو آلہ کار بنایا جائے اور اس سے سوما کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ میں سوما سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کم بخت نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا' وہ بے حد بھیانک تھا۔ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا لیکن اب اگر یہ لڑکی مجھ سے تعاون پر آمادہ ہو جائے تو شاید اس خبیث بوڑھے کے خلاف کچھ کر سکوں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ متاثر ہے ورنہ کسی کے لئے آنکھوں میں آنسو کہاں آتے ہیں۔

"سونی تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے نا؟"

"ہاں میں تم سے متاثر ہوں۔ ان سارے دنوں میں مسلسل کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح اگر مجھے قید سے رہائی مل جائے تو میں تم سے ملاقات کروں لیکن مشکل ہو گیا تھا۔ آج بڑی مشکل سے ہیگ کو دھوکا دے کر بھاگی ہوں۔ اسے پتہ بھی نہیں چل سکا۔ کھانا دینے کے بعد اس نے میرے قید خانے کا دروازہ حسب معمول بند کر دیا۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ میں چپ چاپ دروازے سے نکل آئی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں تلاش کرتی

رہی اور بڑی دیر سے تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔"

اس نے پھر ایک سسکی لی اور میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تو کیا تمہیں قید رکھا جاتا ہے؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے پپا کے کام سے اختلاف ہے۔ میں نے ان سے کھل کر کہہ دیا تھا کہ میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اس پر انہوں نے مجھے پاگل قرار دے کر قید کر دیا۔"

"اوہ سوما بے حد سنگدل ہے؟" میں نے کہا۔

"تم پپا کے چنگل میں کیسے پھنس گئے تھے؟" اس نے پوچھا اور میں نے مختصراً اپنی کہانی سنا دی۔

"اوہ۔ تو پپا اتنے دن تک جو غائب رہے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے کام میں مخلص ہیں لیکن ان کی یہ جذباتیت شدت پسندی کی حدود میں داخل ہو گئی ہے۔ تم غور کرو کہ اگر وہ اپنے تجربے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو دنیا کو کیا مل جائے گا۔ کیا ساری دنیا سے اندھوں کا وجود نہیں ختم ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو کائنات میں رہ کر حسین کائنات کی دید سے محروم ہیں' کیا وہ خود کو ایک نئی دنیا میں نہیں محسوس کریں گے۔ اس کے بعد ان کے دلوں میں پپا کی کیا حیثیت ہو گی۔ کیا احترام ہو گا۔ اس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے' مجھے اعتراف ہے لیکن بات ان کی آنکھوں کی تھی۔"

"جب انہیں کوئی نہ ملا تو انہوں نے خود اپنی آنکھیں اپنے تجربے کی نذر کر دیں۔"

"لیکن اس کے بعد سوما کو مشکلات کتنی پیش آئی ہوں گی؟"

"اوہ کسی کو معلوم نہیں' صرف مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے لئے ایک خاص انتظام کیا ہے۔" سوئی نے کہا اور اسی وقت عقب سے سوما کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"آج پھر تیرا دماغ پھر گیا ہے سوئی۔ تُو کیوں چاہتی ہے کہ میں تجھ پر تشدد کروں؟"

"نہیں پپا۔ آج میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" سوما کا انداز کسی قدر بدل گیا۔ "کیا باتیں کرنا چاہتی ہے؟"

"میری سوچ میں معمولی سا فرق آگیا ہے پپا۔"

"اوہ۔ تو پھر اندر چلو۔" سوما نرم لہجے میں بولا۔

"یہاں کیا حرج ہے! مسٹر آصف کو یہی سمجھا رہی تھی۔" سوئی نے کہا اور میں ایک لمحے کے لئے چونک پڑا حالانکہ لڑکی نے مجھ سے گفتگو نہیں کی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ وہ سوما کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ چنانچہ میں بھی تعاون پر آمادہ ہو گیا۔

"کیا بتا رہی تھیں؟"

"یہی کہ اب تک میں نے پپا سے اختلاف کیا تھا لیکن اگر گہری نگاہوں سے جائزہ لیا جائے تو پپا کا مقصد عظیم ہے۔ اندھے انسان کو آنکھیں مل جانا کتنی بڑی بات ہو گی۔ میں نے جو پپا سے اختلاف کیا تھا وہ صرف اس لئے تھا کہ مجھے زندہ انسانوں سے ہمدردی تھی لیکن بہرصورت یہ بات اب میری سمجھ میں آگئی ہے کہ وسیع تر مفاد کے لئے کچھ قربانیاں دینا ہی ہوتی ہیں۔ اگر اس تجربے کی کامیابی کے لئے کچھ انسانوں کو تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے تو وہ بہرحال تعمیری حیثیت رکھتی ہے۔"

"یقیناً.......... یقیناً۔" سوما نے خوش ہو کر کہا۔

"پپا میں پیش کش کرتی ہوں کہ اب تمہارے تجربے کے لئے میری آنکھیں بھی کام آجائیں تو میں تیار ہوں۔"

"اوہ ہاں' ہاں۔" میں نے سوما کی آواز میں نمایاں لرزش محسوس کی۔ ظاہر ہے یہ اولاد کا معاملہ تھا۔ وہ اس کی اکلوتی بچی تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنی آنکھیں دے سکتا تھا لیکن اپنے جگر گوشے کے ساتھ یہ سلوک کس طرح ممکن تھا۔

"آؤ' آؤ میرے ساتھ آؤ۔" اس نے سوئی سے کہا اور پھر معذرت آمیز انداز میں بولا۔

"مسٹر آصف! مجھے امید ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گے۔"

پھر میں نے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ صورتِ حال کسی حد تک میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ لڑکی نے یقیناً چال چلی تھی۔ ظاہر ہے وہ سوما سے متفق نہیں تھی لیکن اس نے جو فوری طور پر پلٹا کھایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوڑھے سوما سے فریب کرنا چاہتی ہے۔

بہرحال میں تھوڑی دیر تک میں وہیں بیٹھا رہا اور پھر اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ مجھے اس قدر اندازہ ہو چکا تھا کہ میں عمارت کے کسی حصہ سے اپنی رہائش گاہ پر واپس آجاؤں۔ میں اپنے کمرے میں آکر مسہری پر لیٹ گیا۔

دن اور رات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اب تو سب دن تاریک تھے اور ساری راتیں سیاہ۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ چائے آئی اور چائے پینے کے بعد میں چہل قدمی کے لئے نکل آیا۔ ایک محدود دنیا تھی' اس کے سوا کچھ نہ تھا اور اس محدود دائرے میں کچھ وقت گزارنے کے بعد میں پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

اور اس وقت شاید رات ہو چکی تھی جب مجھے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔

"ہیک!" میں نے پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ "ڈک؟" لیکن آنے والا ڈک بھی نہیں تھا۔ پھر دروازہ شاید اندر سے بند کر دیا گیا۔ میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ کون ہو سکتا ہے! تب مجھے اپنے شانے پر ایک ہاتھ محسوس ہوا اور یہ ہاتھ سونی کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ تب مجھے سونی کی آواز سنائی دی۔

"آصف!"

"اوہ۔ سونی؟"

"ہاں۔ میں ہی ہوں۔"

"اس وقت؟.......... شاید رات ہو چکی ہے۔"

"ہاں۔"

"کیا سوما سو چکا ہے؟"

"نہیں۔ وہ اس وقت اپنی تجربہ گاہ میں ہیں۔"

"اوہو۔ تو کیا تم قید سے فرار ہو کر آئی ہو؟"

"نہیں۔ مجھے قید نہیں کیا گیا۔ صبح کی چال کارگر رہی۔"

"اوہ۔ تو میرا اندازہ درست تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیسا اندازہ؟"

"صبح کو جب تم نے سوما سے گفتگو کی تھی تو میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ تم سوما کو شیشے میں اتار رہی ہو۔"

"ہاں آصف! پپا اس سلسلے میں بہت ہی شدت سے سوچنے کے قائل ہیں لیکن میں تم سے یہ کہنے میں عار نہیں محسوس کرتی کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ پپا اب مکمل طور پر ناکام ہو جائیں تاکہ انسانی زندگیاں یوں خاک میں نہ ملیں۔" سونی نے کہا۔

"اوہ۔ کیا تمہارے خیال میں سوما اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا؟"

"یہ کوشش ایک دیوانگی ہے۔"

"کیا تم یقین کرو گی سونی کہ میں بہر حال دل سے سوما کے جذبے کی عظمت کا قائل ہوں۔"

"ہاں آصف! پپا برے انسان نہیں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"لیکن وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ انداز شدت پسندی میں بدل گیا ہے۔ کون جانے کب وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوں' اور اس وقت تک کتنی زندگیاں برباد ہو جائیں۔ اگر وہ کامیاب نہ ہو سکے تو پھر یہ لوگ ہمیشہ اندھے رہیں گے۔ میں اب کسی اور کو اندھا دیکھنا نہیں چاہتی آصف۔ اب میں کسی اور کو پپا کی دیوانگی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔"

"لیکن سوما کرتا کیا ہے؟ کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

"ہاں۔"

"مجھے بتاؤ۔"

"وہ انسانی آنکھوں کا لعاب الگ الگ کر لیتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر لعاب کا انہوں نے ایک خصوصی محلول تیار کیا ہے۔ یہاں ایک اور انسان ہے جسے تم نے نہ دیکھا ہو گا۔"

"اوہ۔ وہ کون ہے؟"

"اس بدنصیب کا نام جوزف ہے۔ پپا کا پرانا ساتھی۔ پپا نے سب سے پہلے اس کی آنکھیں نکالی تھیں اور اب وہ اس کی آنکھوں پر تجربہ کر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کاش تم دیکھ سکتے۔"

"ہاں اب تو میں نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"نہیں آصف! تم دیکھ سکو گے۔" سونی نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میں اس کے لہجے پر غور کرنے لگا۔ اس لہجے میں محبت تھی' خلوص تھا' امید تھی۔

"نہ جانے کب۔ یا شاید کبھی نہیں۔"

"نہیں آصف! میں تمہاری مدد کروں گی۔"

"لیکن کس طرح؟"

"ابھی نہیں بتاؤں گی۔"

"تمہارے الفاظ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے سونی۔ بہرصورت کوئی بات نہیں' میں انتظار کروں گا۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا کرے میں تمہیں پھر سے دیکھ سکوں۔ اس وقت جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تمہاری کیفیت دوسری تھی۔ میرے ذہن میں تمہارے لئے وہ جگہ نہیں تھی جو اب تم نے قائم کرلی ہے۔"

"آصف!" سونی نے میری گردن میں بانہیں ڈال دیں اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے پہلی بار کسی دوشیزہ کے ہونٹوں کی حلاوت چکھی تھی اور میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ سونی جلدی سے میرے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکل گئی اور میں خیالات میں گم ہوگیا۔ سونی کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت تھی' جسے میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ بہرصورت یہ لڑکی مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔

اور پھر وہ رات میں نے عجیب و غریب خیالات میں گزار دی۔ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ دوسرا دن بھی حسب معمول تھا۔ سونی دن بھر میرے پاس نہیں آئی اور میں حسب معمول کھنڈرات میں ٹھوکریں کھاتا رہا لیکن شام جس کے بارے میں' میں صرف اندازہ کر سکتا تھا' جب آئی تو سونی بھی میرے پاس پہنچ گئی۔

"آصف!" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"اوہ سونی' تم آگئیں؟"

"ہاں۔ کیا تم میرا انتظار کر رہے تھے؟"

"دن بھر انتظار کرتا رہا ہوں سونی۔" میں نے اداس آواز میں کہا اور وہ میرے سینے سے آ لگی۔ بڑی شدت پسند لڑکی تھی۔ جذبات کے اظہار میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتی تھی۔ اس وقت وہ جس شدت سے لپٹی تھی' اس میں بڑی اپنائیت' بڑی چاہت تھی۔ میں نے کچھ نہ کہا اور اس نے میرے سینکڑوں بوسے لے ڈالے۔

"آصف۔ میں تمہیں جس حیثیت سے چاہنے لگی ہوں' اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔"

"میں بھی سونی!" میں نے جواب دیا۔

"دیکھو میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔"

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اور سونی نے کوئی چیز میرے ہاتھ میں تھما دی۔

آہ۔ ٹٹول کر ہی چیزوں کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا' بڑے بڑے شیشوں والی کوئی عینک تھی۔

"چشمہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اسے لگاؤ۔"

"کیوں؟"

"بس میں کہہ رہی ہوں' اسے لگاؤ۔" سونی نے کہا۔

اور میں نے صرف اس کی خاطر عینک اپنی مکروہ آنکھوں کے گڑھوں پر چڑھا لی۔ بھلا فائدہ بھی کیا تھا۔ سوائے ایک نقص چھپانے کے وہ اور کیا کام دے سکتی تھی۔

"آصف..........!" سونی نے مجھے چومتے ہوئے کہا۔ "کچھ محسوس ہوا؟"

"کیا سونی؟"

"اوہ.......... تم میرے بارے میں تصور کرو۔ سوچو میرے بارے میں.......... پلیز آصف! جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔"

اور میں نے سونی کے کہنے پر عمل کیا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا' اور پھر یہ روشنی بڑھتی چلی گئی۔ یوں لگتا تھا' جیسے اس روشنی کا تعلق دماغ سے ہو۔ میں سونی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور پھر میرا دل دھک سے ہوگیا۔ سونی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔

یہ کیسے ممکن تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا! "سونی۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیئے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ "سونی مجھے یقین نہیں آ رہا۔ خدا کے واسطے مجھے بتاؤ۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیوں ہے؟"

"آصف یہ ایک مخصوص عینک ہے۔ میرے پپا کی ایجاد۔ وہ اسے تصور کی عینک کہتے ہیں۔ جب انہوں نے اپنی آنکھیں نکالنے کا فیصلہ کا تو اس بات کا بھی بندوبست کیا کہ ان کے کام میں رکاوٹ نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسی عینک ایجاد کی جو آنکھوں کا نعم البدل ہو۔ وہ اسے آنکھوں پر لگا کر ہی تمام کام کرتے ہیں۔ بات صرف میری ذات تک محدود نہیں ہے' تم اسے لگا کر کہیں کا تصور کرلو تمہاری نگاہوں کے سامنے ہوگا۔"

"واقعی؟" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔" سونی نے جواب دیا اور میں نے سوما کی لیبارٹری کے بارے میں سوچا اور وہ

ہال میری نگاہوں میں گھوم گیا جس کی میں نے صرف چھت دیکھی تھی اور جہاں میری آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ چاروں طرف مشینیں نصب تھیں۔ ان میں عجیب عجیب سیال کھول رہے تھے۔ ہیگ اور ڈک لیبارٹری کے کام میں مصروف تھے۔ البتہ سوما ایک کرسی پر خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے ہیگ کو آواز دی اور ہیگ کسی آنکھوں والے ہی کی مانند اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

حیرت کی بات تھی کہ مجھے ان سب کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ عجیب پُراسرار عینک تھی۔ سوما نے ہیگ سے کوئی چیز طلب کی اور ہیگ نے ایک چھوٹے سے بلوریں پیمانے میں ایک نیلالا سیال اس کے سامنے رکھا۔ تب سوما نے ایک ڈراپر سے سیال کھینچا اور اس کے چند قطرے اپنی دونوں آنکھوں میں ٹپکا لئے۔ اس کے بعد وہ دونوں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ میں دیوانوں کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ............ یہ صرف تصور کا کمال تھا۔ حیرت انگیز بات تھی۔ اور میں اس دلچسپ عینک میں کھو گیا۔ سونی چند لمحے کے لئے میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ پھر میں نے واشنگٹن کا تصور کیا اور امریکی صدر کے بارے میں سوچا۔ رچرڈ نکسن وہائٹ ہاؤس میں اپنے خوبصورت آفس میں فائلوں پر جھکا بیٹھا تھا۔ فیڈل کاسترو ٹیلویژن کے لئے اپنی تقریر ریکارڈ کرا رہا تھا۔ چیئرمین ماؤ قوم کے نام کسی پیغام کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

آہ۔ کیسی حیرت انگیز چیز تھی۔ کیسی عجیب و غریب۔ میں نے پھر سونی کو دیکھا اس کے سرخ لباس کے بٹن میری نگاہوں کے سامنے آگئے اور پھر سرخ لباس کے نیچے چمکدار سفید جلد' پھر کچھ اور نیچے سرخ سرخ گوشت پسلیوں کے درمیان دھڑکتا ہوا دل صاف نظر آرہا تھا۔

نگاہیں کچھ اور پیچھے ہٹ گئیں اور اس کی پشت کے پیچھے کی دیوار صاف نظر آئی' میرا دماغ چکرانے لگا تھا۔ میں نے گھبرا کر عینک اتار دی۔

"سونی' یہ عینک' یہ عینک............"

"یہ اب تمہاری ہے۔" سونی نے کہا۔

"میری؟ میری۔" میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"ہاں! میں تمہاری آنکھیں تو نہیں واپس کر سکتی' لیکن یہ عینک اب تمہاری آنکھوں کا بدل ہے۔"

"لیکن سوما؟"

"پپا نے جو کچھ کیا ہے وہ اس کے لئے خود بھگتیں گے۔"

اور میں دیر تک خالی خالی انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ بالکل نہیں محسوس ہوا تھا کہ میری آنکھوں کے حلقے بالکل خالی ہیں ہر چیز صاف نظر آرہی تھی' پھر میں نے کہا۔

"لیکن تمہارے پپا اسے تلاش تو کریں گے۔ تم یقیناً اسے چھپا کر لائی ہو گی؟"

"ہاں آصف! اور اسی کے لئے میں نے پپا سے گفتگو شروع کی تھی۔" سونی کافی دیر تک میرے پاس رہی اور پھر چلی گئی۔

لیکن میرے لئے وہ حیرت کا سمندر چھوڑ گئی تھی' جس جگہ کا تصور کرو چشم زدن میں نگاہوں کے سامنے۔ دیواروں کے پار بھی دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ ایک ایسی بیش بہا چیز مجھے مل گئی ہے جس کے بارے میں پوری طرح سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن اب کیا کروں' اس بیش بہا چیز کو کس طرح استعمال کروں' کیا یہاں سے فوراً نکل بھاگوں۔ عقل ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ حواس کام نہیں کر رہے تھے' مسہری پر لیٹ گیا۔ عینک اٹھا کر سینے میں چھپا لی' اب یہ میرے لئے بیش بہا تھی' سونی چلی گئی تھی' لیکن اب مجھے یہاں ٹھہرنا دو بھر محسوس ہو رہا تھا۔ خاموشی سے مسہری سے نیچے اتر آیا۔ دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔

دروازے سے باہر نکلا اور اچانک ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ سونی' محبت کرنے والی لڑکی ہے' جس نے میرے لئے اپنے باپ کے خلاف کام کیا تھا' وہ تو سوما کی دیوانگی کی شریک بھی نہ تھی' اگر میں سوما کے ہتھے چڑھ گیا تو اس میں سونی کا کیا قصور تھا۔

لیکن وہ بے چاری اپنے باپ کے کرتوتوں سے شرمندہ تھی۔ سوما۔ میں نے بوڑھے خبیث کے بارے میں سوچا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگی برباد کرے گا۔ کیوں نہ میں سونی کو یہاں سے نکال لے چلوں اور پھر پولیس کو بوڑھے کے کرتوتوں کے بارے میں اطلاع دے دوں۔ یہی عمدہ ترکیب ہے۔ اس طرح وہ کیفر کردار کو پہنچ جائے گا لیکن اس کے ساتھ ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں آیا۔ اگر بوڑھا گرفتار ہو گیا تو میرے بارے میں بھی پولیس کو اطلاع دے دے گا' لیکن مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے۔ میں تو یوں بھی مجرم تھا اور پولیس بہرحال میری تلاش میں ہو گی۔ مجھے پولیس سے روپوش ہونا ہی ہے۔ پہلے بوڑھے کا قصہ پاک کر دیا جائے۔

میں اپنے فیصلے پر پوری طرح عمل کرنے کے لئے تیار ہو گیا اور پھر میں سونی کی تلاش میں چل پڑا۔ سونی کا کمرہ تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اس وقت وہ

اداس سی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔

"سونی۔" میں نے اسے مخاطب کیا اور وہ چونک پڑی۔

"اوہ۔ آصف آپ؟"

"حیران کیوں ہو گئیں سونی؟"

"حیران نہیں خوش ہوئی ہوں۔ خدا کا شکر ہے تم کسی حد تک اپنی آنکھوں کی کمی پوری کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"ہاں سونی' اور یہ تمہاری مہربانی سے ہے ورنہ۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"میرے پپا نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا تھا نا؟"

"اوہ۔ تو اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟" میں نے اس کی دلجوئی کی۔

"میرے پپا کا تو ہے۔" اس نے اداسی سے جواب دیا اور پھر کئی منٹ کی خاموشی چھا گئی۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر جب وہ کئی منٹ تک نہ بولی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

"لیکن اب تم نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے سونی؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ کیا مجھے اسی طرح زندگی گزارنی ہو گی؟"

"پھر میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

"میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں لیکن تنہا نہیں۔"

"پھر؟"

"تم بھی میرے ساتھ چلو گی سونی۔"

"کہاں؟"

"اس ویرانے سے دور۔ سوما کی پُرہوس دنیا سے بہت دور۔ بے شک میں اس کے جذبے سے بہت متاثر ہوں لیکن وہ بھٹک گیا ہے اور اس بھٹکے ہوئے انسان کو راہ پر لانا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ کیا تم سوما کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہو؟"

"آصف' ساری خرابیوں کے باوجود وہ میرا باپ ہے میں اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے سونی لیکن میں یہاں تو نہیں رہ سکتا۔ مجھے اجازت دو۔ میں اس ویرانے

میں زندگی کی تلاش میں آیا تھا اور روشنی کھو کر جا رہا ہوں۔ ہاں تمہاری مہربانی نے جو کچھ مجھے دے دیا ہے وہ جب تک میری زندگی کے کام آئے گا۔ تمہاری یاد میرے سینے میں رہے گی اور شاید اس کے بعد بھی۔"

"لیکن آصف تم یہاں سے جا ہی کیوں رہے ہو' یہاں میں ہوں۔ کیا میری ذات تمہارے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی؟ دو محبت کرنے والے جس جگہ یکجا ہو جائیں وہ ویرانے آباد ہو جاتے ہیں۔ تم یہیں رہو میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"لیکن سونی سوما مجھے پسند نہیں کرے گا۔ وہ بے حد چالاک ہے۔ اسے یقیناً احساس ہو جائے گا اور وہ ہمارے درمیان آنے کی کوشش کرے گا۔"

"تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو میں ان سے نمٹ لوں گی۔"

"لیکن اگر اسے عینک کی گمشدگی کا علم ہو گیا تو؟"

"ظاہر ہے وہ برآمد نہیں کر سکیں گے۔"

"یہ تمہاری حماقت ہے سونی۔ سوما اتنا احمق نہیں ہے۔ تم اسے دھوکہ نہیں دے سکتیں۔"

"آستین کے سانپ!" دروازے پر کھڑے سوما کی آواز آئی۔ ہم دونوں وحشت سے اچھل پڑے۔ خونخوار سوما اپنی بھیانک شکل لئے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ہیگ اور ڈک بھی موجود تھے اور اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ساری گفتگو سن چکا تھا اور عینک کے بارے میں اسے معلوم ہو چکا تھا چنانچہ اس سے کچھ چھپانے کی کوشش بے سود تھی لیکن اب کیا کرنا چاہئے۔

"مجھے احساس نہیں تھا کہ تم اس قدر سازشی ثابت ہو گے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو مجھے۔ تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ٹھیک ہے میں موت کے قریب تھا تم نے مجھے زندہ رہنے کا مشورہ دیا لیکن روشنی کے بغیر زندگی بے معنی ہے اس سے تو موت کی تاریکی ہی بہتر ہے۔ بتاؤ دنیا میں میرا کیا مقام ہے۔ جواب دو میں کیسے زندہ رہوں۔ کیا تم سازشی نہیں ہو۔ تم نے مجھے فریب دیا۔ زندگی کے قریب لا کر مجھے دھوکے سے جہنم کی تاریکیوں میں دھکیل دیا۔ کیا حق تھا تمہیں اس کا اور اب اگر میں نے سازش کی ہے تو تم اس پر حیران کیوں ہو۔"

"آصف خان میں زندگی کی تمام قدروں سے بے نیاز ہوں میں اخلاقیات سے مستثنیٰ

ہوں۔ میں نے صرف اس لئے یہ بات کہہ دی تھی کہ تم مجھے دوست سمجھتے تھے۔ میرے دوست' یہ دنیا کسی بھی صاحب فن کی قدر اس وقت تک نہیں کرتی جب تک اس کا فن اس کے کام نہ آسکے لیکن فن کو تکمیل کی منزل تک پہنچانے کے لئے بہت سے کٹھن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اور ان کٹھن مراحل میں کوئی فنکار کا ساتھی نہیں بنتا۔ سب دور سے دیکھنے والے ہوتے ہیں اور اگر فنکار دلدل میں پھنس کر دم توڑ دے تو دیکھنے والے قہقہے لگا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہاں اگر وہ اسے منزل پر پالیں تو پھر خود کو اس کا ساتھی بناتے ہیں۔ کہتے ہیں ہاں ہم اس کے نزدیک تھے مگر میری سوچ مختلف ہے۔ میں قرب کی بھیک نہیں مانگتا۔ میں بازو پر اپنی انگلیوں کی مضبوط گرفت قائم کرتا ہوں اور اسے نزدیک کھینچ لیتا ہوں تاکہ قریب آنے والا کچھ نہ کہہ سکے۔ میں تو زبان بند کرنے کا قائل ہوں۔ مجھے کچھ بھی سمجھا جائے میرے بارے میں کچھ بھی سوچا جائے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔"

"لیکن تم بھول گئے سوما کہ مقابل بھی جیتی جاگتی زندگی کا مالک ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ ہاں تو فیصلہ کیئے لیتے ہیں۔ آؤ میں واپس تمہیں موت کی منزل پر پہنچا دوں۔" سوما نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے پھر سونی کو مخاطب کر کے بولا۔ "سونی تو میری بیٹی ہے۔ میں تیرا باپ نہیں ماں بھی ہوں۔ تیری رگوں میں میرا خون ہے۔ ہمارے درمیان اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن کیا تو اس خون کو کسی دوسرے کے ہاتھوں بہتے دیکھنا پسند کرے گی؟"

"تم خود غرض ہو پپا۔ تم قانونِ قدرت میں ترمیم کرنا چاہتے ہو۔ ہم سب مشیت کے محکوم ہیں۔ خدا کسی کو اندھا کرنا چاہتا ہے تو اسے اندھا کر دیتا ہے ہم اسے روکنے والے کون۔ تم صرف اپنی شہرت چاہتے ہو پپا اور تم اسی کے لئے ساری جدوجہد کر رہے ہو۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔ میں اب آصف کے ساتھ ہوں۔"

"اوہ۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد تو دیکھے گی کہ آصف اس دنیا میں نہ ہو گا لیکن اس کے بعد میری ہمدردی تیرے ساتھ نہ ہو گی۔" بوڑھے نے کہا اور پھر مجھے زور سے آواز دی۔

"آصف!"

اور میں بے اختیار بول پڑا۔ یہ میری غلطی تھی کیونکہ خونخوار بوڑھے نے میری آواز پر میری سمت کا تعین کر لیا تھا اور پھر اس نے وحشیانہ انداز میں میرے اوپر حملہ کر

دیا۔

لیکن مصنوعی آنکھیں سونی کا دیا ہوا عطیہ میرے کام آگیا۔ میں نے فوراً چھلانگ لگا کر اس کا وار خالی کر دیا اور بوڑھا دیوار سے ٹکرایا لیکن وہ بے حد پھرتیلا تھا۔ میرے قدم جونہی زمین پر ٹکے اس نے پلٹ کر قدموں کی چاپ پر چھلانگ لگا دی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر دبوچنے کی کوشش کی لیکن میرے لئے بھی یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں نے پھر اس کا وار خالی کر دیا اور ایک زور دار گھونسہ اس کی ناک پر جڑ دیا۔ بوڑھا چکرا گیا تھا لیکن پھر وہ ایک دم رک گیا اور پھر اس نے مضطربانہ انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بزک' ہیگ اس پر حملہ مت کرنا۔ عینک اس کے پاس ہے کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے۔" اور پھر وہ کھڑا ہو کر بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔ "دیکھو عینک کو نقصان نہ پہنچنے پائے میں تم سے جنگ نہیں کروں گا۔ عینک مجھے واپس کر دو۔ یہ میری زندگی کی سب سے اہم چیز ہے میں اس کے بغیر کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میری کامیابی کا انحصار اسی پر ہے۔"

میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں جس طرح دو بار اس کے حملوں سے بچا تھا اس سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ عینک میری آنکھوں پر موجود ہے اور اب یہ عینک میرے لئے بھی ایک اہم حیثیت رکھتی تھی۔

"میں تمہیں یہ واپس نہیں کروں گا ذلیل کتے' تو نے میری آنکھیں نکالی ہیں' تو نے میری زندگی تاریک کر دی ہے۔ میں تیرے سارے منصوبے خاک میں ملا دوں گا۔"

"نہیں نہیں ان منصوبوں کا صرف میری ذات سے تعلق نہیں ہے۔ یہ رفاہ عامہ کے لئے ہیں۔ مجھے عینک واپس کر دو۔ اس کے عوض مجھ سے جو چاہو طلب کر لو۔"

"تب پھر میری آنکھیں واپس دے دو میں چلا جاؤں گا۔"

"اوہ۔ آصف.......... آصف.......... ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ میری مجبوری سمجھو۔" بوڑھے نے لرزتی آواز میں کہا وہ جس قدر خونخوار ہو رہا تھا مجھے اس کا احساس تھا لیکن عینک کی وجہ سے بے بس تھا اور میں اس تاک میں تھا کہ جونہی دروازہ خالی ملے میں باہر چھلانگ لگا دوں۔ میں نے آہستہ سے سونی کو اشارہ کیا اور سونی آہستہ آہستہ دروازے کی جانب کھسکنے لگی۔ اس دوران میں نے بوڑھے کو باتوں میں لگا لیا۔ اس وجہ سے وہ سونی کے قدموں کی چاپ پر توجہ نہ دے سکا اور سونی بالآخر دروازے سے نکل گئی۔ میں نے سوما کو خاصی حد تک مطمئن کر دیا اور اب وہ مجھ سے مصالحت کی گفتگو کر رہا تھا اور اسی دوران مجھے موقع بھی مل گیا۔ بڑی ہی جچی تلی تھی میری چھلانگ بھی۔

پھر میں بھی سونی کے قریب پہنچ گیا۔ بوڑھا دھاڑتا ہوا ہمارے پیچھے بھاگا اور اس کے پیچھے ہیگ اور ڈک بھی' لیکن میں سونی کا ہاتھ پکڑے ہوئے بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ ہم کھنڈرات نما عمارت سے نکل آئے۔ سونی میرا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔

بوڑھا طاقتور ضرور تھا لیکن بہرحال دوڑنے میں ہمارا مقابل ثابت نہ ہوا اور ہم اسے بہت پیچھے چھوڑ آئے۔ پھر ہم نے گڑھی صباحت خان پہنچ کر ہی دم لیا۔

اور اس کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ گڑھی صباحت خان ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ سیدھے سادے لوگوں پر مشتمل۔ ہم اس بستی میں ضم ہو گئے۔

میں جانتا تھا کہ ایک مفرور مجرم کی حیثیت سے کسی وقت بھی پولیس میری گردن ناپ سکتی ہے' اس کے لئے میں نے حلئے میں تبدیلی ضروری سمجھی۔ چنانچہ مسمات سونی جو عام طور سے مغربی لباس میں ملبوس رہتی تھی اب برقعہ پوش خاتون بن گئی تھی۔ میرے گالوں پر سیاہ گھنگریالی داڑھی بھی تھی۔ مسجد کے ایک مولوی صاحب نے ہم دونوں کو رشتہ حیات میں منسلک کر دیا تھا۔ میری حیثیت ایک درویش صفت انسان کی سی تھی۔ اکثر بیمار لائے جاتے اور میں ان کے جسم میں جھانک کر ان کی بیماری کی نشاندہی کر دیتا۔ گمشدہ لوگوں کے لئے ان کے ورثاء کو بتا دیتا اور یہ سب تصور کا کمال تھا۔ عینک میری بڑی ہی مددگار ثابت ہوئی۔ گو میری آنکھوں کی واپسی کا کوئی سوال نہ تھا لیکن عینک کی موجودگی ان کی کسر پوری کر دیتی تھی۔ یہ عینک مجھے اپنی بینائی کی مانند عزیز تھی۔ درحقیقت اگر یہ میری زندگی میں نہ ہوتی تو میں کیا تھا۔

لیکن میں نے زندگی کو یہیں تک محدود رکھنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ہاں کچھ وقت گزرنے کا منتظر تھا تاکہ پولیس کی فائلوں میں میرا ریکارڈ کافی پیچھے دب جائے اور میں وفا شعار سونی کے ساتھ زندگی کے لمحات کچھ اور خوبصورت انداز میں بسر کر سکوں۔ سوما کو میں نے معاف کر دیا تھا کیونکہ یہ سونی کی فرمائش تھی اور بہرحال وہ میری بیوی تھی۔

تقریباً چار سال میں نے سونی کے ساتھ بستی صباحت خاں میں بسر کئے اور پھر چھوٹی سی خوبصورت سی' ننھی سی نورین کے ساتھ ایک شہر کا رخ کیا۔ میرے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے جنہیں میں تکمیل تک پہنچانے کے لئے کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اس عجیب و غریب ایجاد سے میں پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جسے میں اس کی خصوصی صلاحیتوں کی بنا پر عینک کے بجائے "عینک" کہتا تھا۔ ہم نے ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کیا جس کی حیثیت بڑی پُراسرار تھی۔ ہم لوگ ڈاکٹروں کو ان کے مریضوں کی بیماریوں کی

شناخت میں مدد دیتے تھے۔ جن کی بیماریاں نامعلوم ہوتی تھیں۔

ہم ایسے لوگوں کی بھی امداد کرتے تھے جنہیں کسی کا پتہ معلوم کرنا ہوتا تھا۔ ان کے حالات معلوم کرنا ہوتے تھے۔ اکثر پولیس کے لوگ ہمارے پاس مفرور مجرموں کی تلاش کے سلسلے میں آتے تھے۔ ایک عجیب سی پُراسرار سی حیثیت مل گئی تھی مجھے' اور بہر صورت ان تمام کاموں سے آمدنی بھی نہایت مناسب تھی۔ میں نے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے ملازم بھی رکھے تھے جن کے بارے میں یہ اظہار کرتا تھا کہ میرے لئے کام کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ اس طرح بینائی کھونے کے باوجود میری زندگی کو ایک مناسب سہارا مل گیا تھا اور یہ سہارا تھی میری عینک' لیکن تم جانتے ہو زمانہ کس قدر حاسد ہے اور وقت کس قدر سنگ دل۔ ہمارا سکون آسمان کو پسند نہیں آیا۔ بے شمار حاسد پیدا ہو گئے تھے۔ ایک رات ہماری رہائش گاہ میں آگ لگا دی گئی اور ہم جل کر راکھ ہو گئے۔

"آگ لگا دی گئی؟" غلام شیر نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔" وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔

"وہ حاسد وہ دشمن کون تھے؟"

"ایسے کچھ ڈاکٹر جن کا کاروبار میری وجہ سے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔"

بہرحال افسوسناک کہانی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔ "تمہارا انتقال کیسے ہوا؟"

"انتقال......... میرا انتقال کہاں ہوا۔ میں تو زندہ ہوں۔" غلام شیر نے کہا اور وہ چونک پڑا۔

"کیا۔ کیا بکواس کر رہے ہو۔ زندہ ہو؟"

"ہاں دوست۔ میرا جسم چوری ہو گیا ہے اور میری روح........." غلام شیر نے کہا اور وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا۔

"غیرت نہیں آتی۔ زندہ ہو کر مُردوں میں آگھسے ہو۔ بے غیرت بے شرم دفع ہو جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے دوڑا اور قبر میں گھس گیا۔ غلام شیر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

دور کہیں گیدڑوں کے رونے کی بھیانک آوازیں آ رہی تھیں۔ غلام شیر اداس سا وہاں سے اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

اسے کہتے ہیں انسان کا نہ دین میں رہنا نہ دنیا میں۔ میرا اچھوت غلام شیر کا جسم لے

کر فرار ہو گیا تھا اور اب وہ روح کی شکل میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ زندہ انسانوں میں اس کا گزر اس لئے نہیں تھا کہ وہ صرف ایک روح تھا اور مردہ انسان اسے زندہ سمجھ کر بھاگتے تھے۔ بہرحال یہ اس کی زندگی کا ایک دلچسپ تجربہ تھا جو اسے ہوا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ آخر کرنا کیا چاہئے۔ کسی کے سامنے جا کر اسے پریشان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ سب کچھ بے حقیقت لگ رہا تھا اس نے اپنا گھر بھی دیکھا تھا اپنے ماں باپ بھی دیکھے تھے۔ وقت سارے رشتے نگل جاتا ہے۔ وہ کسی کے ساتھ رحم یا انصاف نہیں کرتا۔ سب اپنے اپنے مطلب کے بندے ہیں لیکن انسان پر ایک ایسا وقت بھی آ جاتا ہے۔ جب وہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ایک روح کو بہت سی آسانیاں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن غلام شیر کی نہ تو عمر اتنی تھی نہ حالات اسے اجازت دیتے تھے کہ وہ من مانیاں کرتا پھرے۔ ایک ویران سے علاقے میں ایک پتھر پر بیٹھا ہوا وہ اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اسے ایک چیخ کی آواز سنائی دی اور وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تھوڑے فاصلے پر اسے کوئی متحرک نظر آیا۔ وہ تیزی سے اس طرف چل پڑا۔ تب اس نے ایک منظر دیکھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ جسم پر پیوند لگے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ لمبی سفید داڑھی اور چہرہ پُرجلال، اس کی پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا اور تھوڑے فاصلے پر ایک کالے رنگ کا سانپ تیزی سے دوڑتا نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے غلام شیر کو کیا سوجھی اس نے زمین سے ایک پتھر اٹھایا اور تاک کر سانپ کے پھن پر دے مارا۔ نشانہ بڑا شاندار تھا۔ سانپ کا پھن بری طرح کچل گیا۔ غلام شیر نے دوسرا پتھر اس کے منہ پر مارا اور سانپ بل کھانے لگا۔ اس کا پھن کچلا گیا تھا۔ تب ہی اسے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بزرگ اسے ہاتھ سے اشارہ کر کے بلا رہے تھے۔ غلام شیر کا دل ایک دم سے دھک سے ہو گیا۔ بزرگ کا انداز ایسا تھا جیسے انہوں نے غلام شیر کو دیکھا ہو۔ تبھی انہوں نے کہا۔

”آ جاؤ بیٹا! آ جاؤ کوئی بات نہیں ہے۔ آ جاؤ.......... تم نے موذی کو مار دیا بڑا اچھا کیا۔“ دوسرا خیال غلام شیر کے دل میں یہ آیا تھا کہ یہ بزرگ بھی کوئی روح ہے ورنہ اسے نہ دیکھ پاتے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح کے جسم پر بھلا سانپ کے کاٹے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کوئی خیالی جسم ہے پھر سانپ کا کاٹا اس پر بے اثر ہے۔ آخر کار وہ بزرگ کے پاس پہنچ گیا۔

”بیٹھو.......... بیٹھ جاؤ۔“

”ایک بات پوچھوں۔ میاں صاحب! کیا آپ مجھے دیکھ سکتے ہیں؟“

”ہاں بیٹے اللہ کے دیئے ہوئے علم کی روشنی میری آنکھوں کی بینائی ہے۔ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔“

”دوسرا سوال۔“ غلام شیر بولا۔

”تم ذرا ایک کام کرو۔ وہ سامنے۔ وہ اس طرف پیلے پھول والی ایک بوٹی نظر آ رہی ہے اس کے چودہ پتے توڑ لاؤ۔ جاؤ جلدی کرو۔“ غلام شیر نے فوراً ہی ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ چودہ پتے توڑ کر وہ بزرگ کے پاس گیا تو بزرگ نے کہا۔

”اور دوسرا کام یہ کرو کہ ان پتوں کو میرے اس زخم پر رکھو اور یہ اس رومال سے پٹی پھاڑ کر اس سے باندھ دو۔“ غلام شیر کو شدید حیرت تھی۔ ایک زندہ وجود اسے کیسے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو گیا تو بزرگ نے کہا۔

”تمہارا شکریہ بیٹے! بہرحال تم نے میری مدد کی ہے۔ یہ موذی اصل میں ایک مغرور موکل تھا جس نے مجھ سے دغا بازی کی تھی اور میں یہاں بیٹھا اس کے لئے چلہ کشی کر رہا تھا کہ اسے دوبارہ قبضے میں کروں۔ اس نے سرکشی کی تھی مجھ سے لیکن ابھی میں اپنا چلہ پورا بھی نہیں کر پایا تھا کہ اس نے سانپ بن کر مجھے کاٹ لیا اور فرار ہو رہا تھا۔ اگر وہ فرار ہو جاتا تو مجھے بڑا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ تم نے اسے ہلاک کر کے بہت سوں کو مشکل سے بچا لیا ہے۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے۔“ غلام شیر کی سمجھ میں کوئی بات نہ آ سکی تھی لیکن بزرگ کی روحانیت اسے بڑا متاثر کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

”آپ صاحب علم ہیں بابا صاحب۔ میں ایک بے بس اور بے کس انسان، پہلی بات آپ مجھے یہ بتایئے کہ کیا آپ مجھے دیکھ سکتے ہیں؟“

”ہاں بیٹے! پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اللہ نے آنکھوں کو کچھ بینائی عطا فرمائی ہے۔ تم یہی کہنا چاہتے ہو کہ تم ایک انسانی جسم کے بغیر ہو۔“

”ہاں بابا صاحب! اور یقیناً آپ کو یہ بات معلوم ہو گی کہ میں بے جسم ہوں، مردہ نہیں۔“ غلام شیر نے کہا اور اس بار بابا صاحب نے اسے چونک کر دیکھا۔ دیر تک دیکھتے رہے اور پھر ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ بولے۔

”ارے واہ! میں نے درحقیقت تمہیں ایک مردہ انسان کی روح سمجھا تھا لیکن اب تو بڑی دلچسپ بات کا پتہ چلا ہے۔ تم زندہ ہو مگر کیسے؟ تمہارا جسم کہاں ہے۔ بیٹھو۔ آؤ

میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ دیکھو میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اللہ نے مجھے روحوں کو دیکھنے کی طاقت عطا فرمائی ہے۔ کچھ ذمہ داریاں لگائی ہیں میرے سپرد جنہیں اپنی اوقات کے مطابق پوری کرنے کی کوششیں کرتا رہتا ہوں مگر مجھے واقعی یہ بات نہیں پتہ تھی کہ تم صرف بے جسم ہو۔ تم ایک دلچسپ شخصیت ہو۔"

"بابا صاحب! آپ مل گئے ہیں۔ میں آپ کو اپنے بارے میں بتائے دیتا ہوں۔"

"ہاں ہاں بتاؤ........ بتاؤ........" غلام شیر نے پوری تفصیل ان بزرگ کو بتا دی اور بزرگ نے آنکھیں بند کر لیں۔ دیر تک وہ سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر انہوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ دلچسپ حیرت انگیز بیٹا۔ اب یہ بتاؤ چاہتے کیا ہو؟"

"میں تو بے علم ہوں بابا صاحب! کچھ بھی نہیں جانتا میں۔ آپ کو اندازہ ہو گیا ہے میرے بارے میں بس یوں سمجھ لیجئے کہ تقدیر میں بھٹکنا لکھا ہے تو بھٹک رہا ہوں۔ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ بابا صاحب مگر اکتاہٹ پیدا ہو گئی ہے دل و دماغ میں۔ دنیا نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا ہے۔ بابا صاحب! میں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"دیکھو بیٹا! تقدیر کے قائل ہو؟"

"کیوں نہیں۔"

"تو پھر یہ سمجھو کہ تقدیر نے جو کچھ تمہارے لئے لکھا ہے وہی ہو گا۔"

"بابا صاحب! پہلی بات آپ یہ بتائیے کہ آپ نے جو میری داستان سنی۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"نہیں بیٹا! تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"تو پھر سزا میں کیوں بھگت رہا ہوں؟"

"میں نے کہا نا۔ یہ تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں اور ان فیصلوں کو کوئی بھی نہیں ٹال سکتا۔"

"تو پھر مجھے بتائیے میں کیا کروں؟ آپ بزرگ ہیں اللہ نے آپ کو علم کی روشنی دی ہے۔ مجھے کیسے جینا ہو گا؟ دیکھئے بابا صاحب! میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اتنا بے وقوف میں بھی نہیں ہوں۔ میں انسانوں کو تنگ کر سکتا ہوں۔ بہت سے کھیل کھیل سکتا ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا۔"

"جانتے ہو کیوں؟" بزرگ نے کہا۔

"نہیں جانتا بابا صاحب! بتائیے آپ۔"

"اس لئے کہ تقدیر یقینی طور پر تمہارے بارے میں روشن فیصلے کرے گی۔ تمہیں تمہارا جسم واپس مل جائے گا۔ اگر تم برائیوں کی جانب نکل جاتے تو پھر یہ کہا جا سکتا تھا کہ تمہارے ساتھ یہی ہونا چاہئے تھا۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"جی۔"

"جاؤ۔ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ تم جو سوچتے ہو کہ انسانوں کو نقصان پہنچاؤ تو یہی سوچتے ہو نا تم کہ بے جسم ہونے کا فائدہ اٹھاؤ گے؟"

"ظاہر ہے بابا صاحب۔"

"تو پھر ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اپنی اس بے جسمی سے لوگوں کو فائدے پہنچاؤ۔ کوئی دعا لگے گی تمہیں اور تمہارا جسم تمہیں واپس مل جائے گا۔ کیا سمجھے؟" غلام شیر گردن جھکا کر سوچنے لگا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"تو بتائیے۔ مجھے کیا کرنا چاہئے بابا جی؟"

"میرے ساتھ اپنا کچھ وقت برباد کرو گے؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ جیسے بزرگوں کے ساتھ زندگی بھر رہا جائے تو ایک لمحہ برباد نہیں ہو سکتا۔" بزرگ نے غور سے غلام شیر کو دیکھا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔"

وہ بزرگ جس جگہ غلام شیر کو لے کر گئے تھے۔ وہ ایک آبادی سے کچھ فاصلے پر ایک خانقاہ کی شکل میں تھی اور اس خانقاہ تک آنے کے لئے ایک بہت عمدہ سڑک بنی ہوئی تھی۔ جس کے دونوں طرف گہرائیاں تھیں۔ بابا صاحب اسی خانقاہ میں رہتے تھے۔ غلام شیر جب ان کے ساتھ خانقاہ میں پہنچا تو اس نے ان کے عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد دیکھی جو خانقاہ کے بیرونی حصے میں چھوٹے چھوٹے حجروں میں رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ خانقاہ کی صفائی ستھرائی میں وقت گزارتے تھے اور اس نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو اعلیٰ درجے کی گاڑیوں میں اپنی اپنی سواریوں پر' یا پیدل یہاں پر آتے تھے۔ ایک بلند سی جگہ تھی جہاں یہ خانقاہ بنی ہوئی تھی اور یہ سڑک گہرائیوں میں چلی گئی تھی۔ بہرحال وہ اس جگہ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔ وہاں موجود عقیدت مندوں نے بھی اسے دیکھا۔ بزرگ نے ان میں سے ایک کو کہا۔

"میاں عظیم اللہ! یہ ہمارے نئے مہمان آئے ہیں۔ انہیں آرام کے ساتھ ٹھہراؤ۔ ہم ان کے بارے میں مزید ہدایت بعد میں دیں گے۔ فی الحال انہیں حجرے میں ٹھہراؤ اور ان کے آرام کا مکمل بندوبست کرو۔"

عظیم اللہ نے گردن جھکا دی تھی۔ بزرگ خانقاہ میں چلے گئے اور غلام شیر، عظیم اللہ کے ساتھ چل پڑا۔ خانقاہ میں سے ایک حجرہ اسے دے دیا گیا تھا۔ یہاں واقعی تمام آسائشیں موجود تھیں۔ کھانے پینے کا انتہائی معقول بندوبست بھی تھا۔ عظیم اللہ ایک اچھا انسان تھا۔ غلام شیر کے ذہن میں تجسس پھوٹا پڑ رہا تھا اور ان بزرگ کے بارے میں معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ پتہ چلا کہ بزرگ کا نام فراست حسین ہے اور وہ کسی زمانے میں ایک بہت بڑے صنعت کار تھے۔ پھر ان پر کسی بیماری کا حملہ ہوا۔ نوجوان بیٹی دو بیٹے اللہ کو پیارے ہو گئے تو فراست حسین گوشہ نشین ہو گئے۔ بہت عرصے تک مساجد اور مزاروں پر دیکھے گئے اور اس کے بعد عظیم اللہ نے بتایا کہ انہیں کسی بڑے بزرگ کی بشارت ہوئی اور انہوں نے خانقاہ تعمیر کرائی۔ بس اس کے بعد سے یہیں رہتے ہیں۔ لوگوں کی مشکلات دور کرتے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے بہت سے مؤکل ان کے قبضے میں ہیں اور وہ اپنے مؤکلوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ تھی فراست حسین کی مختصر کہانی۔

غلام شیر یہاں آ کر بڑی دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔ ذرا سی بلندی پر خانقاہ کا اندرونی حصہ تھا۔ غلام شیر کے دل میں ایک عجیب و غریب تصور پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے ہیرا اچھوت کو دیکھا تھا۔ طویل عرصے وہ ان طلسمات کے چکر میں پڑا رہا تھا۔ گو اسے تعویذ گنڈوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن پھر بھی دل میں ایک تجسس تو ہر شخص کے لئے ہوتا ہے اور اس تجسس نے آدھی رات کے قریب اسے جگا دیا۔ وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا حجرے کے دروازے تک پہنچا اور پھر باہر آ کر خانقاہ کی جانب چل پڑا۔ اسے شدید تجسس تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ خانقاہ کسی قدر بلندی پر ایک پہاڑی ٹیلے پر تھی اور حجرے نچلی سمت۔ بہرحال خانقاہ کی ایک نیم پختہ کوٹھڑی فراست حسین کا مسکن تھی اور اس کے بارے میں عظیم اللہ نے بتایا تھا کہ اس کوٹھڑی میں لاتعداد روحیں ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ وہ لوگوں کی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے ان روحوں سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ غلام شیر کو عظیم اللہ کی بات پر یقین تھا۔ اس کی تو دنیا ایک دم بدل گئی تھی۔ اہل علم اور اہل نظر ہر کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ بزرگ فراست حسین تھے نہ۔ صرف یہ

کہ غلام شیر کے بے جسم وجود کو دیکھ لیا تھا بلکہ انہوں نے عظیم اللہ کی آنکھیں بھی روشن کر دی تھیں کہ وہ دیکھ سکے اور اس کی ضروریات پوری کر سکے۔ ہرچند کہ ان میں سے بے شمار ضروریات غلام شیر کی نہیں تھیں لیکن پھر بھی عظیم اللہ اس کی ہر بات کو پورا کرتا تھا۔ غلام شیر کو صرف اس بات کی خوشی ہوتی تھی کہ عظیم اللہ اسے مخاطب کرتا ہے۔ اس سے باتیں کرتا ہے۔ ہرچند کہ دوسرے لوگوں نے غلام شیر سے باتیں کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور غلام شیر ان کے درمیان سے اس طرح گزر رہا تھا جیسے ہوا گزرتی ہے لیکن عظیم اللہ کو بزرگ نے یہ طاقت دی تھی اور اس کے بارے میں بھی عظیم اللہ ہی نے غلام شیر کو بتایا تھا۔ بہرحال ایسا صاحب دانش یقینی طور پر کچھ نہ کچھ علم رکھتا ہوگا۔ غلام شیر سوچ رہا تھا اور اس کے قدم بڑی خاموشی کے ساتھ اوپر کی جانب اٹھ رہے تھے۔ حالانکہ اس کا بے جسم وجود کسی کے لئے توجہ کا باعث نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ اس عظیم خانقاہ پر احتیاط رکھنا چاہتا تھا۔ کون جانے............ کون کس قدر علم کا حامل ہو۔

☆======☆======☆

غلام شیر کو اب ایک عجیب احساس ہو رہا تھا اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جسم بوجھل ہوتے ہیں اور جسموں کا کھیل مختلف ہوتا ہے۔ جب وہ جسمانی حیثیت رکھتا تھا تو کسی جگہ کا سفر کرتے ہوئے پورے جسم اور بدن کی طاقت صرف کرنا پڑتی تھی۔ اپنے وجود کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے شدید مشقت بھی کرنا ہوتی تھی لیکن اب وہ جب صرف ایک ہوا تھا، ایک روح تھا تو اسے کسی جگہ جانے کے لئے کوئی مشقت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ بس ہوا میں تحلیل ہوا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بہرحال خانقاہ تک کا یہ فاصلہ طے کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بلندی پر پہنچ گیا اس وقت خانقاہ خالی ہوا کرتی تھی۔ عقیدت مندوں کے ڈیرے اس پہاڑی کے نیچے دور دور تک بکھرے ہوا کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میدان خالی پڑا ہوتا تھا اور کوئی وہاں موجود نہیں ہوتا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ خانقاہ پر پہنچ گیا۔ تاحد نظر ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ ویسے بھی اس کے بے وجود جسم کی کوئی آہٹ تک نہیں ہوتی تھی۔ حجرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ تجسس غلام شیر کو آگے بڑھا کر لیتا چلا گیا اور وہ دروازے کے پاس رک گیا۔ اس نے دروازے کو تھوڑا سا اندر دھکیلا تو حجرے کی روشنی باہر آ یہاں انداز ایسا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے حالانکہ وہ یہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ فراست حسین صاحب علم ہیں۔ انہوں نے جب عظیم اللہ کو آنکھ

وجود سے آشنا کر دیا تو بھلا اور کوئی کیا حیثیت رکھتا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ خود سے سب کچھ دیکھ سکتے تھے لیکن غلام شیر نے اندر جو منظر دیکھا وہ بڑا عجیب تھا۔ ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے نقوش بے حد دلکش تھے اور وہ بہت ہی معصوم سی شکل کی مالک لگ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ باندھے ہوئے فراست حسین کے سامنے کھڑی تھی۔ فراست حسین نے کہا۔

"دیکھو نادیہ! مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش مت کیا کرو۔ تم اتنی چھوٹی ہو مجھ سے کہ کیسی ہی کوشش کرلو تو تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتیں۔"

"استاد محترم قدموں کی خاک ہوں آپ کے۔ بھلا یہ جرأت کر سکتی ہوں؟"

"تمہاری شرارتیں بے مثال ہوتی ہیں۔ اب وہ تم نے چوہدری بدر الدین کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ تم سمجھتی ہو مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

"معافی چاہتی ہوں استاد محترم۔ اصل میں اس کی کھوپڑی اتنی چھوٹی ہے کہ میں نے جب بھی اس کی صورت دیکھی میرے ذہن میں تجسس نے سر ابھارا کہ اگر اس کے گھونسلا جیسے بالوں کو صاف کر دیا جائے تو نیچے سے کیا برآمد ہوگا اور استاد محترم اپنے اس تجسس کو میں دبا نہیں سکی چنانچہ میں نے اس کی کھوپڑی صفاچٹ کر دی۔"

"پھر؟"

"کمال کی چیز تھی۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں اتنے بڑے گول مٹول چہرے پر وہ ٹماٹر جیسی کھوپڑی کیا لگ رہی تھی استاد محترم لطف آگیا تھا۔"

"کھوپڑی دیکھ لی تھی تم نے؟"

"جی۔"

"تو پھر اس کی اتنی شاندار مونچھیں کیوں صاف کر دیں؟"

"غصہ آگیا تھا اس کی مونچھوں پر۔"

"وہ کیوں؟"

"ذرا دیکھئے نا، اتنی چھوٹی کھوپڑی والا شخص جس کے دماغ میں کوئی عقل نام کی چیز نہیں ہوگی، اتنی بڑی بڑی مونچھیں لئے پھر رہا ہے۔ بلاوجہ لوگوں کو اپنی مونچھوں سے ڈراتا رہتا ہے۔ ہر وقت مونچھوں کی نوکیں مروڑتا رہتا ہے استاد محترم یہ کوئی بات ہوئی۔"

"نادیہ، نادیہ، تمہیں پتہ ہے وہ چھ دن سے منہ چھپائے پڑا ہے۔"

"استاد محترم آپ کے قدموں کی قسم، نہ اس کے چہرے پر مونچھیں اگنے دوں گی نہ

سر پہ بال۔"

"اچھا کام کی بات کرو۔ بک بک زیادہ کرتی ہو تم۔"

"اس عورت کے شوہر کو ٹھیک کر دیا گیا ہے۔ شراب خانے میں اسے اتنے جوتے پڑوائے ہیں کہ یاد کرے گا زندگی بھر اور استاد محترم باقی سارے کام بھی آپ کی ہدایت کے مطابق کر دیئے گئے ہیں۔"

"جوتے میری ہدایت کے مطابق پڑوائے تھے؟" فراست حسین صاحب کے لہجے میں ایک شوخی سی تھی۔

"بس یہ ذرا میرا انداز ہے۔ اگر ناراض ہیں تو معافی چاہتی ہوں۔"

"دیکھو بڑے کام کی بچی ہو تم، میں تم پر بڑا اعتبار کرتا ہوں لیکن ایسی شرارتیں مت کیا کرو۔"

"آئندہ خیال رکھوں گی استاد محترم۔"

غلام شیر سخت حیرانی کے ساتھ یہ باتیں سن رہا تھا۔ دفعتاً ہی اسے فراست حسین کی آواز سنائی دی۔

"بری بات ہے بیٹے کسی کی باتیں چھپ کر نہیں سنا کرتے اندر آجاؤ۔" یہ الفاظ انہوں نے دروازے کی طرف رخ کر کے کہے تھے۔ غلام شیر دنگ رہ گیا۔

"سنا نہیں تم نے، میں کہہ رہا ہوں اندر آجاؤ۔ غلام شیر میں تم سے کہہ رہا ہوں۔"

فراست حسین کی آواز سنائی دی اور غلام شیر حیرت سے دنگ رہ گیا۔

بہرحال یہ بات تو وہ تسلیم کر چکا تھا کہ بزرگ بڑی حیثیت کے مالک تھے۔ چنانچہ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ نادیہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ تب فراست حسین نے کہا۔

"نادیہ، یہ غلام شیر ہے۔ اِدھر دیکھو پہلے میرے ہاتھ کی طرف دیکھو پھر اس کی طرف دیکھو۔"

فراست حسین نے اپنا ہاتھ سیدھا کیا اور نادیہ ان کا ہاتھ دیکھنے لگی کچھ لمحے کے بعد اس نے غلام شیر کی جانب رخ کیا تو اس کے حلق سے ایک آواز نکل گئی۔

وہ اس طرح غلام شیر کو دیکھ رہی تھی جیسے غلام شیر اس کی نگاہوں میں ہو۔ غلام شیر کو حیرت ہوئی اور ہنسی بھی آنے لگی۔ ہیرا اچھوت نے اس سے اس کا جسم چھین لیا تھا لیکن صاحب علم صاحب دانش اس کی روح کو بھی دیکھ سکتے تھے نہ صرف خود دیکھ سکتے

تھے بلکہ وہ جسے اشارہ کر دیتے وہ غلام شیر سے واقف ہو جاتا۔ ایسی عظیم جگہ! بھلا غلام شیر کو اس جگہ سے عقیدت کیوں نہ ہوتی۔ بزرگ کی آواز ابھری۔

''ہاں نادیہ' یہ ہمارا نیا مہمان ہے۔''

''استاد محترم یہ تو زندہ انسان ہیں۔''

''ہاں۔''

''لیکن یہ بے جسم کیوں ہے؟''

''حادثہ ہوا ہے اس کے ساتھ۔ ایک کافر نے اس سے اس کا جسم چھین لیا ہے اور خود اس کے جسم میں فرار ہو گیا ہے۔ یہ بے چارا ایک روح کی حیثیت سے دربدر پھر رہا ہے۔''

''انہوں نے اس کافر کو پکڑا کیوں نہیں؟''

''اس لئے کہ وہ کالے جادو کا ماہر ہے اور بہت ہی شیطان فطرت ہے۔''

''بڑا افسوس ہوا مجھے۔''

''لیکن نادیہ اچانک ہی ہمارے ذہن میں ایک اور منصوبہ بھی آیا ہے اور اسی لئے ہم نے اسے اندر بلایا ہے۔''

''جی استاد محترم!''

''نادیہ تم دونوں اگر چاہو تو بڑے بڑے لوگوں کی مشکلات حل کر سکتے ہو۔ ایسا کیوں نہ کرو تم' بولو۔''

''میں سمجھی نہیں استاد محترم۔''

''یہ تو بے جسم ہے ہی لیکن ایک انسان ہے اور انسانوں کے مسائل سمجھ سکتا ہے اور تم جو کچھ ہو وہ تم جانتی ہو۔ چنانچہ اگر تم دونوں مل کر انسانوں کی دنیا میں نکل جاؤ اور ان بے چاروں کی پریشانیوں کا حل تلاش کرو تو کیا ہی اچھا ہو۔''

نادیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ غلام شیر ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ قصہ کیا ہے اور نادیہ کیا چیز ہے۔ نادیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک اچھا مشورہ رہے گا استاد محترم! لیکن آپ کو میری ضرورت نہیں ہو گی کیا؟''

''یعنی تمہارے بہن بھائی اور بھی تو بہت سے ہیں۔ ہم ان سے کام چلا لیں گے۔''

''مجھے تو آپ کی یہ بات بڑی اچھی لگی استاد محترم۔ اگر آپ یہ پسند فرماتے ہیں تو

ٹھیک ہے لیکن ہمیں کرنا کیا ہو گا اور ان کا نام کیا ہے؟''

''کہا نا غلام شیر۔''

''خیر غلام تو ہم انہیں نہیں کہہ سکتے' اب شیر یہ ہیں یا نہیں یہ بعد میں پتہ چل سکے گا۔ جب ہمارا ان سے ساتھ ہو گا۔''

''نہیں بچہ بے حد دلیر ہے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر آپ حکم دیجئے۔''

فراست حسین نے غلام شیر کو دیکھ کر کہا۔ ''دیکھو غلام شیر پہلے بھی میں نے تم سے یہ بات کہی تھی کہ اپنے بے جسم وجود سے فائدہ اٹھاؤ۔ انسانوں کی دنیا بڑے مسائل میں گھری ہوئی ہے۔ ساری زندگی میں اگر کسی ایک کی مشکل بھی حل کرو گے تو تم یہ سمجھ لو جیسا کہ میں نے کہا' کسی کی دعا لگ گئی تو کام بن جائے گا تمہارا۔''

''آپ کا جیسا حکم میاں صاحب۔'' غلام شیر نے کہا۔

''بس بھائی دیکھو اتفاق اسے کہتے ہیں۔ اس وقت یہ نادیہ میرے کام سے آئی ہوئی تھی لیکن ہونا یہ تھا۔ چلو ٹھیک ہے جاؤ تم دونوں آرام کرو۔ نادیہ تم خود غلام شیر کو اپنے بارے میں ساری تفصیلات بتا دو مجھے اعتراض نہیں ہو گا میں تمہیں حکم اور اجازت دیتا ہوں کہ جاؤ دنیا والوں کے لئے کام کرو۔''

نادیہ نے بڑی بے باکی سے اشارہ کیا اور باہر کی جانب چل پڑی۔ غلام شیر سحر زدہ سا اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا حالانکہ وہ چوری چھپے یہاں خانقاہ میں آیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ فراست حسین شاہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد خاموشی سے واپس چلا جائے گا لیکن یہاں تو صورت حال ہی بالکل کچھ اور تھی۔ فراست حسین شاہ کو نہ صرف یہ معلوم تھا کہ وہ حجرے کے باہر کھڑا ہوا ہے بلکہ وہ اس کی آمد کی وجہ بھی جانتے تھے۔ نادیہ باہر نکل آئی۔ اسے دیکھ کر غلام شیر کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال کلبلانے لگا تھا۔ وہ شوخ شریر سی لڑکی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ ویسے بھی اس کے نقوش انتہائی دلکش اور اجنبی اجنبی سے تھے۔ اس کی آنکھیں عام لڑکیوں کی آنکھوں کی مانند سیدھی نہیں تھیں بلکہ اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ بھنویں بھی اس انداز کی تھیں۔ ناک بالکل ستواں اور ہونٹ بے حد دلکش۔ اسی طرح اس کے سارے وجود میں ایک انوکھی کیفیت بسی ہوئی تھی۔ وہ ہنستی مسکراتی غلام شیر کے ساتھ اس خانقاہ کے مشرقی حصے کی جانب چل پڑی اور یہاں کھلی فضا میں آکر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

”بیٹھو شیر خان۔“

”میرا نام غلام شیر ہے۔“

”کیا فائدہ؟ جس نے بھی تمہارا یہ نام رکھا ہے غلط رکھا ہے۔“

”کیوں؟“

”شیروں کی غلامی سے کیا حاصل' خود شیر بنو شیر۔“ وہ بولی اور غلام شیر ہنسنے لگا پھر اس نے کہا۔

”شیر بننا اپنے بس کی بات تو نہیں ہے۔“

”لو' بس کیا چیز ہوتی ہے۔ ہر چیز اپنے بس میں ہے۔“

”تمہاری معلومات مجھ سے کہیں زیادہ ہیں۔ میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”اچھا سنو۔ فراست حسین شاہ جی نے ہم سے کہا ہے کہ ہم دنیا کی مدد کریں۔ دنیا کے بارے میں' میں تو زیادہ نہیں جانتی تم بتاؤ۔ دنیا کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے؟“

”ہاں' میں اس سلسلے میں کوئی اچھی بات سوچ سکتا ہوں۔ مدد کرنے کے تو بہت سے ذرائع ہوتے ہیں۔“

”پھر اب بتاؤ' کیا کیا جائے؟“

”آؤ چلتے ہیں یہاں سے۔“

”ایک بات اور بتا دو مجھے نادیہ۔“

”ہاں بولو۔“

”تم مجھے دیکھ سکتی ہو؟“

”بالکل دیکھ سکتی ہوں۔“

”کیا تمہیں میرا چہرہ نظر آ رہا ہے؟“

”ہاں نظر آ رہا ہے۔“

”اور میرا پورا جسم بھی؟“

”ہاں' اچھا تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ تم مجھے دیکھ سکتے ہو نا؟“

”ہاں بالکل۔“

”میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ جس طرح تمہیں اس دنیا کے رہنے والے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ اس وقت تم ایک روح ہو' اسی طرح مجھے بھی اس دنیا میں رہنے والے نہیں

دیکھ سکتے کیونکہ میں بھی ایک روح ہوں۔“

”کیا تم مر چکی ہو؟“

”پھر وہی سوال۔ مری نہیں ہوں لیکن بس لوگ مجھے دیکھ نہیں سکتے تم میرا چہرہ دیکھ رہے ہو' جسم دیکھ رہے ہو آنکھیں' ناک' منہ وغیرہ۔“

”ہاں سب۔“

”اسی طرح میں بھی تمہیں دیکھ رہی ہوں۔“

”یعنی تم مجھے اس روپ میں دیکھ رہی ہو جو میرا اصل روپ ہے۔“

”ہاں۔“

”مگر کیسے؟ میرا جسم تو میرے پاس نہیں ہے۔“

”بس یوں سمجھ لو یہ شاہ جی کی کرامات ہیں۔“

”ہاں یہ الگ بات ہے۔ اس بات کو میں دل سے مانتا ہوں۔ اچھا اب یہ بتاؤ ہم کہاں چلیں؟“

”آؤ چلتے ہیں۔“ نادیہ نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بے تکلفی سے غلام شیر کا ہاتھ پکڑا اور اس پہاڑی پر سے قدم آگے بڑھا دیئے لیکن ان سیڑھیوں کی جانب نہیں جہاں سے گزر کر غلام شیر آیا تھا بلکہ اس کی مخالف سمت۔ غلام شیر کا دل ایک دم سے دھک ہو گیا تھا کیونکہ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی اور وہ خلا میں پہنچ گیا تھا۔ نیچے اچھی خاصی گہری زمین تھی۔ اسے خوف ہوا کہ وہ زمین پر گر کر چکنا چور ہو جائے گا لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنے آپ کو فضا میں تیرتے ہوئے محسوس کیا اور وہ دور تک اسی طرح تیرتے چلے گئے۔ نادیہ نے آگے چل کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا ایک لمحے کے لئے تو غلام شیر کو احساس ہوا کہ وہ اس طرح نہ چل سکے گا لیکن جب وہ نادیہ کے ساتھ ساتھ زمین پر قدم جمائے بغیر فضا میں تیرتا ہوا وہاں سے دور نکل آیا تو اس کا رواں رواں مسرت سے سرشار ہو گیا۔ یہ تو ایک انوکھی ہی بات تھی' ایسا کیسے ممکن ہو گیا۔ بہرحال کچھ دیر کے بعد وہ زمین پر اتر گئے۔ رات کا آخری پہر تھا۔ جس جگہ وہ اترے تھے وہاں ایک بڑی سی جھیل نظر آ رہی تھی جس کے ساکت پانی میں ستارے چمک رہے تھے۔ لگتا تھا کہکشاں زمین پر اتر آئی ہے۔ اطراف میں حسین و جمیل درخت تھے اور ٹھنڈی ہوائیں وہاں پر ایک حسین منظر پیش کر رہی تھیں لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ جھیل کے کنارے تھوڑے فاصلے پر دو افراد بیٹھے ہوئے تھے ان

"ہاں۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں۔"

"تو پھر میرے الفاظ پر شک کیوں کر رہے ہو؟"

"کون سے الفاظ پر؟"

"میں نے تمہیں لائن جو کہا ہے۔ یعنی شیر۔"

"میں نہیں جانتا میں کہاں سے شیر ہوں۔" غلام شیر نے کہا اور ہنس پڑا۔ نادیہ بھی ہنسنے لگی پھر اس نے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"غلام شیر۔"

"تم غلام تو نہیں ہو کسی کے نا؟"

"میرا خیال ہے غلام تو نہیں ہوں۔"

"تو پھر شیر ہو۔" نادیہ نے کہا اور خوب ہنسنے لگی۔ تب غلام شیر بھی ہنس پڑا تھا اس نے کہا۔ "بھئی۔ یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا دماغ تمہاری طرح تیز نہیں ہے۔"

"اور زبان؟"

"زبان بھی تمہاری طرح تیز نہیں ہے۔" نادیہ غلام شیر کی بات پر خوب ہنسی تھی اور اب غلام شیر کے دل و دماغ سے وہ دکھ کے بادل چھٹ گئے تھے۔ نادیہ کچھ اس طرح آہستہ آہستہ اس کی زندگی پر حاوی ہوتی جا رہی تھی کہ غلام شیر اکثر تنہائیوں میں اس کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ یہ لڑکی جو کوئی بھی ہے' جیسی بھی ہے۔ بابا صاحب نے کم از کم یہ احسان مجھ پر ضرور کیا ہے کہ اسے میرے ساتھ کر دیا ہے۔ غلام شیر نے کہا۔

"اچھا یہ بتائیے شیرنی صاحبہ اب کرنا کیا ہے؟"

"اتفاق کی بات یہ ہے کہ ہم دونوں کا یعنی شیر اور شیرنی کا مقابلہ بھی ایک شیر سے ہی ہے۔"

"کوئی اور تیسرا شیر بھی ہے؟"

"ہاں۔ شیر حیات۔" نادیہ نے کہا اور غلام شیر حیرت سے نادیہ کی صورت دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"باپ رے باپ۔ یہ تو شیروں کا پورا غول کا غول جمع ہو گیا ہے۔"

"لیکن وہ شیر نہیں ہے۔"

"ہے تو نام شیر حیات ہی اس کا۔"

"وہ صرف نام کا شیر ہے کیونکہ جو شیر ہوتے ہیں وہ اپنے سے کسی کمزور پر قابو پانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنا مدمقابل تلاش کرتے ہیں۔ وہ اس بے چاری لڑکی سیما پر اپنا رعب ڈال رہا ہے۔"

غلام شیر پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ ادھر شیر حیات اور سیما کے درمیان خاصی تیزی پیدا ہو چکی تھی۔ سیما اپنی جگہ سے اٹھی اور غراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"سنو شیر حیات! میرے باپ نے تم سے قرض لیا ہے۔ وہی یہ قرض واپس کرے گا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو تم مجھے اتنا تر نوالہ نہ سمجھنا۔ میں حلق کی ہڈی ہوں۔ ایسی ہڈی بن کر حلق میں اٹکوں گی کہ جان ہی دینی پڑے گی تمہیں۔"

"جان تو دے چکے ہیں جان! اب اور کتنی جانیں لو گی ہم سے؟"

"تم چھچھورے اور گھٹیا آدمی ہو۔" سیما نے کہا اور اٹھ کر وہاں سے تیز تیز قدموں سے واپس چل پڑی۔ شیر حیات مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"میں چھچھورا ہوں یا گھٹیا ہوں لیکن یہ بات تم سمجھ لو کہ تمہارا مستقبل ہوں۔"

سیما چونکہ تیز رفتاری سے جا رہی تھی چنانچہ نادیہ اور غلام شیر بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ ویسے یہ بات ان لوگوں نے طے کر لی تھی کہ اگر شیر حیات نے کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے خالی شیر رہنے دیں گے اور حیات چھین لیں گے اس سے۔ بہرحال وہ دونوں تعاقب کرتے ہوئے ایک خوبصورت مکان میں داخل ہو گئے۔ مکان کیا پوری حویلی تھی۔ جس میں حسین ساز و سامان موجود تھا۔ اعلیٰ درجے کا فرنیچر چھوٹا سا باغ بہت ہی خوبصورت مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ کئی ملازم بھی نظر آ رہے تھے یہاں۔ شیر حیات نے سیما کا پیچھا نہیں کیا تھا۔ وہ مطمئن تھا۔ نادیہ اور غلام شیر اس پوری حویلی کا جائزہ لیتے رہے۔ حویلی کے افراد کے بارے میں انہیں کوئی معلومات حاصل نہیں تھیں لیکن ان لوگوں نے طے کر لیا تھا کہ ان تمام لوگوں کے بارے میں پوری تفصیل معلوم کریں گے۔ چنانچہ وہ لوگ اپنے طور پر مصروف رہے۔ سیما ایک کمرے میں چلی گئی تھی۔ یہ شاید اس کا بیڈ روم تھا ایک طرف ایک بہت ہی حسین مسہری لگی ہوئی تھی۔ دوسری جانب دیوار پر ایک بہترین پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ سادہ لیکن انتہائی خوبصورت کمرہ تھا جس میں اعلیٰ درجے کا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ سیما ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ صوفے کے ہتھے پر سر رکھ کر وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔

"ابو.......... یہ تو آپ نے بہت برا کیا ہے میرے ساتھ۔ وہ آدمی تو اس قابل بھی

تھیں کہ اسے گھر میں ملازم رکھا جائے۔ آپ اسے میری زندگی کا مالک بنانے پر تلے ہوئے ہیں آپ نے ایسا کیوں کیا؟ ابو......... آپ کو اس بات کا حساب دینا پڑے گا آپ نے ایسا کیوں کیا۔ ایک بات آپ بھی کان کھول کر سن لیں ابو......... اگر آپ نے مجھے اس کی غلامی میں دینے کی کوشش کی تو میری لاش ہی اس تک پہنچے گی ابو......... بہت برا کیا ہے آپ نے بہت برا کیا ہے......... اپنی تمام محبتوں کا معاوضہ وصول کر لیا ہے مجھ سے کیا والدین اس طرح بیٹیوں کی پرورش کرتے ہیں۔ کیا وہ اسے صرف اپنا ذریعہ بناتے ہیں؟"

بہت دیر تک بلک بلک کر روتی رہی۔ یہ دونوں ہی اس سے متاثر نظر آرہے تھے۔ پھر وہ باہر نکل آئے۔ جانتے تھے کہ سیما روتی رہے گی۔ صبح کا اجالا پھوٹنے لگا تھا۔ انہوں نے شیر حیات کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے اندر داخل ہوا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک شخص جس کے سر کے بال سفید تھے۔ ایک گاؤن پہنے ہوئے گھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہا تھا۔ شیر حیات کو دیکھ کر اس نے آواز لگائی۔

"ارے شیر حیات! آؤ......... ادھر آؤ۔ کہاں سے آرہے ہو بھئی؟"

"آپ کیا سمجھتے ہیں دلاور مرزا صاحب! کیا آپ ہی صبح چہل قدمی کرتے ہیں۔ میں تو صبح چار بجے اٹھ جاتا ہوں اور اٹھ کر باہر نکل جاتا ہوں۔"

"اوہو۔ پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ میرا مطلب ہے باہر جاتے ہوئے۔"

"ہاں۔ ہو سکتا ہے پہلے آپ نے نہ دیکھا ہو۔ کہئے آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"چلتا ہوں۔ چائے پیوں گا اب۔" شیر حیات نے کہا۔ غلام شیر اور نادیہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہی شخص دلاور مرزا ہے۔ بہرحال ایک دلچسپ موقع ہاتھ آرہا تھا۔ نادیہ نے کہا۔

"غلام شیر! بابا صاحب نے مجھے بلاوجہ تمہارے ساتھ نہیں بھیجا ہے۔ انہوں نے جو وعدہ تمہیں دیا ہے وہ تمہارے حق میں اتنا بہتر ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"آؤ دیکھو نادیہ۔ کیا تم مجھے اس بارے میں بتانا پسند کرو گی؟"

"دیکھو......... جو کچھ تم کر چکے ہو اور جس طرح بھی کر چکے ہو۔ چاہے وہ نادانستگی ہی کی۔ اس میں کچھ برائیاں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ حالانکہ میں یہ نہیں کہتی کہ ان برائیوں کا آغاز تم نے خود کیا تھا لیکن بہرحال برائیاں تم نے خود کی تھیں اپنے ہاتھوں سے تمہیں اب ان کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا اور جب تم ان برائیوں کا کفارہ ادا کر دو گے تو

تمہیں بہتری کے راستے نظر آئیں گے۔"

"نادیہ! میرے لئے بہتری کا سب سے بڑا راستہ یہ ہے کہ مجھے میرا بدن واپس مل جائے۔"

"دیکھو بابا صاحب نے بلاوجہ تمہیں اس طرح نہیں بھیجا بلکہ میں تو اب ایک اور بات کہتی ہوں ہو سکتا ہے تمہاری زندگی میں یہ خوشگوار تبدیلی اسی لئے آئی ہو کہ تم کچھ نیک کام کر لو۔ تمہارا بدن تم سے چھن گیا ہے۔ اب تم ایک ایسی شخصیت بن چکے ہو جو اپنے طور پر بہت کچھ کر سکتی ہے۔ اب دیکھو میں تمہیں بتاؤں۔ تم نے اس ڈاکو اور اس کی ماں کو مشکل سے بچایا وہ ڈاکو ضرور ہے لیکن میں تمہیں ایک بہت بڑی بات بتاؤں وہ اپنی ماں کا بہت احترام کرتا ہے اور یہ اس کی الگ سے حیثیت ہے۔ بیٹا کتنی مشکل ہو جاتی ہے انسان کے لئے یہ فیصلہ کرنا کہ وہ کون سے کام نیکی کے کر رہا ہے کون سے بدی کے لیکن ماں کی خدمت ایک ایسا کام ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی بات ہی نہیں ہے وہ صرف نیکیوں کا مرکز ہوتا ہے۔ بہرحال تمہارے ذریعے اس کی زندگی بچی اور اب وہ بہتر حالت میں ہے۔ پولیس ناکام ہو کر واپس جا چکی ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟"

غلام شیر حیرت سے نادیہ کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ "لیکن تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم نادیہ؟"

"یہ ایک عجیب سوال ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو بابا صاحب کی صحبت میں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہت سے راز منکشف کر دیتا ہے۔"

"بہت بڑی بات۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔"

"اب ہم بڑا کام بھی کر رہے ہیں۔ اس لڑکی کو مشکل سے نکالنا ہے۔ آؤ ذرا دیکھیں یہ دلاور مرزا صاحب کون۔" ابھی نادیہ نے اتنے ہی الفاظ کہے تھے کہ سیما سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ناک بھی سرخ ہو رہی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ دلاور مرزا مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا لیکن جب سیما اتنے قریب آگئی کہ دلاور مرزا اس پر غور کر سکے تو وہ چونک پڑا پھر وہ اور تیزی سے آگے بڑھا اور سیما کے پاس پہنچ گیا۔

"ارے بیٹا! طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟ کیا نزلہ ہو گیا ہے۔ ساری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور ناک بھی سرخ ہو رہی ہے اور یہ تمہارے رخسار آنسوؤں سے تر ہو رہے ہیں [illegible]"

سیما یہ الفاظ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور دلاور مرزا بھی انتہائی بے چین نظر آنے لگا تھا۔ وہ بے چینی سے سیما کے چاروں طرف گھوم رہا تھا اور پریشان لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "سیما بیٹے بتاؤ تو سہی.......... پلیز بتاؤ.......... ہوا کیا سیما مجھے بتاؤ۔"

"ابو مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ ابو کیا والدین اولاد کو اس لئے پالتے ہیں' کیا اس سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ آگے چل کر اسے کیش کریں؟ مجھے بتائیے ابو کیا ماں باپ اسی طرح اولاد کے ساتھ سلوک کرتے ہیں کہ اولاد صرف قربانی کا بکرا ہوتی ہے۔"

"ہیں.......... کیا کہہ رہی ہو تم؟ آؤ بیٹھو ادھر آؤ۔" دلاور مرزا اسے لئے ہوئے ایک بینچ کی جانب بڑھے۔ نادیہ اور غلام شیر ان کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ دلاور مرزا نے سیما کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"بیٹا! مجھے بتاؤ تو ہوا کیا ہو گیا ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"ابو۔ یہ شیر حیات کون ہے؟" سیما نے سوال کیا۔

"بیٹا! میں تمہیں بتا چکا ہوں وہ تمہیں دیکھنے آیا ہے۔ تم سے ملنے آیا ہے۔"

"کیا آپ اسے اس قابل سمجھتے ہیں کہ اس کی شادی مجھ سے کر دی جائے۔"

"بیٹا! ایسی بات تو نہیں ہے۔ تم اپنا خیال بتاؤ۔"

"میں اپنا خیال بتاؤں ڈیڈی! اگر کوئی میری گردن کاٹ کر پھینک دے تو بھی میں اس کے قریب جانے سے گریز کروں۔ میں اس سے بے پناہ نفرت کرتی ہوں۔ اس کائنات میں مجھے اس سے زیادہ مکروہ شخص اور کوئی نظر نہیں آتا' اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ اسے میری زندگی کا مالک بنانا چاہتے ہیں ذرا غور کیجئے ابو۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ میں ایک ہزار بار اپنی جان دے دوں گی لیکن یہ تصور میں بھی نہ لائیے گا کہ میں اس سے شادی کے بارے سوچ سکتی ہوں۔ وہ کمینہ مجھے سوتے سے جگا کر جھیل کنارے لے گیا تھا اور وہاں بیٹھ کر مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تمہارے باپ کا بال بال قرض میں جکڑا ہے اور میں اس قرض کے بدلے تمہیں مانگنے آیا ہوں۔ ابو قیمت لگ رہی ہے میری۔ کیا قیمت ہے ابو میری ذرا بتائیں گے آپ مجھے۔ کتنا قرض لیا ہے آپ نے اس سے؟"

دلاور مرزا کا سر جھک گیا۔ بہت دیر تک وہ سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔ "بیٹا! یہ قصور میرا نہیں ہے۔ قصور میرا نہیں ہے۔ میرے بچے! تم اپنے چچا کو جانتی ہو۔ وہ بدکار شخص جس نے شیر حیات سے قرض پر قرض لئے' جائیداد اور حویلی میں سے اپنے

حصے کے دستخط کر کے سارے کاغذات مجھ سے حاصل کر لئے۔ ان پر دستخط کر کے تمام کاغذات شیر حیات کے حوالے کر دیئے۔ یہ حویلی تک رہن رکھ دی اس نے۔ ساری جائیداد شیر حیات کے ہاتھ گروی رکھ دی اور اس کے بعد طوائف کے کوٹھے پر کتے کی موت مارا گیا۔ مجھے بتاؤ میرا کیا قصور ہے اس میں؟ یہ اس کا قصور ہے۔ کامران مرزا نے برباد کر دیا مجھے۔ اس کا کیا دھرا ہے جو اب مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے۔"

"آپ کو کہاں ابو' مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اب وہ اس تمام دولت اور جائیداد کے بدلے مجھ پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ ابو کیا میں ہی ایک اکیلی ایسی شخصیت رہ گئی تھی۔"

"بیٹا! میرے پاس اور کوئی ذریعہ ہے نہیں۔ اور کوئی ذریعہ نہیں۔"

"تو پھر آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں بھی آپ کا ذریعہ نہیں بنوں گی۔ ابو کچھ بھی ہو جائے وہ میری زندگی کا مالک نہیں بن سکتا۔"

دلاور مرزا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ بڑی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سیما کچھ دیر تک دیکھتی رہی اور اس کے بعد اٹھ کر تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلی گئی اور دلاور اور مرزا اسے پکارتا رہا۔

"سیما! میری بیٹی! میری بچی! دیکھو میری بات سن لو۔ اگر میں خودکشی بھی کر لوں تب بھی یہ کوٹھی جائیداد اور ساری چیزیں اس کم بخت تک پہنچ جائیں گی۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ سیما ذرا میرا خیال تو کرو۔" دلاور مرزا نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور سیما تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ نادیہ اور غلام شیر کو اس سارے ڈرامے پر دکھ ہو رہا تھا۔ نادیہ نے کہا۔

"صبح ہی صبح یہ ہم دونوں نے کیا غمناک مسئلہ دیکھ لیا۔"

"ہاں نادیہ! یہ ہونا نہیں چاہئے۔ اس شیر حیات کو واپس جانا چاہئے۔ اس سے کاغذات کہاں سے حاصل کئے جائیں؟"

"دیکھو۔ کوشش کرتے ہیں۔" نادیہ نے کہا۔

"آؤ۔ پھر کسی ایسی جگہ اپنا بسیرا کریں جہاں ذرا سنسان سا ماحول ہو اور کوئی ہمارا راستہ نہ روک سکے۔" پھر وہ اس حویلی کا چکر لگانے گئے۔ حویلی کے عقبی حصے میں وہ بالکل نہیں گئے تھے۔ جب حویلی کے عقبی حصے میں پہنچے تو انہوں نے پرانی حویلی دیکھی جو نئی حویلی سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک کھنڈر کی شکل میں کھڑی ہوئی تھی۔

"وہ جگہ ہمارے لئے بہترین ہے۔" نادیہ نے کہا اور غلام شیر کے ساتھ اس پرانے

کھنڈر کی جانب چل پڑی۔ زمانہ قدیم میں تعمیر کی ہوئی یہ عمارت ایک بہت ہی خوبصورت عمارت تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ اسے اندر سے بالکل صاف ستھرا رکھا گیا تھا۔ وہاں کوئی فرنیچر، کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ ننگا فرش، ننگی دیواریں لیکن اتنا صاف شفاف، یوں لگتا تھا جیسے باقاعدہ اس کی صفائی کی جاتی ہو۔ بہرحال یہ جگہ انہیں بے حد پسند آئی تھی اور انہوں نے اپنے لئے ایک جگہ منتخب کرلی تھی۔ غلام شیر کے دل میں نادیہ کے لئے ایک عجیب سا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ ادھر وہ محسوس کر رہا تھا کہ نادیہ بھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ بہرحال وہ لوگ کافی دیر تک بیٹھے سوچوں میں ڈوبے رہے۔ غلام شیر نے کہا۔

”کیا عجیب بات ہے نادیہ! تم بھی ایک زندہ انسان ہو اور میں بھی لیکن بدقسمتی نے ہمیں مردوں میں شامل کر دیا ہے۔ تم کیا کہتی ہو اس بارے میں؟“

”کوئی بدقسمتی نہیں۔ ہم ہر حالت میں خوش ہیں۔ ویسے محسوس نہ کرنا غلام شیر! میں یہ چاہتی ہوں کہ تم ایک بہادر اور دلیر انسان کی طرح حالات کا صحیح انداز میں مقابلہ کرو اور کبھی اپنے آپ کو برے حال میں محسوس نہ کرو۔ جدوجہد تو انسانی زندگی کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ جو لوگ جدوجہد سے خالی ہوتے ہیں میرے نزدیک وہ انسان نہیں ہوتے۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ ان کے جسم مردہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ جدوجہد کی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ کوئی کسی حال میں اور کوئی کسی حال میں زندگی سے سمجھوتہ کرتا ہے لیکن اچھی زندگی کے حصول کے لئے کوششیں کی جاتی رہیں تو وہی انسان کا عمل ہوتی ہیں اور بے عمل لوگ میں سمجھتی ہوں کہ بس زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ایک اچھی زندگی نہیں۔“

غلام شیر حیران رہ گیا۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ”نادیہ! میرے لئے تو تم ایک مثالی حیثیت کی مالک لڑکی ہو۔ میں نہیں جانتا تمہارا انداز فکر کیا ہے لیکن کبھی کبھی تمہارے الفاظ مجھے حیران کر دیتے ہیں۔“

”بات اصل میں یہ ہے غلام شیر کہ میری اپنی زندگی بڑی عجیب گزری ہے۔ اگر میں تمہیں اپنے بارے میں یہ بتاؤں کہ میں ایک زمانے میں ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ تو شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو۔“

”جرائم پیشہ گروہ سے؟“

”ہاں۔ بس یوں سمجھ لو کہ زندگی کا ایک دور ایسا بھی گزرا ہے۔ کیا بتاؤں تمہیں، چھوڑو ان باتوں کو۔ کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔“

”میری دلی آرزو ہے نادیہ کہ ایک بار تم مجھے اپنے بارے میں خود بتاؤ۔“

”بتا دوں گی، بتا دوں گی لیکن ابھی جلدی نہ کرو اس سلسلے میں۔“

”ہاں کوئی حرج نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوئی یہ بات سن کر۔ تمہاری عمر اتنی زیادہ نہیں لگتی۔“

”بس میں نے کہا نا۔ ہوتا ہے ایسا بھی ہوتا ہے۔ انسان ان حالات سے بھی گزرتا ہے۔“ نادیہ کے لہجے میں اداسی گھل گئی۔ پھر وہ دونوں سنبھل گئے۔ غلام شیر نے کہا۔

”معافی چاہتا ہوں نادیہ! میں نے تمہیں اداس کر دیا۔“

”نہیں۔ ماضی کے واقعات کبھی نہ مٹنے والے ہوتے ہیں۔ وہ جب کبھی یاد آتے ہیں انسان تھوڑا بہت اداس تو ہو جاتا ہے۔ چلو چھوڑو ان باتوں کو اب یہ بتاؤ۔ کیا کرنا ہے اس سلسلے میں؟“

”طے یہ ہوا کہ دلاور مرزا کے بھائی نے دلاور مرزا کو اس حال تک پہنچا دیا ہے اور خود مر کھپ گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بے چارے دلاور مرزا کا اس سلسلے میں کیا قصور ہے لیکن یہ مسٹر حیات اس کا کچھ کرتا ہے۔“

”اس کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ مار مار کر اس کی شکل بگاڑ دیں گے لیکن دلاور مرزا کے ذہن سے یہ سارا تصور دور ہونا چاہئے۔ بہرحال سوچتے ہیں اس سلسلے میں۔“

یہ لوگ یہاں قیام کئے ہوئے ان تمام باتوں کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ نادیہ نے کہیں سے آ کر بڑے پرجوش انداز میں غلام شیر سے کہا۔ ”غلام شیر سارا مسئلہ حل ہو گیا۔“

غلام شیر اچھل پڑا اور حیرت سے بولا۔ ”کیا مسئلہ؟“

”غلام شیر اس حویلی میں میرا مطلب ہے پرانی حویلی میں ایک تہہ خانہ ہے۔ اس تہہ خانے میں اتنا بڑا خزانہ موجود ہے کہ اگر نواب دلاور مرزا چاہے تو اس سے ایک نیا شہر آباد کر سکتا ہے۔ سونے کے، چاندی کے زیورات، ہیروں کے انبار اتنے عظیم الشان ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہ سکے۔“

”کیا واقعی؟“

”ہاں۔ ایک بات بتاؤ۔ کیا ہم اس خزانے پر قبضہ کر لیں؟ بات یہ ہے کہ یہ خزانہ دلاور مرزا کے باپ دادا کا خزانہ ہے۔ لوگ اتنی بڑی دولت زمین کے نیچے پہنچا کر دنیا سے چلے جاتے ہیں اور پھر یہ دولت کسی کے کام نہیں آتی۔ ایسا ہی دلاور مرزا کے ساتھ ہوا۔ دلاور مرزا یہ خزانہ [illegible] کر لے تو یہ سمجھ لو کہ اس علاقے کا سب سے بڑا نواب بن

سکتا ہے لیکن وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو‘ کیا ہم یہ خزانہ حاصل کر لیں؟"

"ہاں۔ اگر یہ خزانہ ہمیں مل جاتا ہے تو تم یہ سمجھ لو کہ ہماری پشتیں اس سے لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔"

"نادیہ! تم برا تو نہیں مانو گی میری بات کا؟"

"بالکل نہیں۔"

"اگر مجھے میرا جسم واپس مل جائے تو یوں سمجھ لو کہ وہ میرے لئے اس خزانے سے دس ہزار گنا زیادہ قیمتی ہے۔ ارے زندگی میں آسائشیں ہی تو سب کچھ نہیں ہوتیں۔ جو لوگ ان آسائشوں کے حصول کے لئے باقی اپنی لذتیں ترک کر دیتے ہیں وہ بے وقوف بھی ہوتے ہیں اور بدنصیب بھی۔ اپنی ذات میں مگن رہنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

نادیہ کے چہرے پر محبت کے نقوش بکھر گئے۔ اس نے کہا۔ "خدا کی قسم غلام شیر تم ایک آئیڈیل شخص ہو اور آج میں تم سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ ایک بیوی کی حیثیت سے۔"

غلام شیر کانپ کر رہ گیا تھا۔ دیر تک اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی اور بہت دیر تک وہ خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "شکریہ نادیہ شکریہ۔ تم نے میرے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر دیا ہے اور اب مجھے یقین ہے کہ مجھے میرا بدن بھی واپس مل جائے گا۔"

"اچھا۔ میں تو صرف تمہیں آزما رہی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم دلاور مرزا کو اس خزانے کی اطلاع کیسے دیں۔" غلام شیر کے چہرے پر سوچ کے آثار پیدا ہوئے تو نادیہ بے اختیار ہنس پڑی۔ غلام شیر نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"کیوں؟ تم ہنسی کیوں نادیہ؟"

"یہ اتنا الجھا ہوا مسئلہ تو نہیں ہے۔ وہ تمہاری آواز نہیں سن سکتا۔ میری تو سن سکتا ہے۔"

"ایں۔" غلام شیر چونک پڑا۔ پھر وہ خود بھی ہنسنے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ "بعض اوقات ایسے لطیفے ہو جاتے ہیں۔ واقعی تم ٹھیک تو کہہ رہی ہو۔ تو پھر میرا خیال ہے ہمیں اس بارے میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔"

"ہاں واقعی۔ دیکھو جب قدرت کوئی مسئلہ حل کرنے پر آتی ہے تو وہ اتنی آسانی

سے حل ہو جاتا ہے کہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اب یہ کتنا مشکل معاملہ تھا لیکن کتنی آسانی سے حل ہو گیا۔"

"اس میں کیا شک ہے‘ آؤ چلیں۔" غلام شیر نے کہا اور دونوں اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

☆======☆======☆

دلاور مرزا درحقیقت زندگی کے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ زمانہ قدیم میں جاگیرداروں‘ راجاؤں مہاراجاؤں اور نوابوں وغیرہ نے جو عیش و عشرت کر ڈالے تھے‘ وہ اب زمانہ جدید میں ان کے لئے بڑی مشکل کا باعث بن گئے تھے۔ ان کی نسلوں نے عیش و عشرت میں زندگی گزاری تھی لیکن اب وہ نسلیں پریشانی کے لمحات سے گزر رہی تھیں اور گزرے ہوئے وقت کا خراج ادا کر رہی تھیں۔ بہرحال یہ سارے مسئلے اپنی جگہ تھے۔ دلاور مرزا بذات خود اتنا برا انسان نہیں تھا۔ بلکہ برائی اس کے بھائی کے اندر تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی ہر لحاظ سے ایک برا انسان تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دولت اڑائی تھی۔ چھوٹے بھائی سے دلاور مرزا کو بہت زیادہ محبت تھی بلکہ یہ کہا جائے کہ دلاور مرزا نے اسے باپ کی طرح پروان چڑھایا تھا تو غلط نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس نے چھوٹے بھائی کے راستے میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کی تھی اور اس کی رنگ رلیوں پر کبھی غور بھی نہیں کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹا بھائی بدعنوانیاں کرتا رہا۔ زمین‘ باغ‘ شہری جائیدادیں سب کچھ اس نے بیچ باچ دیا۔ کچھ گروی رکھ دیا۔ یہ حویلی جو ان کی پشتوں کی حویلی تھی۔ یہ بھی شیر حیات کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ بے شمار جائیدادیں شیر حیات کے پاس گروی تھیں اور اچھی خاصی رقم قرض تھی۔ پھر کسی طوائف کے کوٹھے پر وہ قتل ہو گیا اور ساری کہانی اس کی موت کے بعد منظرِ عام پر آئی۔ دلاور مرزا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ ادھر شیر حیات نے دلاور مرزا کی بیٹی سیما کو دیکھ لیا تھا اور اپنی عیاش فطرت کی بنیاد پر اس نے سیما کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی۔ چنانچہ اس کے وکیلوں نے دلاور مرزا کو نوٹس دیا تو دلاور مرزا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سب کچھ ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ یہاں تک کہ سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی۔ اس کے بس میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ پھر اس نے شیر حیات کی خوشامد کی اور کہا کہ کچھ رعایت کرے وہ اس کے ساتھ۔ اس کے پاس تو رہنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہا اور شیر حیات نے بڑی بے باکی سے اپنے مقصد کا اظہار کر دیا تھا۔ دلاور مرزا دل پکڑ کر رہ گیا تھا۔ سیما اس کی

زندگی تھی اور وہ حیران تھا کہ اب سیما کے بارے میں کیا کرے۔ بڑی شدید ذہنی الجھن کا شکار تھا وہ۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں بند شدید ذہنی بحران سے گزر رہا تھا۔ بیٹی کے دکھ بھرے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور اس کی ذہنی کیفیت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے منہ سے سرگوشی نکلی۔

"کچھ نہیں کر سکتا میں بیٹا تیرے لئے' کچھ بھی نہیں کر سکتا اور بدنصیبی یہ ہے کہ میرا اپنا قصور بھی نہیں ہے۔ میں ہی نہیں تو بھی میرے بھائی کی برائیوں کا شکار ہوئی ہے۔ وہ کم بخت مر کر جہنم رسید ہو گیا لیکن اب تو بتا میں کیا کروں۔ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے میرے پاس سیما کہ میں خودکشی کر لوں۔ مجھے معاف کر دینا میرے بچے' بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ ماں باپ تو خیر کبھی بھی زندگی بھر ساتھ نہیں رہتے لیکن میری موت تیرے لئے بدنامی کا باعث بھی ہو گی اور میرے بعد تو یقینی طور پر بڑے دکھوں کا شکار ہو جائے گی۔ میں تجھ سے یہ نہیں کہوں گا بیٹی کہ تو شیر حیات سے شادی کر لے۔ کہیں نہ کہیں ٹھکانہ مل ہی جائے گا تجھے بھی' کاش یہ ٹھکانہ میں خود تجھے اپنے ہاتھوں سے دے سکتا۔ کاش! پر مجھے اب زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ فیصلے تو فیصلے ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس نے میز کی دراز سے پستول نکال لیا۔ پستول کے چیمبر چیک کئے اور اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

"معبودِ کریم! میں جانتا ہوں کہ تو نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے لیکن مجھے پتا نہیں جینے کے راستے کیسے تلاش کروں۔ میرے پاس اب اس کے بعد کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ سیما' خدانخواستہ اگر مجھے تیری شادی شیر حیات سے کرنی پڑی تو کیا میں تیرے چہرے کی مایوسی دیکھ سکوں گا۔ یا تو جو ردعمل ظاہر کرے گی' کیا میں وہ برداشت کر سکوں گا۔ میرے لئے اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ میں یہ دنیا چھوڑ دوں۔ ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں تم سب سے' ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے پستول کی نال اپنی کنپٹی پر رکھنا چاہی لیکن دفعتاً ہی کسی نادیدہ ہاتھ نے پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ دلاور مرزا چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ کوئی آ گیا ہے لیکن پھر اس نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ پستول فضا میں معلق تھا اور قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں تھا۔ کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا یہ کوئی قدرتی عمل ہے۔ کیا ہے یہ؟ دلاور مرزا کی سمجھ میں ایک لمحے کے لئے تو کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مگر آس پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر اس کے

حلق سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

"ک..... کک کون ہے؟"

"دلاور مرزا آؤ۔ یہ پستول جس طرف جا رہا ہے۔ اس کی سیدھ میں چلے آؤ۔"

دلاور مرزا نے یہ عجیب سی نسوانی آواز سنی اور ایک بار پھر اپنے سر کو جھنجھوڑنے لگا۔ یہ وہم ہے..... مراق ہے..... کیا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔

"کون ہو تم؟ تم کون ہو؟"

"تمہاری نادیدہ ہمدرد۔ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے دلاور مرزا۔ آؤ..... میں ذرا تمہاری مشکل کا حل پیش کر دوں۔"

"م..... میں..... میں۔"

"نہیں ڈرو نہیں اور پھر ڈرنے کی بات ہی کیا ہے۔ تم خودکشی کرنے جا رہے تھے نا۔ آؤ۔ میں ذرا تمہاری خودکشی کا رنگ بدل دوں۔ آ جاؤ۔ ڈرو نہیں۔" پستول ایک طرف فضا میں تیرنے لگا۔ دلاور مرزا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر اس کے قدم بے اختیار اس جانب اٹھ گئے جدھر پستول فضا میں تیر رہا تھا لیکن عقل ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ کہانی بھی نہیں ہے' خواب بھی نہیں ہے۔ وہم بھی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے حقیقت ہے۔ وہ کسی انجانے دھاگے سے بندھا ہوا اس پستول کے ساتھ ساتھ باہر نکل آیا۔ راہداری طے کی' صدر دروازے سے نیچے اترا اور پھر پرانی حویلی کی جانب چل پڑا۔ پستول اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ دلاور مرزا کو یہ سب کچھ بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا لیکن حقیقتیں جھٹلائی نہیں جاتیں۔ آنکھوں کی تمام تر بینائی کے ساتھ اس نے یہ انوکھا عمل دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پستول کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا پرانی حویلی میں پہنچ گیا اور اس کی راہداریاں طے کرنے کے بعد ایک جگہ پہنچ گیا۔ آواز پھر ابھری۔

"دلاور مرزا تم بہت پریشان تھے اور خودکشی کرنے جا رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں بروقت پہنچ گئی۔ ہم کون ہیں' کیا ہیں؟ یہ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے لیکن تم یوں سمجھ لو کہ قدرت تمہاری زندگی بھی چاہتی ہے اور تمہاری مشکلوں کا حل بھی۔" دلاور مرزا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔ وہ روتے ہوئے کہتا جا رہا تھا کہ میری مشکل کا تو کوئی حل نہیں ہے۔ میری مشکل کا حل میری موت میں ہے۔ میں اب تھک چکا ہوں۔ وہ نہیں کر سکتا جو مجھے کرنا ہے۔ کوئی ذریعہ نہیں ہے میرے پاس۔ آہ۔ کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

"تم مسلمان ہو دلاور مرزا۔ کیا اس بات کو نہیں جانتے کہ جب انسان کے پاس اس کی مشکل کا کوئی حل نہیں رہتا تو پھر ذاتِ باری جوش میں آتی ہے اور کوئی نہ کوئی حل کسی نہ کسی طرح پیدا کر دیتی ہے؟"

"تو بتاؤ۔ میری مشکل کا کیا حل ہے؟"

"آؤ۔" نادیہ کی آواز ابھری اور منصوبے کے مطابق پستول ہی کی رہنمائی میں دلاور مرزا کو آگے لے جانے لگی۔ غلام شیر بھی ساتھ تھا۔ پیچ در پیچ راستے طے کر کے وہ آخر کار اس خوبصورت تہہ خانے کے دروازے پر پہنچے۔ نادیہ نے اپنی تمام قوتوں سے کام لے کر دروازہ کھولا اور وہ تہہ خانے کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔ دلاور مرزا کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔ اب وہ رونا دھونا بھول کر اس پُراسرار اور نادیدہ آواز پر غور کر رہا تھا اور اس کے قدم سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ اپنی ہی حویلی میں جہاں اس نے زندگی گزار دی تھی اسے ایک اجنبی جگہ کا علم ہوا تھا۔ پھر نادیہ نے اس عظیم الشان تہہ خانے میں لگی ہوئی مشعلوں کو روشن کر دیا تو تہہ خانے میں ایک عجیب اور پُراسرار روشنی پھیل گئی۔ بڑا عجیب سا تہہ خانہ تھا۔ گہرائیوں میں ہوتے اور صدیوں سے بند رہنے کے باوجود اس میں گھٹن کا نام و نشان نہیں تھا البتہ فرش پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور یہ گرد صدیوں کی گرد تھی جو ان چھوٹے چھوٹے روشندانوں سے کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہوئی تھی جو ہوا اور روشنی کے لئے بنائے گئے تھے۔ یہ مشعلیں بھی صدیوں پرانی ہی معلوم ہوتی تھیں کیونکہ یہ دور مشعلوں کا دور نہیں تھا۔ غلام شیر بھی حیرانی سے اس منظر اور ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ نادیہ بہرحال بابا صاحب کی ایک پُراسرار شاگرد تھی۔ غلام شیر کو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ جب کہ یہ ایک بہت بڑی سچائی تھی کہ نادیہ کے لئے اس کے دل میں محبت پیدا ہو چکی تھی اور خود نادیہ نے بھی اس کا اظہار کر دیا تھا لیکن نادیہ کے یہ الفاظ کہ میرا تعلق ایک جرائم پیشہ گروہ سے رہ چکا ہے اور میں نے ایک جرائم پیشہ زندگی گزاری ہے' غلام شیر کے لئے ناقابلِ یقین تھے لیکن وہ ایک بات جانتا تھا کہ نادیہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ اس کے دل میں شدید تجسس تھا کہ کسی طرح یہ معلوم کرے کہ نادیہ کا تعلق اس گروہ سے کیسے رہ چکا ہے لیکن اس وقت صورتِ حال ذرا مختلف تھی۔ بہرحال اس وقت اصل معاملہ دلاور مرزا کا تھا۔ وہ اس تہہ خانے کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

"میری نادیدہ ہمدرد! تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟ یہ سچ ہے کہ ہم اس تہہ خانے کے

بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔"

"ہاں دلاور مرزا اصل میں بہت قدیم حویلی ہے یہ اور پرانے لوگوں میں کچھ عجیب سی باتیں تھیں۔ جن کا کوئی مقصد' کوئی مفہوم نہیں تھا لیکن بہرحال وہ باتیں تھیں۔ وہ حقیقتوں کو چھپانے کے خواہش مند ہوا کرتے تھے۔ یعنی اپنے راز چھپایا کرتے تھے۔ یقینی طور پر تمہارے قدیم بزرگوں میں سے کسی نے ایک بہت ہی عظیم خزانہ جو ممکن ہے اسے کہیں سے حاصل ہوا ہو' تہہ خانے میں چھپا کر اس تہہ خانے کو بند کر دیا تھا اور شاید اس خزانے کا راز اس نے اپنی اولادوں کو بھی نہیں بتایا تھا۔ پھر شاید یہ اچھا ہی کیا تھا اس بزرگ نے یا ان بزرگوں نے جو اس خزانے کے بارے میں جانتے تھے۔ کیونکہ اب یہ خزانہ تمہارے کام آئے گا' تمہاری مشکل کا حل بن جائے گا۔"

"خ.......خزانہ؟" دلاور مرزا کی وحشت زدہ آواز ابھری۔

"ہاں۔ خزانہ۔" نادیہ نے کہا اور دلاور مرزا کو ساتھ لے کر آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد دلاور مرزا نے وہاں پانچ بڑے بڑے چوبی صندوق دیکھے جن کے ڈھکنوں میں تالے نہیں لگے ہوئے تھے لیکن جو انتہائی نفیس اور مضبوط البتہ پرانی ساخت کے بنے ہوئے تھے۔ نادیہ نے غلام شیر کو اشارہ کیا اور غلام شیر نے آگے بڑھ کر ایک صندوق کا ڈھکن کھول دیا۔ روشنی کا طوفان امنڈ پڑا تھا۔ سفید' سرخ' سبز' نیلی' روشنیوں نے پورے ہال کے اس حصے کو جگمگا دیا تھا۔ اس قدر بیش قیمت اور اعلیٰ درجے کے ہیرے یہاں اس صندوق میں بھرے ہوئے تھے کہ نواب دلاور مرزا جیسا شخص جسے خود بھی کسی زمانے میں ہیروں کا شدید شوق رہا تھا اور وہ اعلیٰ درجے کے ہیرے اپنے پاس رکھتا تھا جو بعد میں سب بک چکے تھے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ بڑے بڑے جوہریوں سے زیادہ جوہر شناس تھا۔ چنانچہ وہ ان ہیروں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ غلام شیر نے دوسرے صندوق کا ڈھکن کھولا۔ پھر تیسرے' چوتھے اور پانچویں کا اور عظیم الشان تہہ خانہ اتنا روشن ہو گیا کہ اس کی دیواروں پر ہلکے سے دھبے تک کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ ادھر دلاور مرزا کی آنکھیں اور منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا سانس ہی رک گیا ہو۔ نادیہ نے کہا۔

"دلاور مرزا یہ خزانہ تمہارے باپ دادا کا ہے۔ اب تم ایسا کرو ان صندوقوں کو محفوظ کرو اور اس کے بعد کل شیر حیات کا فیصلہ کر دو۔ سیما' مسٹر حیات کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی تم شیر حیات سے کہو کہ وہ تمہیں اپنے قرضوں کی تفصیل بتا کر دے۔ تم

پندرہ دن کے اندر اندر یہ قرضے اسے واپس کر دو گے۔ باقی تمہیں کیا کرنا ہے دلاور مرزا تم یہ بات خود جانتے ہو۔ خزانہ احتیاط سے اپنی تحویل میں رکھنا۔ کسی کو اس کی ہوا نہ لگنے دینا۔ ذہانت کے ساتھ تم یہ کام کرتے رہو۔ اب یہ تم پر منحصر ہے۔ ہم زیادہ عرصے یہاں نہیں رہیں گے۔ کیا سمجھے؟"

"میری نادیدہ ہمدرد۔ خدا کے واسطے مجھے یہ تو بتا دو کہ تم کون ہو؟"

"نہیں۔ دلاور مرزا ہم سے ہمارے بارے میں سوال کرنا بے کار ہے۔ ظاہر ہے اگر ہم اپنے بارے میں تمہیں بتائیں گے بھی تو تم نہیں سمجھ پاؤ گے کہ ہم کون ہیں بس یوں سمجھ لو کہ ہر کام قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہی تمہاری اور ہماری دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اس خزانے کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں اور ہم اسے بروقت تم تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں جو اسی کے حکم پر ہوتے رہتے ہیں اور کوئی نہ کوئی ذریعہ بنتا ہے۔ ٹھیک ہے' اب تم اپنے ہاتھوں سے ان صندوقوں کے ڈھکن بند کرو اور بہتر ہو گا کہ دن کی روشنی میں تم ان میں ایسے مضبوط تالے لا کر ڈال دو کہ یہ کسی اور کے ہاتھوں نہ کھل پائیں۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔ آہ میں ایک بار پھر سے نواب دلاور مرزا بن گیا۔"

"ایک بات ذہن میں رکھنا دلاور مرزا' تم ایک بار پھر سے نواب دلاور مرزا بن گئے لیکن ان غریبوں کو یاد رکھنا جو دلاور مرزا نہیں ہیں۔ اسی میں تمہاری نجات ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں اور میں ایسا ہی کروں گا۔"

"ہم لوگ چلتے ہیں۔" نادیہ نے کہا اور وہ پستول ہاتھ سے نیچے گر پڑا جو نادیہ نے اپنے ہاتھ میں اٹھایا ہوا تھا۔ دلاور مرزا نے چونک کر اسے دیکھا۔ نادیہ نے آنکھ سے غلام شیر کو اشارہ کیا اور دونوں وہیں رک گئے۔ دلاور مرزا تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا اور جب اس نے یہ سمجھ لیا کہ نادیہ اور غلام شیر اب وہاں نہیں ہیں تو وہ ایک بار پھر خزانے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ہیرے اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ سونے کے انبار اشرفیاں وہ ساری چیزیں جو زمانہ قدیم سے تعلق رکھتی تھیں لیکن ان کی مالیت بے پناہ تھی وہ اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ "میرے معبود میرے مالک تیرا شکریہ! تو نے مجھے نئی زندگی کے ساتھ ایک بار پھر عزت سے نوازا ہے۔" بہت دیر تک وہ تہہ خانے میں رہا اور اس کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے صندوق بند کیے اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدم شرابیوں کے سے انداز میں لڑکھڑا رہے تھے۔ نادیہ نے غلام شیر

کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ کم بخت دولت ایسی ہی منحوس چیز ہے۔ انسان اس کے نشے سے سرشار ہوتا ہے تو پھر اسے دنیا کی کوئی خبر نہیں رہتی۔"

بہرحال دوسرے دن دلاور مرزا کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خون کی روانی تھی اور اس کی شخصیت کا وہ مرجھایا پن ایک دم دور ہو گیا تھا۔ ادھر شیر حیات کو بھی شاید اپنے آخری لمحات میں ذلیل ہونے کا بڑا شوق تھا۔ دلاور مرزا کو اپنے دل کی بات بتا کر اور اسے یہ احساس دلا کر کہ وہ اس پر حاوی ہے' وہ اور شیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت وہ ایک کوریڈور سے گزرتا ہوا سیما کے کمرے پر پہنچ گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت تو نہیں محسوس کی تھی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ سیما جو غم آلود انداز میں ایک صوفے پر گردن جھکائے بیٹھی ہوئی تھی' دروازہ کھلنے کی آواز پر اس طرف چونک کر دیکھنے لگی۔ شیر حیات کو دیکھ کر وہ ایک دم جلدی سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ غرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کہاں؟ کیا؟" شیر حیات نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم انسان ہو کہ گدھے۔ گدھے بھی اس طرح منہ اٹھا کر گھسے نہیں چلے آتے۔ تمہیں اگر یہاں مرنا بھی تھا تو کیا تم دروازے پر دستک نہیں دے سکتے تھے۔"

شیر حیات کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر سیما کو دیکھنے لگا پھر بولا۔ "ایک بات بتاؤ۔ کیا شادی کے بعد بھی تم اسی طرح میرے ساتھ بدتمیزی سے پیش آؤ گی؟ ابھی تو خیر میں برداشت کئے لیتا ہوں لیکن ایک بات کان کھول کر سن لیجئے مس سیما اگر شادی کے بعد آپ نے اپنی زبان اور اپنا لہجہ نہیں بدلا تو شیر حیات زمانہ قدیم کا مرد بن جائے گا۔ سمجھ رہی ہیں نا زمانہ قدیم کے مرد کی بات۔ اس کے ہاتھ میں جوتا ہو گا اور سامنے آپ ہوں گی۔"

سیما کا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ شدید غصے میں آ گئی تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ تب عقب سے نواب دلاور مرزا کی آواز سنائی دی تھی۔

"زمانہ قدیم کے کتے۔ یہاں سے دفع ہونے کا کیا معاوضہ لو گے تم؟ اب میں ایک لمحے کے لئے تمہیں اپنی حویلی میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ منحوس صورت! میری بیٹی سے تو یہ بات کہہ رہا ہے۔ اس کے جواب میں' میں تجھ سے کیا کہوں۔"

شیر حیات کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر اسے دلاور مرزا کے الفاظ یاد آئے تو اس کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"بیٹی بھی پاگل ہے اور باپ بھی۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں دلاور مرزا؟"

"تو........ تو میری گلی کا ایک کتا ہے' بے اوقات بد نسل' تو نے جس جس انداز میں مجھے لوٹا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ریس میں اپنے گھوڑوں پر تو نے مجھ سے رقمیں لگوائی ہیں اور مجھے ہروایا ہے۔ کیا نہیں جانتا میں تیرے بارے میں۔ میری اپنی ہی عقل اندھی ہو گئی تھی۔ کسی اور کو کیا کہتا' لیکن بہرحال جا اور یہاں سے دفعہ ہو جا۔ بے غیرت کمینے انسان! اگر مجھے اس کے بعد اس حویلی میں تیری شکل نظر آئی تو میں تیرے منہ پر تیزاب ڈلوا دوں گا۔ دیکھ چہرہ جھلسوا دوں گا تیرا' سمجھا۔"

"اوہ بابا جی۔ او بابا جی۔ پاگل پن کی مختلف اقسام ہوتی ہیں' تم جانتے ہو۔ ان الفاظ کے بدلے میں تمہیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس حویلی سے نکل جانا ہو گا اور میں سڑکوں پر بھی تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ کیا سمجھے؟ دنیا تم پر اتنی تنگ کر دوں گا کہ تم آسمان کی چھت کے نیچے بھی نہ رہ سکو گے' سمجھے؟"

"کیوں' کیا تو کوئی بہت بڑی چیز لگا ہوا ہے؟"

"ہاں۔ میں بہت بڑی چیز ہوں اس لئے کہ میرے پاس وہ کاغذات ہیں جو تمہیں دربدر کر سکتے ہیں۔"

"کاغذات۔ تم ان کاغذات کو لے کر آ جاتا اور ان کی قیمت وصول کر کے لے جاتا۔"

"واہ۔ تمہارا رواں رواں تو قرض میں بندھا ہوا ہے دلاور مرزا۔ کہاں سے ادا کرو گے تم میری یہ رقم؟"

"میرا خیال ہے تجھے باہر نکل جانا چاہئے شیر حیات۔"

"کون ہے جو مجھے باہر نکالے گا یہاں سے؟" شیر حیات نے کہا۔ اس وقت غلام شیر اور نادیہ بھی قریب ہی موجود تھے۔ نادیہ نے غلام شیر کو اشارہ کیا اور دوسرے لمحے غلام شیر کی لات شیر حیات کی کمر کے پچھلے حصے پر پڑی۔ شیر حیات چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس شدید ضرب سے وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ دفعتاً ہی تڑاخ کی آواز ابھری اور شیر حیات کا منہ گھوم گیا۔ یہ تھپڑ نادیہ نے اس کے منہ پر مارا تھا۔ جب کہ دلاور مرزا کافی فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ اور پھر تھپڑ' گھونسے' لاتیں۔ غلام شیر اور نادیہ اس کی اچھی خاصی مرمت کر رہے تھے۔ وہ چیختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور پھر اچانک ہی دلاور مرزا کے

حلق سے قہقہہ نکل گیا۔

"میرے نادیدہ ہمدرد! یہ تم ہی ہو نا؟"

"ہاں۔ اس سے ہوشیار رہنا اور اس کے تمام معاوضوں کی ادائیگی کر دینا ہم لوگ جا رہے ہیں۔"

"اوہ کاش! میرے پاس وہ الفاظ ہوتے جو میں اپنے جذبات کی ترجمانی کے لئے استعمال کر سکتا۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

پھر نادیہ اور غلام شیر وہاں سے نکل آئے تھے۔ راستے میں نادیہ نے کہا۔ "ہم نے اسے جینے کے راستے بتا دیئے ہیں اور ہمارا قرض یہیں تک محدود تھا بلکہ ہم پر جو غلط فیصلہ نازل ہو گیا تھا۔ ہمارے ذہن میں آ گیا تھا کہ ہم شیر حیات کو مار دیں۔ تو یہ ہمارا کام نہیں ہے۔"

"پھر بھی وہ جس قدر بدتمیزی کر رہا تھا اس کی اسے تھوڑی بہت سزا تو ملنی ہی چاہئے تھی۔"

"بہرحال آؤ۔ اب یہاں ہمارا رکنا ضروری نہیں ہے۔" نادیہ نے کہا اور غلام شیر خاموشی سے اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ نہ جانے کون کون سے نئے جہاں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ کوئی خاص منزل نہیں تھی۔ بس سفر جب تک تھکن نہ ہو جائے اور وہ دونوں سفر کرتے رہے۔ غلام شیر محسوس کر رہا تھا کہ اس سے پہلے اس کے دل پر جو ایک بوجھ سا طاری رہتا تھا' نادیہ کی شمولیت کے بعد وہ ختم ہو گیا ہے۔ محبت کا ایک مخصوص انداز ان کے ذہنوں پر پر اثر انداز تھا اور وہ اپنے طور پر مطمئن نظر آ رہے تھے۔ زندگی تو کہانیوں سے بھری پڑی ہوتی ہے۔ انہیں ایک ویران علاقے میں ایک مجسمہ پڑا ہوا ملا۔ نیلے رنگ سے رنگا ہوا' زبان باہر نکلی ہوئی' بہت سے ہاتھ۔ ایک عجیب وحشت ناک شکل تھی۔ نادیہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

"یہ جادو کی دیوی کالی ہے اور اس کے نام کے ساتھ تو اتنی انوکھی کہانیاں وابستہ ہیں کہ غلام شیر تم سنو گے تو حیرت زدہ رہ جاؤ گے۔"

"ہاں۔ میں نے ہندوؤں کی اس دیوی کالی کے بارے میں سنا ہے۔"

"دیکھو۔ ذرا غور سے اس مجسمے کو دیکھو۔ یہ آدھی سے زیادہ زمین میں دفن ہے جانتے ہو اس کی کہانی کیا ہے؟"

"نہیں نادیہ۔ مجھے اتنی معلومات حاصل نہیں۔"

”اتفاق کی بات ہے کہ یہ کہانی مجھے بابا صاحب نے سنائی تھی۔ آج اس مجسمے کو دیکھ کر مجھے ڈسمنڈ یاد آگیا۔ ڈسمنڈ اور باربرا‘ یہ عجیب اور پُراسرار کہانی ڈسمنڈ اور باربرا کی ہے۔ آؤ۔ یہاں اس درخت کے پاس بیٹھتے ہیں۔“ نادیہ نے کہا اور دونوں اس چوڑے برگد کے درخت سے پشت لگا کر بیٹھ گئے جس کے قدموں میں دور دور تک اس کی جڑیں بکھری ہوئی تھیں۔ نادیہ کی آنکھیں خلاء میں گھورنے لگیں۔ جیسے وہ کسی منظر کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہو پھر اس کی پُرسحر آواز ابھری۔

”زندگی اس کائنات کی سب سے پُراسرار شے ہے۔ جب تک انسان کو زندگی کا تجربہ نہیں ہوتا‘ وہ بہت سی چیزوں سے ناواقف رہتا ہے اور جب زندگی اسے اپنے آپ سے روشناس کراتی ہے تو کائنات کے پوشیدہ راز اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ تب وہ سمجھتا ہے کہ کون سا لمحہ سچ ہے اور کون سا جھوٹ۔ ہاں۔ لمحوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ افسانوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ حقیقتاً‘ اور میں تمہیں ایسے ہی ایک زندہ لمحے کی داستان سنا رہی ہوں۔“

☆======☆======☆

رات بے حد تاریک تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ساری کائنات پر تاریکی کی دبیز چادر اوڑھا دی گئی ہو۔ ہر سمت چھائی ہوئی سیاہی میں اس بھیانک شکل کی عورت کا مکروہ چہرہ چمک رہا تھا۔ اس کی خون کی طرح سرخ زبان اس طرح باہر لٹک رہی تھی جیسے ابھی ابھی تازہ خون چاٹ کر بھی اس کی پیاس نہ بجھی ہو۔ اس کی گردن میں پڑا ہوا ہار گرد و پیش کو اور بھی دہشت انگیز بنا رہا تھا کیونکہ یہ ہار انسانی کھوپڑیوں کا تھا جن کے خوفناک جبڑوں پر چمکتے ہوئے بڑے بڑے سفید دانت منظر کو بے حد خوفناک بنا رہے تھے۔ عورت کا تمام جسم خون میں نہایا ہوا تھا۔ تازہ........ تازہ سرخ لہو‘ جو ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔

عورت پتھر کا ایک مجسمہ تھی جس کے چاروں ہاتھ ہوا میں بلند تھے اور یہ مجسمہ کالی کا تھا۔ کالی دیوی کا اور آج کالی پوجا کی رات تھی۔ آج کالی رات تھی۔ گھنگھور سیاہی میں ڈوبی ہوئی اس رات میں کالی کے بت کے گرد جلتے ہوئے گھی کے چراغوں کی روشنی بھی سیاہ ہوئی جا رہی تھی۔ پتھر کے اس چبوترے پر رکھے ہوئے اس سیاہ بت کے گرد بیٹھے ہوئے پجاری اشلوک پڑھنے میں منہمک تھے۔ یہ ایک چوکور سا ہال نما کمرہ تھا جس کا سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ بت کے دائیں اور بائیں دو موٹے اور مضبوط پتھر کے ستون تھے۔ دائیں بائیں چھوٹے کمروں کی قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ بت کی پشت پر ایک چھوٹا سا

دروازہ تھا جو بند تھا۔ بائیں جانب کے کمرے سے موسیقی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اردگرد لوبان اور دوسری خوشبوؤں کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ آنے والے پجاری دیوی کے قدموں میں سجدہ کرتے‘ پرارتھنا کے بعد ایک جلتے ہوئے الاؤ میں لوبان ڈالتے اور الٹے قدموں واپس چلے جاتے۔ دھواں اٹھتا اور کالی کا بت اس میں چھپ جاتا۔

بت کے قدموں پر بنے ہوئے قربان گاہ کے چبوترے کے گرد ایک منڈیر بنی ہوئی تھی جس میں قربان ہونے والے جانوروں کا خون جما ہوا تھا۔ آنے والے پجاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ دور دور سے آنے والے مرد عورت‘ جوان‘ بوڑھے اور کنواری پجارنیں ایک قطار کی شکل میں مندر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان کے ہمراہ قربانی کے جانور تھے۔ حیثیت کے لحاظ سے وہ قربانیاں لے کر آئے تھے۔ غریب پجاریوں کی بغل میں دبے ہوئے مرغ کی آواز خاموشی میں ابھرتی اور پھر ڈوب جاتی۔

کالی کا یہ مندر ریاست مدھرنا میں واقع تھا۔ مدھرنا ریاست کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت تھا۔ شہر کی آبادی ایک بڑی سی جھیل کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔ جھیل کے گرد پہاڑیوں پر ایک سمت کالی کا مندر واقع تھا اور دوسری جانب ریاست کے راجہ ہزہائی نس شری راج کرشن کا محل تھا۔ زرد پتھر کے بنے ہوئے اس محل کے سامنے پھیلی ہوئی جھیل کا مٹیالا پانی بدبودار تھا۔ اس میں ان گنت بوڑھے مگرمچھ پلے ہوئے تھے جو قربانی کے جانوروں کا گوشت کھا کھا کر موٹے ہو رہے تھے۔ یہ پانی آبادی کے پینے اور کاشت کاری کے کام بھی آتا تھا۔

ادھیڑ عمر مہاراجہ کرشن رنبیر محل کی بالکونی میں کھڑا ہوا جھیل کے مٹیالے پانی اور کنارے بنے ہوئے راستے پر رواں دواں پجاریوں کی قطار کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے موٹے ہونٹوں پر ایک عجیب سی شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ آج کالی رات تھی‘ کالی دیوی کی پوجا کی رات تھی۔ آج کالی کے قدموں میں ہر ایک کو خون کا نذرانہ پیش کرنا تھا اور راجہ نے آج کالی کے لئے ایک خاص نذرانہ تیار کر رکھا تھا۔ آج وہ دیوی کو سفید خون کا نذرانہ دینے والا تھا۔ وہ اس ریاست کا مطلق العنان فرماں رواں تھا‘ اور اس کا عقیدہ تھا کہ یہ حکومت اسے اور اس کے خاندان کو کالی کی برکتوں کی وجہ سے ملی تھی۔

محل کے نیچے ایک بہت بڑا تہہ خانہ تھا جس میں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ تہہ خانے میں جانے کا صرف ایک خفیہ راستہ تھا۔ درحقیقت یہ ایک تہہ خانہ نہیں شاہی جیل

خانہ تھا۔ جس کے اندر خطرناک مجرم اور ریاست کے حکام کی مرضی پر سرِتسلیم خم نہ کرنے والوں کو زندگی بھر عذاب بھگتنا پڑتا تھا۔ ان میں بہت سے وہ بے قصور بھی تھے جن کا گناہ صرف اتنا تھا کہ انہوں نے اپنی خوبصورت بیٹی یا بیوی کو مہاراجہ یا اس کے کسی حاکم کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی قیدیوں کو جانوروں کی طرح ٹھونس دیا گیا تھا۔ ایک ہی کمرے میں مرد اور عورت سب بند کر دیئے جاتے اور بہت سی جوان عورتیں اور مرد یہاں پر بڑھاپے کی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ کمروں سے گندگی کا تعفن اٹھ رہا تھا۔ قیدیوں کے جسموں پر کپڑے نہ ہونے کے برابر تھے۔ بھوک اور اذیت سے ان کے جسم ڈھانچے نظر آ رہے تھے۔

لیکن اسی قید خانے کے آخری کمرے میں پہلی بار صفائی کی گئی تھی۔ یہ کمرہ نسبتاً کشادہ اور ہوادار تھا۔ اس کا فرش صاف تھا۔ کمرے میں دو آہنی چارپائیاں اور فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ کمرے سے ملحقہ ایک غسل خانہ اور پاخانہ بھی تھا۔ اس کمرے میں قیدیوں کی تعداد دس تھی۔ جن میں تمام عورتیں تھیں۔ عمر رسیدہ بھی اور جوان بھی اور جین جیسی خوبصورت نوعمر دوشیزہ بھی جس نے ابھی زندگی کے صرف سولہ برس دیکھے تھے۔ یہ ساری عورتیں انگریز تھیں۔ جین کرنل ڈیون پورٹ کی بیٹی تھی۔ مسز ڈیون پورٹ سر جھکائے ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ کونے کی میز پر ایک جگ میں پانی اور ٹرے میں ان کے لئے آیا ہوا کھانا رکھا تھا۔ ان عورتوں کو یہاں قید ہوئے تقریباً دو ہفتے گزر چکے تھے۔

انگریزوں کی ایک رجمنٹ وره پور کی بغاوت کچلنے کے لئے ریاست مدھرنا کی سرحد کے قریب پہنچی تو رجمنٹ کے سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ انگریز جس بے دردی اور ظلم کے ساتھ قتل عام کر رہے تھے' وہ ان کے لئے ناقابل برداشت ہو چکا تھا اور مہاراجہ کرشن نے اس رجمنٹ کا صفایا کرنے کی مہم میں خود حصہ لیا تھا۔ اس نے یہ قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا۔ اس کے سپاہی سادہ لباس میں تھے اور وہ خود بھی عام لباس میں ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کارروائی میں اسے دس انگریز عورتوں کا تحفہ ملا تھا اور آج کی رات وہ دیوی کو ان سفید فاموں کے خون کا نذرانہ دینے والا تھا۔ جن کے مردوں نے ان گنت ہندوستانی مردوں اور عورتوں کی زندگی' اثاثے اور عزت کو تاراج کیا تھا اور وہ ان سے بھرپور انتقام لینا چاہتا تھا۔

مہاراجہ انگریزوں سے وفاداری بھی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے یہ

کارروائی بڑے خفیہ طریقے سے کی تھی۔ اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی تھی کہ انگریز فوج کا ایک دستہ ان قیدیوں کی تلاش میں ریاست کی سمت بڑھ رہا ہے۔ مہاراجہ نے اسی لئے انہیں اتنے آرام اور اہتمام سے رکھا ہوا تھا۔ اگر انگریز سپاہی ان قیدیوں کی تلاش میں پہلے پہنچ جاتے تو وہ پھر ان عورتوں کو بچانے اور محفوظ جگہ چھپانے کا احسان جتا کر اپنی وفاداریوں میں اضافہ کر لیتا لیکن اب تک وہ نہیں پہنچے تھے اور آج رات کے بعد ان عورتوں کا نام و نشان بھی دھرنا کی سرزمین پر باقی نہیں رہے گا۔

لیکن مہاراجہ کرشن کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ انگریز فوج مدھرنا کے علاقے میں داخل ہو چکی ہے اور تیزی سے شہر کی سمت بڑھ رہی ہے۔

میجر چارلس ڈسمنڈ وڈ کی سربراہی میں ایک انگریز رجمنٹ رات کی تاریکی میں تیز رفتاری کے ساتھ مدھرنا کے شہر کی سمت بڑھ رہی تھی۔ انہوں نے دانستہ ایسا راستہ اختیار کیا تھا جو آبادی کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ ان کے گھوڑے برق رفتاری کے ساتھ مدھرنا شہر کی سمت بڑھ رہے تھے۔

میجر ڈسمنڈ وڈ کے کانوں میں اپنے چچا زاد بھائی کرنل جیمسن ڈیون پورٹ کے الفاظ گونج رہے تھے جسے انہوں نے زخمیوں میں انتہائی نازک حالت میں پایا تھا۔

"وہ جین کو لے گئے ہیں چارلس۔ خدا کے لئے اسے تلاش کرو۔ اسے بچاؤ۔"

"اگر وہ زندہ ہے تو میں اسے تلاش کر لوں گا۔" میجر نے کہا تھا۔

"وہ زندہ ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔" لبِ مرگ جیمسن نے کہا تھا۔

اور میجر چارلس ڈسمنڈ وڈ یہی دعا کر رہا تھا کہ جیمسن کا خیال درست ثابت ہو۔ اس کے ہمراہ ایک پوری رجمنٹ تھی جو توپوں اور ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح تھی۔ وہ ریاست مدھرنا پر بہ آسانی قبضہ کر سکتا تھا لیکن وہ صرف اس خیال سے خفیہ طور پر آگے بڑھ رہا تھا کہ ان کی آمد کی خبر پا کر مہاراجہ قیدیوں کو ٹھکانے نہ لگا دے۔

وہ شہر میں داخل ہوئے تو ہر سمت موت کی تاریکی اور سناٹا طاری تھا۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپ سن کر بھی کوئی متنفس باہر نہیں نکلا۔ اس نے حیرت کے ساتھ ہر سمت دیکھا اور پھر رک کر اپنے ہندو گائیڈ سے اس تاریکی کا سبب پوچھا۔

"صاحب! آج کالی پوجا کی رات ہے۔ کوئی روشنی نہیں جلاتا اور سب مندر گئے ہوں گے۔"

میجر چارلس کا دل لرز اٹھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کالی رات ہے۔ سواروں کو

تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے کا حکم دے کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اب ان کا رخ مہاراجہ راج کرشن کے محل کی طرف تھا۔

کالی کے بت کے سامنے کنواریوں کا رقص جاری تھا۔ ہر سمت بکھرے ہوئے خون کی بو لوبان کے دھوئیں میں رچ کر پھیلی ہوئی تھی۔ ان گنت قربانیاں دی جا چکی تھیں۔ یہ کنواری پجارنیں مندر میں رہتی تھیں۔ وہ کالی کے نام پر وقف تھیں اور ان کا ہیجان خیز رقص بھی پوجا کا ایک اہم حصہ تھا۔ بھنگ اور شراب کے نشے میں وحشت پجاریوں کی قطار کالی کے بت کے گرد جمع تھی۔ پوجا اس وقت آخری مراحل میں تھی۔ پجارنوں کے نیم عریاں جسم ان کے لباس سے آزاد ہونے کے قریب تھے۔ مجمع پر بے خودی اور بے اختیاری کی کیفیت طاری تھی۔

اسی لمحے عقبی دروازہ کھلا اور مہاراجہ کرشن شاہانہ لباس میں چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی چال میں عجیب سی مستی تھی۔ شراب کا نشہ اس کے اعصاب پر طاری تھا۔ مہاراجہ کو دیکھتے ہی تمام مجمع کھڑا ہو گیا۔

"مہاراجہ جے کرشن کی جے" اور "جے کالی" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ پجارنوں کے جسم کا انگ انگ بدمستی کے عالم میں تھرکنے لگا۔ مہاراجہ نے کالی کے قدموں میں ڈنڈوت دی اور پھر پوجا کے اشلوک پڑھنے کے لئے گھٹنوں کے بل بت کے سامنے بیٹھ گیا۔

کالی پوجا کے پانچ اہم اشلوک تھے جن کا تعلق مختلف تنتراؤں سے تھا۔ مسا (گوشت) متسا (مچھلی) مدورا (روح) جدیا (شراب) اور میتھونا (جنسی ملاپ)۔ ہر اشلوک پر مندر کے پروہتوں نے اشلوک سے متعلقہ اشیاء کی بھینٹ چڑھائی۔ قربانی سے پہلے مہاراجہ اس کو چکھتا تھا۔ آخری اشلوک کا وقت آیا تو مہاراجہ نے اشارہ کیا۔

بت کا عقبی دروازہ کھلا اور دو پروہت جین کو گھسیٹتے ہوئے قربان گاہ کی سمت لائے۔

کالی کے بت پر نظر پڑتے ہی جین نے خوف سے فلک شگاف چیخ بلند کی اور پھر وہ مسلسل چیختی رہی لیکن کسی نے توجہ نہیں کی۔ کالی کے بت کے سامنے لا کر دونوں پروہتوں نے اس کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔

جین کا گلا مسلسل چیخنے سے بیٹھ گیا تھا۔ خوف سے وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ بڑے پروہت کے اشارے پر ایک پجاری چمکتا ہوا خنجر لے کر آگے بڑھا۔ جین کے حلق سے ایک خوف زدہ چیخ بلند ہوئی۔ خنجر کے ایک ہی اشارے پر جین کا باریک لباس جسم سے

الگ ہو کر فرش پر گر پڑا۔ مہاراجہ کے حلق سے ایک گہری سانس ابھری۔ جین کا شباب گلاب کے پھول کی طرح ترو تازہ تھا۔ پروہتوں نے تڑپتی ہوئی جین کو قربانی کے چبوترے پر لٹا دیا۔ انہوں نے اسے بالکل بے بس بنا دیا تھا۔ مہاراجہ کرشن کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے جھک کر کالی کو ڈنڈوت دی اور پھر ہولناک انداز میں آگے بڑھا۔

طبلے کی تھاپ' بانسری کی آواز' رقص کا ہیجان اچانک شدت اختیار کر گیا۔ مہاراجہ کرشن نے کالی کے بت کے سامنے جھک کر نعرہ بلند کیا۔

"جے کالی کی۔" تمام مجمع نے بیک آواز نعرے کو دہرایا۔

بڑا پروہت آگے بڑھا اور اس کا چمکدار خنجر فضا بلند ہوا۔ جین کے لبوں سے زندگی کی آخری چیخ بلند ہوئی اور پھر اس کا سرخ سرخ تازہ خون قربان گاہ پر بہنے لگا۔

"آج میں نے تمہیں سب سے قیمتی نذرانہ پیش کیا ہے۔ آج میں نے میتھونا کی بھینٹ بھی چڑھا دی ہے۔ اب میں امر ہو گیا ہوں۔ اب مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔ جے کالی کی۔" مہاراجہ کرشن نے ایک زور دار نعرہ بلند کیا۔ "دوسری بھینٹ لاؤ۔" اس نے گرجدار آواز میں کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ پروہت دوسری عورت کو لانے کے لیے آگے بڑھتے' اچانک دو فائر ہوئے۔ دونوں پروہت کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھیر ہو گئے۔

اچانک سارا مندر فوج کے سپاہیوں سے بھر گیا۔ انہوں نے مندر کا مکمل محاصرہ کر لیا تھا۔

لیکن میجر چارلس ڈسمنڈ وڈ تاخیر سے پہنچا تھا۔ وہ کرنل جیمسن کی بیٹی کی زندگی نہیں بچا سکا تھا اور جین کی لاش دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"ان کو باہر لے جا کر پھانسی چڑھا دو۔" اس نے غصے میں کانپتے ہوئے مہاراجہ راج کرشن اور پروہتوں کی جانب اشارہ کیا۔

سپاہیوں نے لمحہ بھر تاخیر نہیں کی۔ ذرا دیر بعد مندر کے سامنے پیڑوں پر پھانسی کے پھندے تیار ہو گئے۔ جب وہ مہاراجہ کو پھانسی پر لٹکا رہے تھے تو اس نے مسکراتے ہوئے آخری جملہ ادا کیا۔

"تم مجھے نہیں مار سکتے۔ میں پھر واپس آ کر تم سے انتقام لوں گا۔"

لیکن چند لمحے بعد اس کی لاش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ مندر میں ہر سمت خون

ہی خون بہہ رہا تھا۔ چیخ و پکار سے فضا گونج رہی تھی۔

میجر چارلس ڈسمنڈ وڈ نے سگار جلا کر ایک لمبا کش لیا اور واپسی کے لئے مڑا۔ اچانک ایک سپاہی کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز بلند ہوئی۔

"میجر.......... میجر۔"

میجر نے غصے میں گھوم کر اسے دیکھا۔ سپاہی کی انگلی اس پیڑ کی سمت اٹھی ہوئی تھی جس سے مہاراجہ کی لاش لٹک رہی تھی۔ میجر نے پیڑ کی سمت دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔

مہاراجہ راج کرشن کی لاش سے گوشت پگھل پگھل کر اس طرح گر رہا تھا جیسے موم کا جسم پگھل رہا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہاراجہ کے جسم کی جگہ رسی میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ لٹک رہا تھا اور پھر اس ڈھانچے کے بلا گوشت و پوست کے دونوں ہاتھ گردن کی سمت بلند ہوئے اور پھانسی کا پھندہ کھولنے لگے۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ ڈھانچہ پھانسی کے پھندے سے آزاد ہو کر گرا اور زمین پر کھڑا ہو گیا۔ کھوپڑی کی خالی آنکھوں کا رخ میجر چارلس کی طرف تھا۔ اس کے بھیانک دانت خونخوار انداز میں میجر کو گھور رہے تھے۔ ڈھانچے کے دونوں ہاتھ اچانک فضا میں بلند ہوئے۔ فضا میں ایک بھیانک نعرہ گونجا۔ "جے کالی کی۔"

اور پھر ڈھانچہ ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر بکھر گیا۔

"کم آن۔" میجر چارلس جیسے خواب سے بیدار ہوا۔ وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

☆======☆======☆

تقریباً چالیس برس بعد مدھرنا کی ریاست میں اس وقت جیوفری فرینچ ریذیڈنٹ تھے۔ ادھیڑ عمر فرینچ اس وقت ریذیڈنسی کی عمارت کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی چار سو پچاس بور رائفل کے پیتل کے بنے ہوئے کارتوس ایک سمت رکھے اور رائفل کی نال کو ایک آنکھ سے دیکھ کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ پھر انہوں نے رائفل رکھ دی۔

"کبھی پہلے بھی شیر شکار کیا ہے تم نے؟ تمہارے والد اپنے وقت کے مشہور شکاریوں میں سے تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے! ہم دونوں نے ایک ساتھ مل کر آدم خور ہلاک کئے تھے۔"

فرینچ نے اپنے دوست میجر چارلس ڈسمنڈ وڈ کو یاد کرتے ہوئے کہا اور پھر نوجوان

ڈسمنڈ وڈ کو دیکھا۔

"تم میں ان کی بڑی مشابہت ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے چارلس جوان ہو کر سامنے آ گیا ہو لیکن تم فوج میں کیوں نہیں بھرتی ہوئے؟"

"بس یونہی سر۔ مجھے بچپن سے انجینئر بننے کا شوق تھا۔" ڈسمنڈ وڈ نے جواب دیا۔

نوجوان ڈسمنڈ وڈ حال ہی میں ایگزیکٹو انجینئر ہو کر ریاست مدھرنا آیا تھا تاکہ دریائے مدھرنا پر بند تعمیر ہونے کے کام کی تکمیل کرے۔ مدھرنا کی واحد جھیل خشک ہو جانے سے شہر کے باشندے پانی کی شدید قلت کے شکار تھے۔

"تم اچھے وقت پر یہاں آئے ڈسمنڈ وڈ۔" ریذیڈنٹ نے کہا۔ "میں ایک دو روز بعد طویل رخصت پر جا رہا ہوں اور شیر کے شکار کا یہ اہتمام ایک طرح سے میری الوداعی پارٹی کے طور پر کیا جا رہا ہے۔ اچھا ہے تم بھی تفریح کر لو گے کیونکہ بعد کی مصروفیات ایسی ہوں گی کہ شاید پھر تم کو موقع نہ ملے اور ہز ہائی نس بھی بہت مصروف ہوں گے۔ لندن سے آنے کے بعد وہ بڑی سنجیدگی سے ریاست کی ترقی کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ تم ہز ہائی نس سے بہت جلد گھل مل جاؤ گے۔ ہاورڈ کی تعلیم نے انہیں بہت روشن خیال بنا دیا ہے۔"

"سر! آپ کی عدم موجودگی میں ریذیڈنسی کا کام کون سنبھالے گا؟" ڈسمنڈ وڈ نے پوچھا۔

"پلکاٹ یہاں آ رہا ہے اور وہ بڑا فلسفی آدمی ہے۔ تتلیاں پکڑنا اس کی ہابی ہے دن بھر جنگلوں میں مارا مارا پھرے گا۔"

ادھر کالی کے مندر کے قدیم کھنڈرات کے درمیان ایک پجاری اشلوک پڑھ رہا تھا۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ گزشتہ کچھ عرصے میں کالی کے بت کے گرد فرش کی باقاعدہ صفائی کی گئی تھی۔ قربان گاہ پر پڑے ہوئے پھولوں کے درمیان خون کے تازہ جمے ہوئے ٹکڑے موجود تھے۔ کالی کی سیاہ ٹوٹی ہوئی مورتی کی دراڑوں کو بھر دیا گیا تھا اور مندر کے فرش پر پوجا کا سارا اہتمام موجود تھا۔

قربان گاہ پر جھکے ہوئے پجاری کی زبان گڑگڑا گڑگڑا کر کالی کے چرنوں میں دعا مانگ رہی تھی۔

"اب میرے انتقام کا وقت آ گیا ہے دیوی۔ اپنی کالی شکتی سے میرے خون کی پیاس بجھا دے۔ تیرا سیوک مدت سے انتظار کر رہا ہے۔ آج تیرے چرنوں پر اس نے جانوروں کے خون کی بھینٹ چڑھائی ہے دیوی۔ ایک بار پھر اپنے مندر میں کالی پوجا کے دیئے جلنے

دے دیوی ایک بار پھر اس مہان شکتی سے اپنے داس کو موقع دے۔ دیوی میرا دل تیرے سامنے مہان بھینٹ چڑھانے کے لئے بے چین ہے۔"

ہر سمت پھیلی ہوئی سیاہ رات میں جب یہ پجاری اپنی دعا سے فارغ ہو کر اٹھا تو کالی کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ نمایاں ہو گئی تھی۔ باہر نکلی ہوئی اس کی سرخ زبان تازہ خون کی پیاس بجھانے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔

اور جب وہ بوڑھا پجاری مندر سے باہر نکلا تو یہ دیکھنے والا کوئی نہ تھا کہ وہ کون ہے۔

وہ انسان نہیں تھا......... درندہ تھا۔

☆======☆======☆

"بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" ریاست مدھرنا کے نوجوان مہاراجہ نے ڈسمنڈ وڈ سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

شکار کے لئے مہاراجہ کا شاہی ہاتھی بالکل تیار تھا۔ مہاراجہ نے ڈسمنڈ وڈ کو اپنے ساتھ ہودے میں بٹھایا اور شکاریوں کی ٹولی محل سے روانہ ہو گئی۔ ہودے میں رائفلوں کے علاوہ کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا۔ شیر کا شکار تھا۔ اس لئے وہ پوری تیاری سے جا رہے تھے۔ مہاراجہ بیس بائیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان تھا اور لندن کی اعلیٰ ترین یونیورسٹی کی تعلیم نے اسے بڑا شائستہ بنا دیا تھا۔ اس میں مہاراجاؤں جیسی خو بو نہ تھی۔ اس کے برخلاف وہ ڈسمنڈ وڈ کے ساتھ ایک بے تکلف دوست کی طرح گفتگو کر رہا تھا۔ ڈسمنڈ وڈ بھی نوجوان مہاراجہ کا ہم عمر تھا لیکن وہ پھر بھی گفتگو میں تکلف سے کام لے رہا تھا۔ مہاراجاؤں کے ساتھ گفتگو کرنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔

"مائی ڈیر ڈسمنڈ......... تم میرے ساتھ تکلف سے کام نہ لو۔ شاید ریذیڈنٹ نے تمہیں تاکید کی ہو گی کہ مجھے ہز ہائی نس کہہ کر مخاطب کرو۔ لیکن میں ان القاب اور آداب سے عاجز آ چکا ہوں۔ ہر آدمی مجھے دیوتاؤں کی طرح احترام دیتا ہے۔ آخر کوئی تو مجھے انسان سمجھ کر بات کرے۔"

ڈسمنڈ ہنسنے لگا۔ "آپ آہستہ آہستہ عادی ہو جائیں گے۔" اس نے کہا۔

"میں اس حماقت کا عادی نہیں بننا چاہتا۔ کم از کم تم مجھے اپنا دوست تصور کرو۔" مہاراجہ نے کہا۔ "تم کو دریائے دھرنا پر بند باندھنے کے سلسلے میں یہاں مقرر کیا گیا ہے۔ اندازاً یہ کام کتنے عرصے میں مکمل ہو گا؟"

"میرے خیال میں دو برس تو لگ ہی جائیں گے۔" ڈسمنڈ نے کہا۔

"صرف دو سال۔ تم آرام سے کام کرو۔ پانچ دس برس بھی لگ جائیں تو پرواہ نہیں۔ اس طرح ہم زیادہ سے زیادہ عرصہ ساتھ رہ سکیں گے۔"

"یہ آپ کی مہربانی ہے۔"

"اوہ نہیں۔ آخر ہمارے درمیان ایک دیرینہ رشتہ بھی تو ہے۔" مہاراجہ نے کہا۔

"رشتہ؟" ڈسمنڈ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ کیا تم کو معلوم نہیں۔ تمہارے والد میجر جنرل چارلس نے مدھرنا میں میرے دادا کو پھانسی پر لٹکا دیا تھا؟"

"اوہ۔" ڈسمنڈ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"ارے تم کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے دادا اسی قابل تھے۔" مہاراجہ نے آہستہ سے کہا۔ "ان میں اور شیطان میں کوئی فرق نہ تھا۔ مجھے تو اس خیال سے بھی شرم آتی ہے کہ ایسا درندہ صفت شخص میرا دادا تھا۔"

ڈسمنڈ کا ہاتھی پر سوار ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس نے ہودے کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ہاتھی اس وقت نشیب کی سمت چل رہا تھا اس لئے ڈسمنڈ قدرے خوف زدہ تھا۔

"نشیب میں جو بستی نظر آ رہی ہے یہ مدھرنا کی قدیم بستی ہے۔" مہاراجہ نے بتلایا۔ "کبھی یہی مدھرنا کا شہر تھا لیکن میں نے اس گندے نشیبی علاقے کے بجائے نیا مدھرنا پہاڑی پر آباد کیا۔ مجھے اس گندی آبادی سے گھن آتی تھی اور ادھر جہاں سے گھنا جنگل شروع ہوتا ہے' دریائے دھرنا کی ترائی ہے۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر دریا ہے جس پر تم بند تیار کرو گے۔ درمیان میں جو یہ بیضوی طرز کا نشیبی علاقہ ہے۔ یہ پہلے جھیل تھی جس کے پانی پر شہر کی پوری آبادی کا انحصار تھا اور اس کے دائیں جانب بلندی پر جو کھنڈر نما عمارت نظر آ رہی ہے۔ یہ میرے دادا مہاراج کرشن کا محل تھا۔ بعد میں دریائے دھرنا نے اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ تو یہ جھیل خشک ہو گئی۔"

مہاراجہ کی شکاری پارٹی آہستہ آہستہ جنگل کی سمت بڑھ رہی تھی۔ آگے آگے مہاراجہ کا پرانا شکاری ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے ایک خاکی جیکٹ پہنا ہوا تھا اور پستہ قد ہونے کے باوجود اس کے جسم میں تجربہ کار شکاریوں کی سی پھرتی تھی۔ مدھرنا کا نیا شہر پہاڑی کی بلندی پر بسایا گیا تھا اور اب وہ اس کی صاف ستھری سڑکوں اور خوبصورت

عمارتوں سے نکل کر پرانی آبادی سے گزر رہے تھے۔ ڈسمنڈ کی نگاہیں اس خشک جھیل کا جائزہ لے رہی تھیں جو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب اس کا پانی خشک ہو چکا تھا لیکن سطح اب تک نم نظر آتی تھی۔ جھیل کے درمیان ایک بہت چوڑا سا جزیرہ نما ٹیلا تھا جس پر گھنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ جنگل کا یہ سلسلہ اس ٹیلے سے جنوبی سمت کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ ڈسمنڈ اس پورے علاقے کا جائزہ بڑے پیشہ ورانہ انداز میں لے رہا تھا کیونکہ یہیں پر اسے دریائے دھرنا کا بند مکمل ہونے کے بعد وہ چھوٹا بند بنانا تھا جس میں پانی ذخیرہ کیا جائے گا۔ مہاراجہ کے بتلائے ہوئے قدیم محل کے کھنڈرات سے گھنے جنگل کا ایک سلسلہ بلندی تک چلا گیا تھا لیکن ڈسمنڈ کو یہ معلوم نہ تھا کہ مستقبل نے وہاں اس کے لئے کتنے بھیانک واقعات چھپا رکھے ہیں۔

مہاراجہ نے آگے جھک کر مہاوت سے کچھ بات کی اور پھر ڈسمنڈ کی طرف مڑا۔

”روکی کہتا ہے کہ شکار کا لطف آ جائے گا۔ جنگل میں اس وقت کم از کم تین ٹائیگر موجود ہیں اور وہ آگے بانس کے جنگلوں میں ملیں گے۔“ مہاراجہ نے چار سو پچاس بور کی ایکسپریس رائفل اٹھا کر اس کا معائنہ شروع کر دیا۔ ”ملازموں کا کوئی بھروسہ نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”کبھی کبھی یہ صفائی کرنا بھول جاتے ہیں اور لاپرواہی کے نتیجے میں جان چلی جاتی ہے۔ بھلا تصور تو کرو کہ شیر تم پر چھلانگ لگا رہا ہو اور رائفل کا گھوڑا جام ہو جائے تو کیا حالت ہو گی۔“

”کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟“ ڈسمنڈ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”صرف ایک مرتبہ۔“ مہاراجہ نے جواب دیا۔

”پھر آپ نے کیا کیا؟“

”سر پر پیر رکھ کر بھاگا اور کیا کرتا۔“ مہاراجہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ تو غنیمت ہے کہ شیر بھی خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا ورنہ کام آ جاتے۔“

”تو کیا آپ ہاتھی پر نہیں تھے؟“

”اوہ نہیں۔ شکار کا مزہ ہاتھی پر بیٹھ کر نہیں آتا۔ ہم ہمیشہ زمین پر کھڑے ہو کر شکار کرتے ہیں اور آج تو ہز ایکسی لینسی کے اعزاز میں خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔“

”ہاں۔ وہ مجھے بتلا رہے تھے۔“ ڈسمنڈ نے کہا۔

”وہ ہمارے ساتھ نہیں آ سکے۔ کہہ رہے تھے کہ اپنے زمینداروں کے ساتھ باتیں کریں گے لیکن دراصل ان کی بینائی کمزور ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ ہم پر اپنی کمزوری ظاہر

نہیں کرنا چاہتے۔“ مہاراجہ نے بتلایا۔

جنگل میں ہر سمت ہانکا ہو رہا تھا۔ ڈھول اور کنستر پیٹنے کی تیز آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ چھوٹے جانور ہرن، خرگوش اور سیار وغیرہ خوف زدہ ہو کر بھاگ رہے تھے اور گھنی جھاڑیوں میں پوشیدہ درندے بھی شور کی آواز سے محفوظ جگہوں کی سمت بھاگنے لگے تھے۔

چٹانوں کی آڑ میں گھنی جھاڑیوں کے درمیان سے انگارے کی طرح جلتی ہوئی دو آنکھیں اس منظر کو گھور رہی تھیں۔ ان میں بے پناہ نفرت تھی۔ اس کے نتھنے انسانی بو پا کر پھڑکنے لگے تھے۔ اس کے خونخوار ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس کا جسم غیر معمولی طور پر مضبوط اور لانبا تھا اور اس دھاری دار شیر کا ذہن انسان کی طرح منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

وہ انگڑائی لے کر چٹانوں سے نکلا اور پھر آہستہ آہستہ زمین سے لگا اس سمت بڑھنے لگا جدھر شکاریوں کی ٹولی ہاتھی پر سوار شکار کی منتظر تھی۔ یہ شیر اپنے شکار کی تلاش میں آگے بڑھ رہا تھا۔

ادھر گھنے جنگل کے درمیان ایک چھوٹے سے میدان کے اندر پہنچ کر مہاراجہ اور اس کے ساتھی شکاریوں کے ہاتھی رک گئے تھے۔

ہانکا کرنے والے آہستہ آہستہ اسی میدان کی سمت بڑھ رہے تھے۔ ان کا دائرہ آہستہ آہستہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

”شکار اس گھنے جنگل کی طرف سے آئے گا۔“ مہاراجہ نے ڈسمنڈ کو اشارے سے بتلایا۔ ”اس جنگل کی پشت پر ایک گہرا نالہ ہے اور یہی جنگلی درندوں کا راستہ ہے جس سے وہ گھنے جنگل میں آتے جاتے ہیں۔“

ان کا تربیت یافتہ ہاتھی بالکل ساکت کھڑا تھا۔ اس کے بڑے بڑے کان آہٹ پر لگے ہوئے تھے اور سونڈ درندوں کی بو سونگھ رہی تھی۔ تمام شکاریوں نے اپنی رائفلیں سنبھال لی تھیں۔ ڈسمنڈ نے بھی اپنی رائفل کو چیک کر کے ہاتھ میں اٹھا لیا۔

”جلد بازی سے کام نہ لینا۔“ مہاراجہ نے سمجھایا۔ ”بڑے اطمینان سے صحیح نشانہ لے کر گولی چلانا چاہئے۔ فاصلہ جتنا کم ہو اچھا ہے۔ میں ہمیشہ بیس گز کے فاصلے سے فائر کرتا ہوں حالانکہ رائفل کی رینج دو سو گز ہے لیکن زیادہ فاصلے سے گولی چلانے میں نشانہ خطا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور زخمی شیر بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ بے خطا فائر کرنا مناسب ہوتا ہے۔“

"میں شیر کو زخمی کرکے چھوڑ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" ڈسمنڈ نے کہا۔

"ہاں۔ ورنہ وہ آدم خور ہو جاتا ہے اور آس پاس کے دیہاتیوں کی زندگی عذاب کر دیتا ہے۔" مہاراجہ نے خبردار کیا۔

ہانکے کی آواز اب بالکل قریب آ چکی تھی۔ وہ بالکل تیار ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور پھر جنگل سے بھاگتے ہوئے جانوروں کے غول گزرنے لگے۔ وہ دم بخود منتظر کھڑے رہے۔ ایک خوفناک سؤر اپنی تھوتھنی اٹھائے جنگل سے نکلا اور کچھ دیر ان کی سمت تیر کی طرح بڑھنے کے بعد مڑ کر جنگل میں گھس گیا۔ قریب ہی ایک مور زور سے چیخ کر مڑا۔ اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی اور پھر اچانک مکمل سناٹا طاری ہو گیا۔

یہ شیر کی آمد کی نشانی تھی۔ انہوں نے رائفلیں سنبھال لیں۔ ان کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔

اچانک ایک سیاہ رنگ کی چڑیا ان کے ہاتھی کے عین اوپر سے اڑتی ہوئی گزری۔

"اگر تم وہمی ہو تو یہ نحوست کی نشانی ہے۔" مہاراجہ نے کہا۔ "کم از کم ہمارے مہاوت کا یہی خیال ہے۔ تیار ہو جاؤ شیر کی آمد آمد ہے۔"

"میں بالکل تیار ہوں۔" ڈسمنڈ نے جواب دیا لیکن اس کا دل ایک نامعلوم خوف سے کانپ رہا تھا۔ شیر کے شکار کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔

"ہوشیار۔" اچانک مہاراجہ نے سرگوشی کی۔

اور پھر اچانک ایک زبردست شیر ان کے سامنے تھا۔ وہ اتنا اچانک آیا تھا کہ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ شیر کہاں سے برآمد ہوا لیکن وہ ان کے عین سامنے موجود تھا۔

"بہت خطرناک درندہ ہے۔" مہاراجہ نے آہستہ سے کہا۔

شیر ان کے ہاتھی سے بالکل بے پرواہ آہستہ آہستہ جھومتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے قدم بے آواز تھے اور سینہ بالکل زمین سے لگا ہوا تھا۔ اتنا بڑا شیر انہوں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور پھر اچانک شیر نے گردن اٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔ اس کی جلتی ہوئی نگاہیں ڈسمنڈ پر مرکوز ہو گئیں۔

ڈسمنڈ کی رائفل کی نال شیر کی سمت اٹھی ہوئی تھی لیکن اس کی نگاہیں شیر کی نظروں سے ملتے ہی جیسے چپک کر رہ گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ جلتی ہوئی نگاہیں اس کے دل میں اتر کر رہ گئی ہوں۔ پسینے کے موٹے موٹے قطرے اس کی پیشانی پر چمکنے لگے۔ وہ کوشش کے باوجود اپنی نگاہیں نہیں ہٹا سکا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی نگاہیں چپک کر

رہ گئی ہوں۔ وہ دہکتی ہوئی نگاہیں اس کے حواس پر چھا سی گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کو ہپناٹائز کر دیا گیا ہو۔ نہ جانے کیسی مقناطیسی کشش تھی کہ وہ بالکل بے خودی کے عالم میں سامنے آکر گھورے جا رہا تھا۔

شیر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

اب وہ تقریباً پچاس گز دور تھا۔ چالیس گز۔ تیس گز۔

ڈسمنڈ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شیر کا حجم بڑھتا جا رہا ہو۔ وہ ہاتھی کے برابر نظر آنے لگا تھا اور پھر اس کا وجود پوری کائنات پر محیط ہو کر رہ گیا۔ مائی گاڈ۔ اتنے بڑے درندے کو کوئی کیسے مار سکتا تھا۔ اس کی جلتی ہوئی آنکھیں اب شعلے اگل رہی تھیں۔ ڈسمنڈ کو ہر سمت اب شعلے ہی شعلے نظر آ رہے تھے۔

"نہیں۔ تم اسے نہیں مار سکتے۔" کوئی انجانی آواز اس کے ذہن میں ہتھوڑے چلا رہی تھی۔

"فائر کرو ڈسمنڈ۔" مہاراجہ نے چیخ کر کہا۔ "شیر اب بیس گز سے بھی کم فاصلے پر ہے۔"

ڈسمنڈ نے چونک کر لبلبی پر انگلی سخت کی لیکن فائر نہیں ہوا۔ اس کے ذہن پر ایک ہی آواز ہتھوڑے مار رہی تھی۔ "تم اسے نہیں مار سکتے۔ نہیں مار سکتے۔"

"ڈسمنڈ.......... فائر.........." مہاراجہ چیخا۔

لیکن دیر ہو چکی تھی۔ شیر اب اتنے قریب پہنچ چکا تھا کہ اب فائر ناممکن تھا۔

اچانک شیر نے اپنی جگہ سے جست کی۔ وہ تیر کی طرح ہودے کی سمت آیا۔

"ڈسمنڈ۔" مہاراجہ زور سے چیخا۔

ڈسمنڈ جیسے خواب سے چونک پڑا ہو۔ اس نے لبلبی دبائی، فائر ہوا لیکن اسی لمحہ مہاوت کھڑا ہو گیا۔ شیر کا پنجہ اس کے سر پر پڑا اور مہاوت تنکے کی طرح ہوا میں اچھلتا ہوا دور جا گرا۔

اور پھر ڈسمنڈ کو کچھ یاد نہ رہا۔

"تم ٹھیک تو ہو ڈسمنڈ؟" اسے مہاراجہ کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

لیکن آہستہ آہستہ اس کے حواس درست ہو رہے تھے۔ وہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ مہاراجہ اس پر پریشانی کے عالم میں جھکا ہوا تھا۔ کئی اور شکاری اردگرد کھڑے تھے۔ شرم سے ڈسمنڈ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سخت بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے نہ جانے کیا ہو گیا

تھا۔

"مجھے بے حد افسوس ہے۔" اس نے شرمندہ لہجے میں کہا اور اٹھنے کی کوشش کی۔
اچانک اس کے پیر میں شدید ٹیس سی اٹھی۔

"لیٹے رہو۔ اوپر سے گرنے سے شاید تمہارے پیر میں موچ آ گئی ہے۔" مہاراجہ نے کہا۔ "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ عموماً پہلی مرتبہ شیر کے شکار میں یہی ہوتا ہے اور قصور دراصل میرا ہے۔ مجھے انتظار کئے بغیر فائر کر دینا چاہئے تھا لیکن........ دراصل میں چاہتا تھا کہ یہ اعزاز تم حاصل کر لو۔"

"میں واقعی شرمندہ ہوں ہز ہائی نس۔"

"بکواس۔ اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔" مہاراجہ نے مسکرا کر کہا۔ "ہم سب خوش قسمت ہیں۔ میں نے اتنے قریب سے گولی چلائی لیکن پھر بھی نشانہ خطا ہو گیا۔ قسمت اچھی تھی کہ مہاوت پر حملہ کرنے کے بعد وہ مجھ پر نہیں پلٹا بلکہ چھلانگ مار کر ہودے سے نیچے کود گیا۔" مہاراجہ نے بتلایا۔ "لیکن میں نے اسے زخمی کر دیا ہے اور اب اسے زندہ چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔ میں نے آدمی دوڑا دیئے ہیں تاکہ ریذیڈنٹ کو حادثے کی اطلاع کر دوں۔ اگر تم ٹھیک ہو تو ریذیڈنسی واپس جاؤ۔ میں اسے تلاش کر کے ختم کروں گا پھر واپس آؤں گا۔"

ڈسمنڈ کے جواب دینے سے پہلے وہ رائفل سنبھال کر آگے بڑھ گیا۔ چند قدم جا کر وہ مہاوت کی لاش کے برابر رکا۔ مہاوت کی کھوپڑی کا اوپر کا حصہ غائب تھا۔

مہاراجہ آگے بڑھ گیا۔

اور ڈسمنڈ مہاوت کی لاش کو گھورنے لگا۔

"وہ کالی چڑیا کیا واقعی نحوست کی نشانی تھی؟" اس نے سوچا۔

خون کے تازہ دھبے مہاراجہ کی رہنمائی کر رہے تھے۔

وہ ان سیاہی مائل خون کے نشانات کے سہارے زخمی شیر کی تلاش میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اتنا خون بہہ جانے کے باوجود شیر چلنے کے قابل کیسے رہا۔ خاردار جھاڑیوں کے درمیان سے گزرنے کی وجہ سے اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا لیکن مہاراجہ اپنی رائفل سنبھالے آگے بڑھتا رہا۔ وہ بہت چوکنا ہو کر آگے بڑھ رہا تھا گھنی جھاڑیوں میں پہنچ کر وہ اور بھی زیادہ محتاط ہو جاتا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ زخمی شیر کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ بالآخر جنگل سے نکل کر وہ ایک ہموار جگہ پہنچ گیا۔ راستے کے

دونوں جانب بلند درخت تھے اور زمین سخت و ہموار تھی۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک قدیم سڑک پر چل رہا تھا جسے عرصہ دراز سے استعمال نہیں کیا گیا تھا اور کچھ دور چل کر یہ واضح ہو گیا کہ یہ راستہ مدھرنا کے قدیم شہر کو جاتا تھا۔

بوڑھا شکاری روکی مہاراجہ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ضبط نہ کر سکا۔

"مہاراج۔" بوڑھے شکاری نے پکارا۔ "شاید ہم غلط راستے پر آ نکلے ہیں۔"

مہاراجہ نے اسے غصے سے گھورا۔ "تم اندھے تو نہیں ہو رہے ہو۔ خون کے دھبے تمہیں نظر نہیں آ رہے ہیں؟ وہ ادھر ہی گیا ہے۔" مہاراجہ نے کہا۔ "دیکھتے نہیں یہ بائیں سمت پرانی جھیل ہے اور یہ راستہ سامنے اس پہاڑی کی سمت جاتا ہے جہاں گھنا جنگل ہے۔ وہ اسی سمت بھاگا ہے۔"

بوڑھے روکی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن اس کی آنکھیں اب دہشت زدہ ہو چکی تھیں۔

"مہاراج! بھگوان کے لئے ادھر نہ جایئے۔ ادھر خطرہ ہے۔"

"بزدل۔" مہاراجہ نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ "مجھے خطرے سے ڈراتا ہے۔ میں زخمی شیر سے ڈر جاؤں گا۔"

روکی ڈر کر سہم گیا۔

"مہاراج' میں سچ کہتا ہوں۔ میں آپ کو شیر سے نہیں ڈراتا۔ ادھر........ ادھر کالی کا استھان ہے۔ مجھے تو یہ شیر کوئی بدروح معلوم دیتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں۔ اتنا خون بہہ جانے کے باوجود نہیں مرا۔"

"بیوقوف! میں اس بکواس پر اعتقاد نہیں رکھتا۔" مہاراجہ نے کہا۔ اس نے لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور توہمات سے نفرت کرتا تھا۔

ایک بار پھر جھاڑیاں شروع ہو گئی تھیں۔ آگے جنگل بھی گھنا تھا لیکن مہاراجہ بے خطر بڑھتا رہا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا' ایک انجانا سا خوف اسے واپس مڑ جانے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ لیکن نوجوان مہاراجہ نے طے کر لیا تھا کہ وہ واپس نہیں جائے گا۔ وہ روکی کی نظروں میں بزدل بننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ راستہ اب تنگ اور دشوار ہو گیا تھا۔ زمین کی سطح نم اور ناہموار ہو گئی تھی اور پھر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی کالی کے قدیم مندر کے کھنڈرات کی سمت بڑھ رہا ہے۔

گھنی جھاڑیوں میں سانپوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ زمین کیچڑ کی بدبو سے متعفن ہو رہی تھی اور پھر اچانک روکی کی چیخیں بلند ہو گئیں۔

"مہاراج۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ روکی اپنی پنڈلی پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک سیاہ رنگ کا ناگ تیزی سے جھاڑیوں میں غائب ہو رہا تھا۔ روکی کو سانپ نے ڈس لیا تھا حالانکہ وہ بہت پرانا اور تجربہ کار شکاری تھا۔

مہاراجہ نے قریب جا کر دیکھا۔ چند لمحوں میں روکی کا جسم نیلا پڑنے لگا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ مہاراجہ کو خوف سے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ اگر کوئی شیطانی قوت اسے خوفزدہ کرنا چاہتی تھی تو وہ اس سے متاثر نہ ہو گا۔ تعلیم نے اسے حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ کالی کے جادو اور بدی کے اثرات جیسے توہمات پر یقین کرنا اس کے علم کی توہین تھی۔ وہ روکی کو چھوڑ کر پھر آگے بڑھنے لگا۔

گھنے جنگل میں جیسے ہوا رک سی گئی ہو۔ ایک عجیب قسم کی گھٹن اور حبس سے اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ زمین دلدلی ہو رہی تھی اور اس کے جوتے کیچڑ میں پھنس جاتے تھے لیکن وہ بڑھتا رہا۔

اور پھر اچانک اس کے کانوں سے گھنٹیوں کی آواز ٹکرائی جیسے مندر میں پوجا ہو رہی ہو لیکن یہ کھنڈرات تو ویران تھے۔ مندر کی عمارت مسمار ہو چکی تھی اور پھر طبلے کی تھاپ فضا میں گونج اٹھی۔ اس نے رکنا چاہا لیکن کوئی مقناطیسی قوت اب اسے آگے کھینچ رہی تھی۔ موسیقی کی آواز دم بدم قریب آتی جا رہی تھی۔

اور پھر اچانک فضا میں ایک بھیانک قہقہہ گونج اٹھا۔ زمین پر پڑے ہوئے خون کے دھبے واضح ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے قدم خود بخود اس راستے پر بڑھ رہے تھے۔ اس کا دل زور سے اچھل رہا تھا۔ حواس پر ایک عجیب سی سنسنی طاری ہو رہی تھی۔

اور پھر درختوں کے جھنڈ سے نکلتے ہی وہ کالی کے قدیم مندر کے زینے پر کھڑا تھا۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے کھڑا مندر کو حیرت سے گھور رہا تھا۔ مندر کے کھنڈرات کی جگہ اسے ایک خوبصورت مندر کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ جہاں ہر سمت چہل پہل تھی۔ پجارنیں رقص کر رہی تھیں۔ کالی کا مہیب بت اسے گھور رہا تھا۔ اس کی سرخ سرخ زبان باہر لٹک رہی تھی۔

اور پھر اچانک اس کی نگاہ کالی کی سرخ انگارہ جیسی آنکھوں سے ٹکرائی۔ خوف کی

ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کالی ایک پتھر کا بت نہیں زندہ شیطانیت کا مجسمہ ہو۔ مہاراجہ کوشش کے باوجود اپنی نگاہیں نہیں ہٹا سکا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی انجانی قوت اسے آگے کھینچ رہی ہو۔ کوئی اسے آگے بڑھنے کا حکم دے رہا ہو اور اس کے قدم خود بخود آگے بڑھ رہے تھے۔

"نہیں۔" مہاراجہ اچانک چیخا۔ "میں نہیں آؤں گا۔"

ایک بھیانک قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔ گھنٹیوں اور طبلے کی آواز سے اس کے کان پھٹے جا رہے تھے اور پھر اچانک خوفناک غراہٹ سنائی دی۔

کالی کے بت کے سائے سے ایک سر بلند ہوا۔ دو جلتی ہوئی قہر آلود نگاہوں نے اسے سر اٹھا کر گھورا اور اچانک مہاراجہ کی نگاہیں اس کے جسم کی سفید دھاریوں پر پڑیں۔ یہ وہی زخمی شیر تھا جس کی اسے تلاش تھی۔

مہاراجہ کے ہاتھ بے اختیار حرکت میں آئے۔ رائفل کی نال بلند ہوئی اور اس کی کپکپاتی ہوئی انگلی لبلبی پر جم کر رہ گئی۔ یکے بعد دیگرے وہ مسلسل فائر کرتا رہا۔ شیر کا جسم کئی بار اچھلا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کالی کے مجسمے کے قدموں پر ڈھیر ہو گیا۔

گولیاں ختم ہو چکی تھیں.......... فائر کی آواز مندر کے کھنڈروں میں گونج رہی تھی۔ مہاراجہ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دوسرا سلینڈر نکالا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ شیر کو مکمل طور پر ختم کر دینا چاہتا تھا اور پھر جیسے ہی اس کی نگاہ اوپر اٹھی۔ کارتوسوں کا سلینڈر ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ کالی کے قدموں پر پڑی ہوئی لاش شیر کی نہیں تھی۔

وہ ایک انتہائی بوڑھے اور ضعیف شخص کا جسم تھا جس کا سر اور داڑھی کے لمبے بال برف کی طرح سفید تھے۔ اوندھے منہ پڑے ہوئے اس شخص کی کھلی آنکھیں مہاراجہ کو عجیب انداز میں گھور رہی تھیں۔ مہاراجہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے شیر کو نہیں کسی ضعیف سادھو کو قتل کر دیا تھا۔ شاید کالی کا کوئی قدیم پجاری رہا ہو گا۔ بوڑھے سادھو کے لب اب تک ہل رہے تھے۔

"کالی ماتا۔ میں نے اپنا عہد پورا کر دیا ہے۔ تیری دی ہوئی شکتی سے میں اسے یہاں تک لے آیا ہوں۔ وہ تیرے سامنے موجود ہے۔ اب مجھے شکتی دے کہ تیرے دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے واپس آ سکوں۔ او کالی۔ تیرے داس نے بہت انتظار کر لیا ہے۔ بس اب مجھے آگیا دے۔ شکتی دے۔"

مہاراجہ جیسے خواب سے چونک اٹھا ہو۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ دم توڑتے ہوئے بوڑھے سادھو کے چہرے کی طرف بڑھے۔ اسے اپنی حماقت پر سخت افسوس ہو رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ ایک کمزور اور بے بس انسان کو اس نے شیر کیسے سمجھ لیا، اس نے ایک بے گناہ کو قتل کیسے کر دیا؟

"میرا کام پورا ہو گیا۔" بوڑھے نے آخری الفاظ ادا کیے اور اس کا سر ڈھلک گیا۔

لیکن مہاراجہ کے ہاتھ اسے نہ چھو سکے۔ اس نے ایک بار کالی کے بھیانک بت کو دیکھا اور پھر بڈھے سادھو کی لاش پر جھکا لیکن جیسے ہی اس نے بوڑھے کے سر پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ اچانک وہ دم بخود رہ گیا۔

وہ بوڑھے سادھو کی لاش نہیں تھی۔

اب وہاں زخمی شیر مردہ پڑا تھا اور مہاراجہ کے ہاتھ شیر کے سر کو سہلا رہے تھے اور سر سے بہنے والے تازہ تازہ سرخ خون سے تر تھے۔

مہاراجہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اور ایک بار پھر وہی بھیانک قہقہہ فضا میں گونج اٹھا لیکن اس مرتبہ آواز میں بڑی گرج تھی۔ جیسے کوئی تازہ قوت آواز میں آ گئی ہو۔۔۔

"ماتا۔ وہ تیرے چرنوں میں ہے۔ میرا خون اس کے جسم میں سرایت کر رہا ہے۔ میں نے اپنا وچن پورا کر دیا ہے۔"

مہاراجہ نے گھبرا کر اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

قہقہہ پھر گونجا۔

"تو نردوش ہے میرے بچے۔ یہ خون میرا ہی نہیں۔ تیرا بھی ہے۔ تو میرا خون ہے۔ میرے آباؤ اجداد کا خون ہے۔ میں کب سے تیرا منتظر تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تو مجھے اپنی نئی زندگی دے گا۔ تو نے مجھے زندہ کر دیا ہے بیٹے۔ مجھے زندہ کر دیا ہے۔ اب میں دشمنوں سے عبرتناک انتقام لوں گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مجھے پھانسی دے کر ختم کر دیں گے لیکن میں نے عہد کیا تھا کہ میں پھر واپس آؤں گا۔ اور میں واپس آ گیا ہوں۔"

مہاراجہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس تیز اور بھیانک قہقہے سے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ موسیقی کا شور تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ قہقہے کی آواز ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔

اور جب اسے ہوش آیا تو وہ شیر کی لاش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ خون سے تر تھے۔ ٹوٹی ہوئی چھت سے چاند کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور کالی کا بھیانک بت اسے گھور رہا تھا۔ کالی مسکرا رہی تھی۔

لیکن عجیب بات تھی کہ اب اسے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

☆------☆------☆

ڈسمنڈ تقریباً ایک ہفتے تک آرام کرتا رہا۔ اس کے پیر میں شدید موچ آئی تھی۔ شام کو وہ ٹہلنے کے لئے ریذیڈنسی کے لان پر آیا۔ اس کا پیر اب بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ اچانک ایک سفید عرب نسل کا گھوڑا تیز رفتاری کے ساتھ ریذیڈنسی کے گیٹ میں داخل ہوا۔ ٹاپوں کی آواز سن کر ڈسمنڈ نے مڑ کر دیکھا۔ مدھرنا کا نیا مہاراجہ رنبیر سنگھ مسکراتا ہوا اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔

"مجھے بہت افسوس ہے ڈیئر ڈسمنڈ کہ میں پہلے نہ آ سکا۔" مہاراجہ نے گرمجوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا۔ "شکار کے بعد مجھے خود بخار ہو گیا تھا لیکن اب بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہارا پیر بھی اب ٹھیک نظر آتا ہے۔"

"جی ہاں۔ اب تو بالکل ٹھیک ہے۔" ڈسمنڈ نے جواب دیا۔ وہ مہاراجہ کی اس طرح اچانک آمد پر حیران رہ گیا تھا۔

"پھر دن بھر یہاں کیا کرتے رہتے ہو؟"

"فی الحال تو کام شروع کرنے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔"

"اوہ۔ کام تو ہوتا ہی رہے گا۔ ٹینس سے شوق ہے؟"

"بس کھیل لیتا ہوں۔"

"خوب۔ تو پھر ٹھیک ہے۔ تم محل آ جاؤ۔ کچھ دیر تک تفریح رہے گی۔"

"لیکن.........." ڈسمنڈ نے کہنا چاہا۔

"میں ایک گھنٹے بعد تمہارا انتظار کروں گا۔" مہاراجہ نے مسکرا کر کہا اور روانہ ہو گیا۔

ڈسمنڈ راجہ رنبیر سنگھ کی اس بے تکلف مہربانی پر خوش بھی تھا اور فکر مند بھی۔ اسے کبھی مہاراجاؤں کے ساتھ رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ رنبیر سنگھ سے اتنی دوستی بڑھائے جو نبھائی نہ جا سکے۔

"تم دونوں ہم عمر ہو۔" اچانک مسٹر پالکاٹ کی آواز سنائی دی۔ ڈسمنڈ خیالوں میں اتنا

محو تھا کہ اس نے ریذیڈنٹ کو آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ "رنبیر محل میں تنہائی محسوس کرتا ہوگا۔" ریذیڈنٹ نے کہا۔ "لندن کی مصروف زندگی کے بعد اسے یقیناً تم جیسے ساتھی کی ضرورت ہے۔"

"ہز ہائی نس مجھے ٹینس کی دعوت دے گئے ہیں۔"

"ضرور جاؤ۔" بوڑھے پلکاٹ نے کہا۔ "تمہیں یہاں کافی عرصہ قیام کرنا ہے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ سے دوستی میں فائدہ ہوگا۔"

راجہ رنبیر سنگھ کا محل ایک بلند جگہ پر واقع تھا۔ خوبصورت سنگ مرمر کے بنے ہوئے اس کے گنبد دور سے نظر آتے تھے۔ عمارت جدید اور قدیم طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ ڈسمنڈ جیسے ہی محل کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں کھڑے ہوئے سنتری نے اسے سیلوٹ کیا۔ وہ بلا کسی روک ٹوک اندر گھستا چلا گیا۔ اس سے ظاہر تھا کہ مہاراجہ نے اس کی آمد کے متعلق پہلے ہی ہدایت کر رکھی تھی۔ محل کی عمارت کے ہر سمت خوبصورت لان اور باغیچہ لگا ہوا تھا۔ ڈسمنڈ محل کے پورٹیکو میں پہنچا ہی تھا کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ خود باہر آیا اور اس نے بڑی گرمجوشی اور مسرت کے ساتھ ڈسمنڈ کا استقبال کیا۔

"میں بڑی بے چینی سے تمہارا منتظر تھا۔" مہاراجہ نے کہا۔

"ہز ہائی نس کا حکم تھا کیسے نہ آتا؟"

"اوہ' ڈسمنڈ! خدا کے لئے تم ان تکلفات میں نہ پڑو۔ میں اس ہز ہائی نس کی رٹ سے عاجز آچکا ہوں۔ یہاں تم میرے واحد دوست ہو اور آئندہ سے میں تمہیں ڈسمنڈ اور تم مجھے رنبیر کہو گے۔"

دونوں بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے محل کے عقب میں واقع ٹینس کورٹ کی سمت روانہ ہو گئے۔ مہاراجہ بے حد خوش تھا لیکن ڈسمنڈ پر محل میں داخل ہوتے ہی ایک انجانے خوف کا احساس طاری ہو چکا تھا۔ وہ خود حیران تھا کہ اچانک یہ کیفیت کیوں طاری ہو گئی۔

رنبیر اچھا کھلاڑی تھا لیکن ڈسمنڈ نے پہلے سیٹ میں اسے ہرا دیا۔ بظاہر اس نے شکست ہنس کر قبول کر لی لیکن ڈسمنڈ نے محسوس کیا کہ اسے یہ ناگوار گزری ہے۔ دوسرے سیٹ میں اس نے دانستہ مہاراجہ کو جیت جانے دیا۔ کھیل کے اختتام پر رنبیر نے بے ساختہ کہا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ انتقام لینا میری خاندانی روایت ہے۔ ہم شکست کبھی

نہیں تسلیم کرتے۔" رنبیر بہت خوش نظر آرہا تھا۔ "آؤ' سورج غروب ہونے سے پہلے ایک گیم اور ہو جائے۔"

ڈسمنڈ کو تیسرے سیٹ میں خاصی محنت کرنا پڑی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جیسے جیسے دھندلکا چھا رہا تھا۔ رنبیر میں ایک عجیب قسم کی پھرتی اور قوت آتی جا رہی تھی۔ کئی بار ڈسمنڈ کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ رنبیر نہیں ہے۔ اس کا قد خاصا لمبا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے اسٹروکس بے حد طاقتور ہوتے جا رہے تھے۔ ایک مرتبہ بال اٹھانے میں دیر ہو گئی تو اس نے بال بوائے کے سر پر اتنے زور سے ریکٹ مارا کہ وہ گر کر تڑپنے لگا اور لوگ فوراً اسے اٹھا کر لے گئے۔ اس نے ضد کر کے چوتھا سیٹ بھی کھیلا اور ڈسمنڈ کو ہرا کر ایسا خوش ہوا جیسے وہ ٹینس نہیں کھیل رہے ہوں بلکہ ڈوئل لڑ رہے ہوں۔

کھیل کے خاتمے پر وہ بے تکلفی کے ساتھ ڈسمنڈ کے بازو کو پکڑ کر محل کی سمت بڑھا۔

"بڑی پیاس لگ رہی ہے۔" مہاراجہ نے کہا۔ "پہلے کچھ پئیں گے' پھر ڈنر اور اس کے بعد تمہاری آمد کے اعزاز میں کچھ تفریح ہو گی۔"

"لیکن میں تو صرف کھیل کا لباس پہن کر آیا ہوں۔"

"ہشت۔ یہاں لباس وغیرہ کے تکلفات کی ضرورت نہیں۔ ویسے اگر تم چاہو تو میں کسی کو بھیج کر تمہارا لباس بھی منگوا سکتا ہوں۔ پہلے غسل کرو.......... پھر.......... اور پھر میں تم کو لباس بھی مہیا کر دوں گا۔ آج تم ہمارا روایتی لباس پہنو۔ مجھے یقین ہے تم اس میں خوب جچو گے۔" مہراجہ رنبیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

محل میں پہلی مرتبہ پہنچ کر ڈسمنڈ اس کی خوبصورت سجاوٹ پر حیران رہ گیا۔ مہاراجہ نے اسے ایک مغربی طرز کے سجے ہوئے کمرے میں بٹھایا۔ اس کے اشارے پر فوراً ہی باوردی خانساماں نے مختلف قسم کے مشروب سامنے سجا دیئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈسمنڈ کو ساتھ لے کر ایک دوسرے کمرے میں آیا۔ اس میں بچھے ہوئے قیمتی ایرانی قالین اتنے نرم تھے کہ ڈسمنڈ کے پیر دھنسے جا رہے تھے۔ کمرے میں بہت ہلکی سی روشنی تھی جو چھت پر ٹنگے ہوئے جھاڑ میں جلتی ہوئی شمعوں سے ہو رہی تھی۔ ان کے داخل ہوتے ہی ایک کرسی سے کوئی اٹھا۔

"ارے یار ہرا تم' مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم یہاں بیٹھی ہو۔ ان سے ملو' میرے دوست مسٹر ڈسمنڈ۔"

ڈسمنڈ حیران رہ گیا۔ باربرا کا حسن قیامت خیز تھا۔ وہ شرماتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے مغربی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ سے اس کی سڈول خوبصورت پنڈلیاں جھلک رہی تھیں۔ اس کی گھنی پلکیں اپنی سیاہ آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ ڈسمنڈ حیران تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ کیا وہ رنبیر کی بیوی تھی؟ ڈسمنڈ کو علم نہیں تھا کہ رنبیر شادی شدہ ہے۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" ڈسمنڈ نے خوش اخلاقی کے ساتھ کہا۔

"باربرا میرے بچوں کی گورنس ہے۔" رنبیر نے بتلایا۔ "بچوں نے پریشان تو نہیں کیا تم کو باربرا؟"

"اوہ نہیں ہز ہائی نس۔ وہ مجھ سے بڑا پیار کرتے ہیں اور رنجیت تو میرے ساتھ ہر لمحہ لگا رہتا ہے۔"

مہاراجہ مسکرا دیا۔ "تم بھی تو اس سے اتنی محبت کرتی ہو۔" اس نے کہا۔ باربرا شرما گئی۔

"مجھے اجازت ہے ہز ہائی نس؟"

"اوہ' ٹھیک ہے باربرا! تم جا سکتی ہو۔"

باربرا کے جانے کے بعد رنبیر نے ڈسمنڈ سے کہا۔ "تم بچوں کا ذکر سن کر چونک پڑے تھے۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ ہندوستان میں کم عمری میں شادی ہو جاتی ہے۔ میں جب لندن گیا تو دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔"

"واقعی؟" ڈسمنڈ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "آپ کی گورنس بھی تو بہت کم عمر ہے۔"

"اوہ' تم کو پسند ہے۔" مہاراجہ رنبیر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "وہ تمہارے لئے حاضر کر دی جائے گی۔ تم چاہو' تو ریذیڈنسی پہنچا دی جائے گی ورنہ محل میں انتظام کر دیا جائے گا۔"

ڈسمنڈ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"آپ غلط سمجھے ہیں رنبیر۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔" اس نے فوراً وضاحت کی۔

"سنو ڈسمنڈ! یہ میری ریاست ہے۔ میں یہاں کا مطلق العنان حکمران ہوں۔ یہاں ہر وہ چیز جو مجھے یا میرے دوستوں کو پسند آ جائے' حاصل کر لی جاتی ہے۔"

"لیکن میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں یقین دلاتا ہوں۔"

غسل خانہ کیا تھا عیش کدہ تھا۔ ڈسمنڈ جب عرق گلاب ملے ہوئے پانی سے نہا کر اٹھا تو اس کا جسم مہک رہا تھا۔ جیسے ہی وہ باہر آیا ایک باوردی ملازم نے مخمل کی طرح نرم تولیہ اس کے جسم پر ڈال کر رگڑنا شروع کر دیا۔ ڈسمنڈ نے احتجاج بھی کیا لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہ ہو اور ڈسمنڈ کا جسم خشک کرنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر رکھا ہوا لباس اٹھایا اور اسے پہنانے لگا۔ ڈسمنڈ کو یاد آیا کہ رنبیر نے کہا تھا کہ وہ اسے اپنا روایتی لباس پہنائے گا۔ ذرا دیر بعد جب وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو حیرت سے مسکرا دیا۔ سر پر بندھی ہوئی سنہری پگڑی' شیروانی اور چوڑی دار پائجامے میں وہ بالکل شہزادہ نظر آ رہا تھا۔

ملازم نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ لمبی راہداری سے گزر کر وہ جس کشادہ کمرے میں داخل ہوا وہ ہر قسم کے فرنیچر سے خالی تھا۔ ایک کونے میں دیوار سے ملحق دبیز قالینوں پر گاؤ تکیے سجے ہوئے تھے۔ ملازم نے اسے قالین پر بٹھا کر ایک گاؤ تکیہ اس کی پشت سے لگا دیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر دودھ کی طرح سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ کمرے میں روشنی بڑی مدھم تھی۔ ملازم اسے بٹھا کر چلا گیا۔ خالی کمرے میں ڈسمنڈ کو ایک بار پھر خوف کا احساس ہونے لگا۔ وہ حیران تھا کیا سے کیا ہو گیا ہے۔

اچانک اس کی نگاہ سامنے کی دیوار پر پڑی۔ وہ اچھل پڑا۔ دیوار پر لگی قد آدم تصویر اسے گھور رہی تھی۔ یہ ایک دراز قد شخص کی تصویر تھی جو کافی عمر رسیدہ تھا۔ اس کی سیاہ داڑھی اور گھنی مونچھوں نے شخصیت کو رعب دار بنا دیا تھا۔ اس کا انداز اور لباس شاہانہ تھا۔ کسی جابر سلطان کی طرح وہ ایک ہاتھ سے تلوار کا سہارا لئے کھڑا تھا اور اس کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی خونی آنکھیں غصے میں ڈسمنڈ کو گھور رہی تھیں۔ ان میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ کوشش کے باوجود ڈسمنڈ اپنی نگاہ نہیں ہٹا سکا۔ ایک نامعلوم سی قوت' ایک انجانا سا خوف۔ ڈسمنڈ خود کو ایک بے بس اور کمزور بچے کی مانند محسوس کر رہا تھا۔ وہ خوفناک آنکھیں اسے مسلسل گھور رہی تھیں اور پھر اسے محسوس ہوا جیسے وہ تصویر زندہ ہو گئی ہو۔ انتقام......... انتقام......... ڈسمنڈ کے کانوں سے عجیب سی غراتی ہوئی آواز ٹکرائی۔ اس قد آدم تصویر کے پیچھے ایک اور بھیانک تصویر بھی تھی۔ ایک خوفناک شکل والی عورت کی تصویر جس کے چار ہاتھ فضا میں بلند تھے۔ جس کا چہرہ بالکل سیاہ تھا اور جس کی خون کی طرح سرخ سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ ڈسمنڈ کالی دیوی کی شکل سے ناآشنا تھا۔

"تصویر پسند ہے؟"

ڈسمنڈ اچھل پڑا۔ اس نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کو اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا لیکن رنبیر کی آمد پر اس نے اطمینان کی سانس لی۔

"یہ میرے دادا مہاراجہ کرشن کی تصویر ہے۔" رنبیر نے بتلایا۔ "جسے تمہارے والد نے پھانسی دے دی تھی۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "یہ تصویر اسٹور روم میں رکھی ہوئی تھی۔ چند روز قبل مجھے نظر آئی تو میں نے یہاں لگوا دی۔ کیسی بارعب شخصیت تھی میرے دادا کی!"

"بڑی شاندار تصویر ہے۔" ڈسمنڈ نے اعتراف کیا۔ "ایسا لگتا ہے کوئی زندہ شخص سامنے کھڑا ہو۔ خصوصاً آنکھیں، لیکن یہ اس کے پیچھے اتنی بھیانک شکل کی تصویر کیوں لگوا دی ہے؟"

"بھیانک شکل! تم کالی دیوی کی بات کر رہے ہو۔ یہ ہماری دیوی ہے لیکن تم کو ہندو دھرم کے بارے میں نہیں معلوم۔ کالی دیوی کو ہم پوجتے ہیں۔ ہمارے اعتقاد کے مطابق کالی دیوی تمام تر شیطانی قوتوں کی مالک ہے۔ اس لئے اس کی پوجا مکمل تاریک رات میں ہوتی ہے۔ ہمارے مذہب کے مطابق انسان کبھی نہیں مرتا۔ صرف اس کا جسم مر جاتا ہے لیکن روح دوسری شکل میں پھر جنم لیتی ہے۔ آواگون کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ انسان کو نو سو ننانوے بار جنم لینا پڑتا ہے اور اس کا ہر جنم ایک مختلف روپ میں ہوتا ہے لیکن صرف کالی کو یہ شکتی اور قوت حاصل ہے کہ وہ کسی کو اس طویل عذاب سے بچا لے اور اسی لئے کالی کے پجاری بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ تم نے ٹھگوں کے بارے میں سنا ہوگا۔ وہ سب کالی کے پجاری ہوتے تھے۔ ڈاکہ زنی اور قتل ان کا پیشہ تھا اور یہ ایک طرح کی عبادت تھی۔ سر ولیم سلیمن نے ان کا صفایا کر دیا ورنہ راہ چلتے بے گناہ لوگوں کا شکار عام تھا۔ کالی کی پوجا کے لئے خون کی بھینٹ ضروری ہوتی ہے اور اسے انسانی خون بے حد پسند ہے۔"

"انتہائی بھیانک طریقہ ہے یہ عبادت کا۔" ڈسمنڈ نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ مہاراجہ رنبیر نے قہقہہ لگایا۔

"ہاں، لیکن تم بھوکے ہوگے۔ پہلے کھانا کھا لیا جائے۔"

رنبیر کے اشارے پر ملازموں کی ایک قطار کھانوں کے خوان لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ سامنے رکھی ہوئی لکڑی کی نیچی میز پر کھانے سجا دیئے گئے۔ کھانے اتنے انواع و

اقسام کے تھے کہ اگر مہاراجہ رنبیر خود ڈسمنڈ کے لئے ان کا انتخاب نہ کرتا تو وہ فیصلہ نہ کر سکتا۔ تمام کھانوں کا مزہ اس کے لئے نیا تھا۔ کھانے کے بعد پھلوں کا دور چلا اور پھر آخر میں بہترین قسم کی شمپین کے جام سامنے رکھ دیئے گئے۔

اور پھر اچانک ریشمی پردوں کے پیچھے پوشیدہ کمرے سے طبلے اور سارنگی کی موسیقی فضائیں ابھری۔

"تمہارے لئے میں نے ہندوستان کے کلاسیکی رقص کا انتظام کیا ہے۔" رنبیر نے کہا۔ "لطف آ جائے گا۔"

کمرے کے پیچھے سے نمودار ہونے والی رقاصہ بڑی کم عمر تھی۔ اس کی عمر بمشکل تیرہ برس کی ہوگی لیکن جسم بے حد لچکدار اور سڈول تھا اور چہرہ مخصوص میک اپ کے باوجود دلکش تھا۔ ڈسمنڈ کے لئے اس کا رقص بالکل نیا تھا۔ رقاصہ کے ہاتھوں کے اشارے، اس کی ہلتی ہوئی گردن اور اس کا تھرکتا ہوا جسم سب کچھ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

"اس کی ہر جنبش ایک اشارہ ہے۔ یہ رقص ایک کہانی ہے۔" رنبیر نے اسے بتلانا شروع کیا۔ شراب کے جام پر جام چلتے رہے۔ رقص جاری رہا۔ پھر ڈسمنڈ کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شاید وہ زیادہ پی گیا تھا لیکن اس کی نگاہیں رقاصہ پر مرکوز تھیں۔ جس کا جسم اب بجلی کی طرح تھرک رہا تھا۔ ڈسمنڈ بے خودی کے عالم میں دیکھتا رہا۔ اس کا جسم اتنی تیزی سے رقص کر رہا تھا کہ ڈسمنڈ حیران تھا۔

اچانک کم سن رقاصہ کے چہرے پر شدید خوف کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ اس طرح آگے بڑھائے جیسے کسی چیز سے بچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن جیسے اسے کسی نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہو۔ وہ جھکتی چلی گئی اور پھر فرش پر گر پڑی۔ خوف سے ایک دلخراش چیخ اس کے حلق سے بلند ہوئی۔ ڈسمنڈ نے غصے میں اٹھنا چاہا۔ لیکن اس کے ہاتھ پیروں میں جنبش نہ ہوئی۔ وہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ لڑکی فرش پر بے بسی کے عالم میں پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر کسی انجانی قوت نے جکڑ رکھے تھے اور پھر اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ بلند ہوئی۔ موسیقی کی آواز اتنی تیز ہو چکی تھی کہ کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ پھر سفید اجلی چاندنی پر سرخ سرخ خون بہنے لگا۔ ڈسمنڈ سکتے کے عالم میں گھور رہا تھا۔ اس نے برابر بیٹھے ہوئے رنبیر کی سمت دیکھا لیکن رنبیر وہاں نہیں تھا اور پھر اسے محسوس ہوا

کہ وہ بالکل تنہا ہے۔ کمرے میں کوئی بھی موجود نہ تھا۔

ایک بھیانک کھنکتا ہوا قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔ ڈسمنڈ نے گھبرا کر سامنے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ تصویر کا فریم خالی تھا۔ مہاراجہ راج کرشن کی تصویر غائب تھی۔ خالی فریم اسے گھور رہا تھا اور تب اس کی نظر کالی دیوی کے چہرے پر پڑی۔ کالی کی سرخ زبان خون سے تر نظر آرہی تھی۔ تازے تازے سرخ خون سے۔

☆------☆------☆

"میں بے حد شرمندہ ہوں ڈسمنڈ۔" مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بڑے خلوص کے ساتھ معذرت کی۔ "دراصل غلطی میری ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ ایک خاص مہمان آنے والے ہیں۔ ایسے موقع پر محل میں عموماً شمپئن میں دیسی شراب ملا کر ذرا تیز شراب تیار کی جاتی ہے۔ ریاست کے زمیندار اسے بہت پسند کرتے ہیں اور اس روز تمہارے لئے بھی ان بدبختوں نے یہی کیا۔"

"کوئی بات نہیں ہز ہائی نس۔" ڈسمنڈ نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ اس وقت سائٹ پر کھڑے تھے جہاں بند کی تعمیر کا کام جاری تھا۔

سامنے سینکڑوں مزدور کھدائی کرنے میں مصروف تھے۔ ایک سمت کھدی ہوئی مٹی کو اٹھا اٹھا کر بند کا پشتہ بنایا جا رہا تھا۔

"مجھے ڈر تھا کہ تم خفا ہو گئے ہو۔ اس ویرانے میں تم میرے واحد دوست ہو۔" رنبیر نے کہا۔ وہ اس وقت اپنے مشکی رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا۔ "کام کی رفتار ٹھیک جا رہی ہے؟"

"ہاں۔ میرا اسسٹنٹ انجینئر سورس کہتا ہے کہ ہم بند کی بنیادیں جلد مکمل کر لیں گے۔ پھر پشتے کی تکمیل باقی رہ جائے گی۔"

"ہاں جتنی جلد یہ کام ہو جائے اچھا ہے۔ تم کو تو معلوم ہے' کبھی یہی جھیل مدھرنا کی وادی کا واحد سہارا تھی۔ جھیل کے اردگرد تمام پرانی آبادی اس لئے آباد تھی لیکن اب یہ لوگ پانی کے لئے پریشان ہیں۔"

"ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے ہز ہائی نس۔"

"رنبیر یاد رکھو' میں تمہارے لئے صرف رنبیر ہوں۔" مہاراجہ نے کہا۔ "ہاں' کیا کہہ رہے ہو تم؟"

ڈسمنڈ نے جھیل کے درمیان ایک جزیرہ نما ٹیلے کی سمت اشارہ کیا جس پر گھنے پیڑ

اگے ہوئے تھے۔

"یہ اس ٹیلے پر آج کل بہت سے مزدور کچھ کام کر رہے تھے۔"

"ہاں۔ یہ پہلے جھیل کے درمیان ایک جزیرہ سا تھا لیکن پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ مجھے پتہ نہیں کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں لیکن اس ٹیلے سے بڑی تعداد میں پیڑ کاٹ کر لے جائے جا رہے ہیں۔ تمام دن یہ کام جاری رہتا ہے۔ بڑے بڑے شہتیر بیل گاڑیوں پر لے جائے جاتے ہیں جیسے کسی عمارت کی تعمیر کا کام ہو رہا ہو اور یہ لوگ اپنا وقت ضائع کر رہے ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"جب بند کا پانی چھوڑا جائے گا تو یہ جزیرہ اور اس سے ملحق تمام علاقہ پانی میں ڈوب جائے گا۔ اس طرح ان کی تمام محنت ضائع ہو جائے گی۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔" مہاراجہ نے قدرے فکرمند لہجے میں کہا۔ "میں دیکھوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور روانہ ہو گیا۔

اس رات جب ڈسمنڈ ریذیڈنسی واپس پہنچا تو اس کے خانساماں حسین خان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "صاحب! میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" حسین خاں نے پریشانی میں اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے حسین خان؟" ڈسمنڈ نے جواباً پوچھا۔ وہ خانساماں کی بڑی عزت کرتا تھا کیونکہ وہ انتہائی ایمان دار اور مستعد آدمی تھا۔

"کیا آپ مجھے گھر جانے کی اجازت دے سکتے ہیں؟"

"تم چھٹی جانا چاہتے ہو؟"

"جی نہیں صاحب! میں ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تم جانتے ہو کہ میں تم سے کتنا خوش ہوں۔ کیا تمہیں کوئی تکلیف ہے؟"

"آپ بہت مہربان افسر ہیں صاحب لیکن بات یہ ہے کہ شاید آپ یقین نہ کریں لیکن میں بہت پکا مسلمان ہوں' اور بچپن سے ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خاص قوت عطا کر رکھی ہے کہ میں آنے والی مصیبت کا بہت پہلے سے اندازہ کر لیتا ہوں' اور میری چھٹی حس بار بار یہ کہہ رہی ہے کہ مدھرنا پر کوئی بہت بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" ڈسمنڈ نے جھنجلا کر کہا۔ "میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔"

"صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ جگہ فوراً چھوڑ دینی چاہیے۔ یہاں شیطانی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ یہاں آپ کے لئے بہت خطرہ ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں اپنا کام چھوڑ کر چلا جاؤں۔"

"تو پھر صاحب میرا استعفیٰ قبول کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی دوسرا آدمی مل جائے تو تم چلے جانا۔"

"میں نے دوسرے خانساماں کا بندوبست کر دیا ہے صاحب۔ وہ یہیں کا رہنے والا ہے اور بڑا تجربے کار ہے۔" حسین خان نے کہا۔ "صاحب آپ خفا نہ ہوں تو پوچھوں کہ رات کب اور کیسے واپس آئے تھے؟ میں بہت ہلکی نیند سوتا ہوں۔ آپ کے کمرے میں جانے کا ایک ہی راستہ ہے جو میرے بستر کے پاس سے گزرتا ہے۔ اگر آپ اس راستے سے جاتے تو میں ضرور جاگ جاتا۔"

ڈسمنڈ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خود اس بات پر حیران تھا کیونکہ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر تھا۔ اپنا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اسے کس نے اور کس طرح محل سے ریذیڈنسی تک پہنچایا اور اس کے دروازے پر سونے والے خانساماں کو اس کی آمد کا پتہ کیوں نہ چلا' یہ سب ڈسمنڈ کے لئے معمہ تھا۔

وہ حسین خان کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حسین و نوجوان باربرا' کم سن رقاصہ اور پھر اس کا بھیانک حشر۔ یہ سب اسے ایک ڈراؤنا خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ رات کے کھانے پر اس نے قائم مقام ریذیڈنٹ مسٹر پلکاٹ سے باربرا کا ذکر کیا۔

"اوہ باربرا۔ بڑی سویٹ بچی ہے اور انتہائی قابل رحم بھی۔ ہندوستان میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ مہاراجہ نے اس پر رحم کھا کر اس کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا ہے اور اس کا بڑا خیال رکھتا ہے۔"

"لیکن وہ انگریز ہے۔ پھر ریذیڈنسی نے اس کی مدد کیوں نہیں کی؟"

"المناک داستان ہے۔ اس کا باپ لیفٹیننٹ رابرٹ مہاراجہ کی فوج میں ملازم تھا۔ مہاراجہ کی موت کے بعد اس کے باپ کی بھی اچانک موت واقع ہو گئی۔ مسز رابرٹ دلی چلی گئی۔ وہاں اس نے ایک مسلمان فوجی افسر سے شادی کر لی لیکن ایک حادثے میں وہ دونوں ہلاک ہو گئے۔ مہاراجہ رنبیر جب گدی پر بیٹھا تو اس نے لیفٹیننٹ رابرٹ کی وجہ

سے باربرا کو یہاں اپنے ہاں گورنس رکھ لیا۔"

"لیکن ریذیڈنٹ نے ایک انگریز لڑکی کو محل میں رہنے کی اجازت کیوں دی؟"

"اوہ بوڑھا ریذیڈنٹ مہاراجہ رنبیر کو بیٹے کی طرح پیار کرتا ہے۔ دراصل رنبیر کے باپ سے اس کی گہری دوستی تھی اور اسی نے رنبیر کو تعلیم کے لئے لندن بھیجنے کا اصرار کیا تھا۔ ویسے بھی مہاراجہ رنبیر سے باربرا کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اس کا بڑا خیال رکھتا ہے۔"

ڈسمنڈ اس بات پر یقین کر لیتا لیکن رات کو اس نے رنبیر کا جو روپ دیکھا تھا' اس کے بعد اسے شبہ تھا۔ دن میں رنبیر جتنا خلیق اور انسان دوست نظر آتا تھا' رات کو اس سے مختلف تھا۔ بال بوائے کو ریکٹ مار کر زخمی کرنے کا واقعہ وہ نہیں بھولا تھا اور پھر نو عمر رقاصہ کا بھیانک انجام اس کے ذہن میں تازہ تھا۔

کھانے کے بعد جب ڈسمنڈ چلنے لگا تو پلکاٹ نے اس سے کہا۔ "ڈسمنڈ تم عموماً تنہا گھومتے رہتے ہو۔ احتیاطاً اپنے ساتھ ریوالور رکھ لیا کرو۔"

"کیوں؟"

"کچھ دنوں سے علاقے میں ٹھگی کی وارداتیں عام ہو گئی ہیں۔ شاید ٹھگوں نے پھر اپنا پرانا پیشہ شروع کر دیا ہے۔ کئی راہگیروں کے قتل کی اطلاعات ملی ہیں۔"

"لیکن کیا اس دور میں ٹھگوں کو دن دہاڑے قتل کی جرأت ہو سکتی ہے؟"

"ہاں۔ شاید تم نہ جانتے ہو۔ ٹھگ دراصل کالی کے پجاری ہوتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ قتل و غارت گری سے کالی خوش ہوتی ہے۔ یہ بے ہودہ تصور ریاست میں زندہ ہو رہا ہے۔ یہ پیدل چلنے والے مسافروں کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ بظاہر خود کو بھی مسافر بتلاتے ہیں لیکن موقع ملتے ہی مسافر کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیتے ہیں اور اس کو لوٹ لیتے ہیں۔ ان کی ایک خاص نشانی ہے۔ گلے میں ایک رنگین ریشمی رومال بندھا ہوتا ہے اور اسی رومال کا ایک جھٹکا مسافر کی گردن توڑ دیتا ہے۔ یہ قتل کے اس فن میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ اس لئے محتاط رہنا ضروری ہے۔"

☆======☆======☆

باربرا اپنی خواب گاہ میں بستر پر لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی۔ اسے راج محل میں رہتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ راجہ رنبیر بھی اس کے ساتھ بالکل بہن کی طرح سلوک کرتا تھا۔ مہاراجہ کے بچے اس سے بے حد مانوس ہو چکے تھے۔ مہارانی نے اسے اپنی سہیلی بنا رکھا تھا۔ راج محل کے تمام ملازم اس کی اتنی عزت کرتے تھے جیسے وہ شاہی

خاندان کی ایک فرد ہو۔

لیکن چند روز سے ایک عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ اسے کوئی نام نہ دے سکتی تھی لیکن اب یہ راج محل اور اس کا ماحول بدلا بدلا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ عمارت وہی تھی۔ لوگ وہی تھے لیکن ان کا رویہ ویسا نہیں تھا اور خصوصاً مہاراجہ جو اس کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آتا تھا۔ ہمیشہ اصرار کرتا تھا کہ وہ اسے مہاراجہ نہیں اپنا بھائی تصور کرے۔ اسے ہز ہائی نس نہیں رنبیر کہے کیونکہ اس کی کوئی بہن نہ تھی اور باربرا نے رنبیر کی موجودگی میں کبھی خود کو غیر محفوظ نہیں محسوس کیا تھا' لیکن چند روز سے اس کی نظریں بدلی بدلی سی تھیں۔ باربرا نے محسوس کیا تھا کہ کبھی کبھی اس کی نگاہیں بڑی ہولناک ہو جاتی تھیں۔ وہ اس کے جسم کو کسی بھوکے شیر کی طرح گھورنے لگتا تھا لیکن وہ اس شبہے کا اظہار نہ کر سکتی تھی کیونکہ رنبیر نے ابھی تک کوئی دست درازی نہ کی تھی۔

سب سے عجیب بات یہ تھی کہ مہاراجہ پر یہ ہولناکی کا موڈ تاریکی چھانے کے بعد طاری ہوتا تھا۔ دن میں وہ بالکل نارمل رہتا تھا۔ بچوں میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ دن بدن خودسر اور بدتمیز ہوتے جا رہے تھے۔ خاص طور پر رنجیت تو کبھی کبھی اسے شدید نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ اس کے بتائے ہوئے مغربی آداب و تہذیب کا دانستہ مذاق اڑانے لگا تھا۔ اس نے پان کھانا شروع کر دیا تھا اور باربرا کو ستانے کے لئے وہ اسے دیکھ کر فرش پر ہی پیک تھوک دیتا۔ اس کی بہن لکشمی بھی بھائی کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ انھوں نے انگریزی پڑھنا ترک کر دیا تھا اور انگریزوں کا ہتک آمیز انداز میں مذاق اڑانے لگے تھے۔

یہ سب تبدیلی کیوں ہوئی تھی؟ محل کے ملازم بھی اب باربرا کے حکم کی تعمیل ہتک آمیز انداز میں کرنے لگے تھے۔ آخر اس تبدیلی کا سبب کیا تھا؟

باربرا بستر پر لیٹی ہوئی سوچتی رہی۔ اسے گرمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر غسل کرے لیکن نہ جانے کیوں اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ جیسے کسی انجانی قوت نے اسے بالکل بے حس کر دیا ہو۔

وہ شب خوابی کا لباس پہنے لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی۔ ایک عجیب سی خوف و ہراس کی کیفیت ماحول پہ طاری تھی۔ اس کا دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔ کسی انہونی بات کا خدشہ بار بار اسے خبردار کر رہا تھا۔ آج تک اس نے محل میں کبھی ایسا خوف محسوس نہیں کیا تھا۔

اچانک صندل کی ہلکی ہلکی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔ اس نے کھلی ہوئی کھڑکی کی سمت دیکھا جس پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ شاید کوئی عورت صندل کا عطر لگائے ہوئے دریچے کے پاس سے گزری ہو لیکن خوشبو ہر لحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ خوشبو کے تیز بھبکوں کے ساتھ اب ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز ابھرنے لگی تھی۔ باربرا حیران تھی کہ اس وقت محل کے زنان خانے میں موسیقی کون بجا رہا تھا۔ طبلے کی تھاپ' سارنگی اور گھنٹیوں کی آواز ہر لحہ قریب آرہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتے لگا تھا جیسے سازندے اس کے کمرے کے دروازے پر آگئے ہوں۔ باربرا نے گھبرا کر دروازے کو دیکھا۔ وہ بند تھا لیکن موسیقی اتنی تیز ہوتی جا رہی تھی جیسے اس کے سر پر بج رہی ہو۔

اور پھر اچانک باربرا کو محسوس ہوا جیسے وہ تنہا نہ ہو۔ کوئی اور اس کے کمرے میں موجود تھا۔ کوئی ان دیکھا وجود جو آہستہ آہستہ اس کے قریب آرہا تھا۔ اس نے خوف سے چیخنا چاہا لیکن حلق نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ خوف و دہشت سے اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور پھر اس کی نگاہیں خود بخود سامنے اٹھیں اور انگارے کی طرح دہکتی ہوئی دو سرخ آنکھوں سے ٹکرائیں۔ وہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور پھر آہستہ آہستہ ایک سیاہ داڑھی اور خوفناک چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگا۔ سفید چمکتے ہوئے دانت مسکراہٹ کے پیچھے نمودار ہوئے۔ ان آنکھوں میں عجیب سی مقناطیسی کشش تھی.......... کوشش کے باوجود باربرا کی نظریں نہ ہٹ سکیں اور اسے اپنے بدن میں ایک عجیب سنسنی سی پیدا ہوتی محسوس ہونے لگی۔ آنکھوں میں بلا کی ہولناکی تھی۔ عجیب سی گندی اور شیطانیت بھری آنکھیں تھیں جو آہستہ آہستہ اس کے قریب آرہی تھیں۔

باربرا کا جسم بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ بند کمرے میں یہ شخص کیسے گھس آیا۔ زنان خانے کے اس حصے میں زبردست پہرہ رہتا تھا اور سوائے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے کوئی مرد ادھر نہ آسکتا تھا۔ پہرے دار ہر لحہ چوکس رہتے تھے لیکن پھر بھی وہ اندر آگیا۔ کافی دیر تک وہ حریص اور ہوسناک نگاہیں باربرا کے نیم عریاں جسم کے انگ انگ کا جائزہ لیتی رہیں۔ باربرا کوشش کے باوجود بالکل جنبش نہ کر سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ' پیر' جسم بالکل پتھر کی طرح منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ موسیقی کے ساتھ اب اس کے سامنے عجیب سی منحوس اور شیطان صورت شکلیں رقص کرنے لگی تھیں۔ انتہائی گھناؤنا اور بے حیائی کا رقص۔ وہ چیخ بھی نہ سکتی تھی۔ اس کی آواز بھی منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک گندہ، گھناؤنا اور فلک شگاف قہقہہ فضا میں بلند ہوا.......... اور وہ مکروہ چہرہ باربرا کے بالکل اوپر جھکا ہوا تھا۔ صندل کی تیز خوشبو اس کے دماغ میں گھستی جا رہی تھی۔

خوف کی ایک چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس بے شرمی اور بے حیائی پر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے لیکن وہ بالکل بے بس تھی۔ اس کا جسم حرکت سے محروم ہو چکا تھا۔ باربرا کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر مدد کے لئے آواز دے اور خود کو اس شیطانی وجود سے بچانے کے لئے جدوجہد کرے لیکن وہ کچھ نہ کر سکی۔ نگاہوں کی ہوس تیز ہوتی جا رہی تھی........ اور پھر اس کے لبوں سے ایک چیخ اٹھی لیکن آواز نہ نکل سکی۔ خوف سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔

باربرا کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اور جب آنسوؤں کے پردے ہٹے تو اسے اپنے اوپر انسان کے بجائے ایک شیر جھکا ہوا نظر آیا۔ اس کی لمبی سرخ زبان لٹک رہی تھی۔ باربرا کو پھر کچھ یاد نہ رہا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ فضا میں مکروہ بھیانک قہقہے گونج رہے تھے۔

جب اسے ہوش آیا تو کمرہ خالی تھا۔ نہ وہ شیر تھا۔ نہ وہ بھیانک داڑھی والا چہرہ اور نہ موسیقی کی کان پھاڑ دینے والی آواز۔ ہر سمت موت کا سا سکوت طاری تھا۔ اچانک اسے اپنے دروازے پر مہاراجہ رنبیر کھڑا نظر آیا جو حریص نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

باربرا تڑپ کر اٹھی۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں سے خود کو چھپانے کی ناکام کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے جب اس کی نگاہیں اوپر اٹھیں تو وہ حیران رہ گئی۔ نہ وہاں مہاراجہ تھا نہ کوئی اور۔ کمرہ بالکل خالی تھا اور دروازہ اندر سے مقفل تھا۔

باربرا نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ بھلا بند کمرے میں کوئی کیسے آ سکتا تھا لیکن لیکن.......... اس نے سہم کر اپنے جسم کو دیکھا۔ جگہ جگہ خراشیں تھیں اور بستر پر خون کے سرخ سرخ دھبے تھے۔

یہ خواب نہیں تھا لیکن پھر کیا تھا۔ وہ کون تھا جو بند دروازوں سے گزر کر اندر گھس آیا تھا؟ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

☆======☆======☆

ڈسمنڈ نے دیکھا کہ اسسٹنٹ انجینئر میکنزی کو مزدوروں نے گھیر رکھا ہے اور وہ ان پر غصے میں برس رہا ہے۔ وہ تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا اس بلند ٹیلے کے پاس پہنچا جہاں تمام مزدور جمع تھے۔

"کیا بات ہے میکنزی؟" اس نے پوچھا۔

"سر۔ یہ توہم پرست لوگ کام کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ کہتے ہیں کہ ان درختوں کے جھنڈ میں کوئی بزرگ رہتے ہیں اور اس جگہ کی کھدائی سے وہ خفا ہو جائیں گے۔"

ڈسمنڈ نے جیسے ہی مزدوروں کی سمت دیکھا، انہوں نے بیک وقت بولنا شروع کر دیا۔ ڈسمنڈ نے ان کو اشارے سے چپ کرایا۔

"ٹھہرو۔ میں خود ان بزرگ سے جا کر بات کرتا ہوں۔"

اس نے اپنا گھوڑا بڑھایا۔ گھنے درختوں کے درمیان جاتے والی پتلی سی پگڈنڈی پر وہ آگے بڑھنے لگا۔ درختوں نے ہر سمت مکمل سایہ کر رکھا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور چڑیوں کی مترنم چہچہاہٹ نے گرد و پیش کو بڑا پُرسکون بنا دیا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اسے وہ جھونپڑی نظر آ گئی۔ مختصر سی پرانی جھونپڑی جس کی دیواروں کے گرد چکنی مٹی کی منڈیر تھی اور جھونپڑی کے برابر ہی ایک چوکور چبوترا تھا۔ صاف ستھرا اور ہموار۔ جھونپڑی پر مختلف قسم کے پھلوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور چبوترے پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔

جیسے ہی ڈسمنڈ کا گھوڑا جھونپڑی کے قریب پہنچا۔ ایک انتہائی ضعیف شخص جس کی لمبی سفید داڑھی کے ریشمی بال بکھرے ہوئے تھے، باہر نکلا۔ وہ اتنا دراز قد تھا کہ کمر جھک گئی تھی۔ باہر نکل کر اس نے ڈسمنڈ کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

"ہیلو مسٹر ڈسمنڈ۔ ٹھیک ہو؟" اس نے اتنی شستہ انگریزی میں کہا کہ ڈسمنڈ حیران رہ گیا۔ "آؤ۔ کچھ دیر میرے پاس بیٹھو۔ مجھے یقین تھا کہ ایک دن تم یہاں ضرور آؤ گے۔"

بوڑھے شخص نے چبوترے پر پڑی ہوئی چٹائی کو صاف کر کے کنارے گھسیٹا اور ڈسمنڈ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی بارعب شخصیت میں ایک عجیب سی کشش تھی جس نے ڈسمنڈ کو گھوڑے سے اتر کر وہاں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ بوڑھے کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر مسلسل رواں تھیں۔

"تم میری انگریزی پر حیران ہو رہے ہو گے کہ اس ویرانے میں رہنے والا ایک گوشہ نشین بوڑھا یہ زبان کیسے بول سکتا تھا۔" وہ آہستہ سے مسکرایا۔

”بے شک۔“ ڈسمنڈ نے جواب دیا۔ ”آپ بالکل انگریزوں کی طرح یہ زبان بول رہے ہیں۔“

”آہ۔ تم کو حیرت ہوگی کہ میں بھی کبھی اس ملک کا باشندہ تھا جسے تم برطانیہ سے ہو۔ میں آئرلینڈ میں پیدا ہوا۔ کبھی میرا نام پیٹرک جیمسن تھا۔ لیفٹیننٹ پیٹرک جیمسن اور میں سر چارلس کی اس رجمنٹ میں شامل تھا جس نے برطانوی باشندوں کی جان بچانے کے لئے مدھرنا کے منحوس کالی مندر پر حملہ کیا تھا۔“

”اوہ تو آپ میرے والد کے ساتھیوں میں سے ہیں؟“ ڈسمنڈ نے خوش ہو کر کہا۔

”ہاں‘ اور مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری یہاں کوئی خاطر نہیں کر سکتا۔“

”آپ سے مل کر مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ اس سے بڑی خاطر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ میں یہاں انجینئر کی حیثیت سے بند تعمیر کر رہا ہوں۔ بند کے پشتے کے لئے میرے اسسٹنٹ نے اس ٹیلے کی مٹی کھودنے کا حکم دیا تو مزدوروں نے کھدائی سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں کوئی بزرگ رہتے ہیں۔ میں یہ دیکھنے کے لئے ادھر آیا تھا کہ وہ بزرگ کون ہیں۔ آپ اطمینان رکھئے اب ادھر کھدائی نہیں ہوگی۔ مجھے بتلایئے کہ میں اور کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”شکریہ ڈسمنڈ۔“ عمر رسیدہ شخص نے کہا۔ ”میں دنیا ترک کر چکا ہوں۔ اس گوشے میں مجھے خدا کی دی ہوئی ہر نعمت میسر ہے۔ میری زیادہ تر ضروریات آبادی کے غریب لوگ پوری کر دیتے ہیں جو اپنے مصائب لے کر یہاں آتے ہیں۔ میرے پاس ان کے لئے صرف دعائیں ہیں۔“

”پھر بھی۔ آپ کچھ تو فرمائش کریں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت کروں۔“

”خدا تم کو خوش رکھے بیٹے۔“ بزرگ نے کہا اور پھر مسکرا دیا۔ ”نوجوانی میں مجھے تمباکو چبانے کا بہت شوق تھا۔ کچا تمباکو۔ اگر تھوڑا سا مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

”میں خود آپ کو تمباکو پہنچانے آؤں گا۔“

”خدا تم کو خوش رکھے.........“ بزرگ نے کہا۔ ”مجھے تم کو ایک ضروری ہدایت کرنا ہے کہ محتاط رہنے کی کوشش کرو۔ اس آبادی میں شیطانی قوتیں پھر سر اٹھا رہی ہیں اور تمہیں نقصان پہنچانا چاہتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ ڈسمنڈ نے چونک کر پوچھا۔ اسے حسین خان کی بات یاد آ گئی۔

”سر چارلس نے جب مہاراجہ راج کرشن کو پھانسی پر لٹکایا تو میں موجود تھا۔ میں نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے بعد فوج کے جن لوگوں کو ریاست میں چھوڑا گیا ان میں بھی شامل تھا۔ کالی کے مندر میں ان دنوں عجیب بھیانک وارداتیں شروع ہو چکی تھیں۔ انہی دنوں میری ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی۔ تم یہ جھونپڑی دیکھ رہے ہو‘ اس میں ان کا مزار بھی ہے۔ مجھے ان کی تعلیم نے نئی روشنی دی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان طاغوتی قوتوں کا مقابلہ صرف کلام الٰہی سے کیا جا سکتا ہے اور میں نے ان بزرگ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ شاید تم کو یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے والوں پر کالی یا اس جیسی کسی بد قوت کا اثر نہیں ہوتا اور ان طاغوتی قوتوں کو صرف قرآنی آیات کی برکت سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کالی کی طاغوتی قوت تم سے انتقام لینے پر مائل ہو۔ تم جب دوبارہ میرے پاس آؤ گے تو میں تمہارے لئے کچھ کروں گا۔“

ڈسمنڈ حیرت زدہ نگاہوں سے ان کی بزرگ صورت کو گھور رہا تھا۔ اسے راج محل کی وہ رات یاد آ رہی تھی جب کھانے کے بعد رقص دیکھتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

”مجھے ان توہمات پر یقین نہیں ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

بزرگ مسکرائے۔ ”میں توہمات کی باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ بدی کی قوتیں ایک حقیقت ہیں۔ کالی پوجا ان قوتوں کو زندہ کرنے کا نام ہے اور ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تم جب دوبارہ آؤ گے تو میں تمہارے لئے کچھ کروں گا۔ خدا حافظ‘ اب میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“

”خدا حافظ مسٹر جیمس۔“ ڈسمنڈ نے کہا۔

”اب میں جیمس نہیں‘ رضوان ہوں۔“ بوڑھے نے اسے یاد دلایا۔ ”رضوان احمد۔“

ڈسمنڈ نے اسے دوبارہ خدا حافظ کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر واپس چل دیا۔ وہ جب مزدوروں کے درمیان پہنچا تو سب لوگ اس کے فیصلے کے منتظر تھے۔

”اس جگہ کھدائی نہیں ہوگی میکنزی۔“ ڈسمنڈ نے مختصر سا حکم دیا اور آگے بڑھ گیا۔

☆======☆=====☆

ڈسمنڈ ایک لمحے کے لئے مبہوت رہ گیا۔

وہ اپنی ضروریات کی کچھ چیزیں خریدنے کے لئے شہر کی اس دکان میں داخل ہوا تھا اور وہ اس کے بالکل برابر کھڑی ہوئی تھی لیکن کیا یہ وہی تھی؟ ڈسمنڈ نے آہستہ سے کہا۔

"مس باربرا۔"

باربرا نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی پہچان لیا۔ "آپ۔ آپ ہز ہائی نس کے ساتھ اس رات راج محل آئے تھے۔"

"ہاں۔ میں ڈسمنڈ ہوں لیکن۔ لیکن۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "آیئے ہم کلب بار میں چائے پئیں۔"

ہوٹل کے نیم تاریک ہال میں اس وقت صرف چند لوگ موجود تھے۔ ڈسمنڈ اسے لئے ہوئے ایک کونے کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ باربرا کھوئی کھوئی سی تھی۔ ڈسمنڈ اس کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ پھول کی طرح تروتازہ چہرہ بالکل سفید ہو چکا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ ان کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ وہ دق کی مریضہ نظر آ رہی تھی۔ چند روز کے اندر اتنی حیرت انگیز تبدیلی ڈسمنڈ نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

"مس باربرا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں پوچھوں۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں بمشکل آپ کو پہچان سکا۔ کیا آپ بیمار ہیں؟"

باربرا کے چہرے پر غم کے بادل چھا گئے۔ اس کے لبوں پر ایک پژمردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ڈسمنڈ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"مجھے افسوس ہے۔ میں.........."

"پلیز مسٹر ڈسمنڈ۔ آپ معذرت نہ کریں.......... میں.......... میں اس قابل نہیں ہوں۔"

اور پھر میز پر سر رکھ کر وہ ہچکیاں لینے لگی۔ ڈسمنڈ گھبرا گیا لیکن باربرا نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ وہ کرسی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھے۔

"میری زندگی عذاب بن گئی ہے مسٹر ڈسمنڈ۔ میں جہنم کی آگ میں جل رہی ہوں۔"

"کیا رنبیر.........."

"نہیں۔ نہیں۔" اس نے فوراً تردید کی۔ "ایسی کوئی بات نہیں لیکن کیا.......... کیا آپ کو شیطانی قوتوں پر اعتقاد ہے؟"

ڈسمنڈ چونک پڑا۔

"شیطانی قوتیں؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"شاید آپ مجھے پاگل تصور کریں لیکن بہتر یہ ہو گا کہ میں آپ کو سب کچھ بتلا دوں۔"

اور پھر باربرا نے اسے تمام باتیں تفصیل سے بتلانا شروع کیں۔ ان دیکھی اور انجانی قوتوں کا کھیل، پُراسرار خوشبو۔ موسیقی، اور وہ بھیانک چہرہ جس کی دہکتی ہوئی آنکھیں اسے بے بس کر دیتی تھیں۔

"آپ مرد ہو کر شرما رہے ہیں۔" باربرا نے کہا۔ "لیکن میں نے حقیقت بیان کی ہے۔ یقین کریں میرا دماغ خراب نہیں ہوا ہے۔ نہ میں وہمی ہوں، لیکن وہ شیر اور وہ شیطانی ہیولا۔ یہ سب کچھ میں نے جاگتے ہوئے دیکھا ہے خواب میں نہیں۔ اور مجھ پر جو بیتی ہے وہ بھی حقیقت ہے۔ اس شیطان نے میری بے بسی سے فائدہ اٹھایا ہے مجھے بے بس کر کے لوٹا ہے اور.......... اور.......... اب میں ناپاک ہوں مسٹر ڈسمنڈ۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

ڈسمنڈ کی نگاہوں میں نوعمر رقاصہ کا انجام گھوم گیا۔ تو وہ سب کچھ بھی حقیقت تھا۔ باربرا بھی اسی طرح اس شیطان کے انتقام کا نشانہ بنی تھی اور باربرا معصوم تھی۔ اسے اب احساس ہوا کہ باربرا اسے کتنی عزیز تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس نے باربرا کے دونوں ہاتھوں کو بھینچ لیا۔

"سنو باربرا۔ تم اب بھی معصوم ہو اور تم کو واقعی شیطانی قوتوں کا سامنا ہے۔ میں جانتا ہوں۔" اور تب اس نے باربرا کو مہاراجہ راج کرشن کی پھانسی اور اپنے تجربے کی تفصیلات بتلائیں۔ وہ حیرت زدہ ہو کر سنتی رہی۔

☆==========☆==========☆

رضوان احمد کے چہرے پر ان کو دیکھ کر بہت میٹھی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انہوں نے باربرا کو بڑی شفقت کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ وہ اس وقت اس چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے جو مسجد کا کام دیتا تھا اور عبادت سے فارغ ہونے کے بعد وہ تسبیح پڑھ رہے تھے۔

"ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔" ڈسمنڈ نے ان کو اب تک کے تمام معاملات بتلانے کے بعد کہا۔

"خدا تم کو اس نیک ارادے میں کامیاب کرے۔" رضوان احمد نے جواب دیا۔

"ہم آپ کی طرح مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔" ڈسمنڈ نے کہا۔

"کیوں.........؟" رضوان احمد نے سوال کیا۔

"آپ نے کہا تھا کہ مسلمانوں پر بدی کی قوتیں اثر نہیں کرتی ہیں۔"

رضوان احمد مسکرا دیا۔ "بدی کے خوف سے مسلمان ہونا چاہتے ہو؟ نہیں میرے بیٹے' اسلام قبول کرنا ہے تو نیکی کی راہ پر چلنے کے لئے کرو۔ اسلام میں جبر نہیں ہے اور اسلام قبول کرنے سے پہلے تم کو اس کے بنیادی اصولوں پر ایمان لانا ہوگا۔ میں تم کو بتلاتا ہوں۔" وہ کافی دیر تک دونوں کو اسلام اور کلام الٰہی کی تفسیر بتلاتے رہے۔

"اگر تمہارا دل اس دین کو قبول کرتا ہے تو بسم اللہ۔"

اور پھر یہ نوجوان جوڑا رضوان احمد کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا۔ انہوں نے دونوں کا نکاح پڑھایا۔ ڈسمنڈ کا اسلامی نام عرفان احمد اور باربرا کا ہاجرہ خاتون رکھا۔ دونوں کو بڑی شفقت اور مسرت سے دعائیں دیں اور ان پر آیاتِ مبارکہ کا دم کرنے کے بعد وہ اٹھ کر اپنی جھونپڑی میں گئے۔ واپس آ کر انہوں نے دونوں کے بازوؤں پر تعویذ باندھے اور ان پر دوبارہ دم کیا۔

"اب تم دونوں ربِ کعبہ کے تحفظ میں ہو۔ بدی کی کوئی قوت تم پر اثر انداز نہ ہوگی۔" انہوں نے دونوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔

نو بیاہتا جوڑا جب ریذیڈنسی پہنچا تو قائم مقام ریذیڈنٹ مسٹر پلکاٹ ان کی شادی کی خبر پر حیران رہ گئے۔ انہوں نے بڑی مسرت اور گرم جوشی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ رات کو انہوں نے دونوں کی شادی کی خوشی میں زبردست دعوت کا اہتمام کیا۔ جب انہوں نے شراب پینے سے انکار کر دیا تو مسٹر پلکاٹ کو بڑی حیرت ہوئی لیکن انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ ڈسمنڈ نے انہیں مذہب کی تبدیلی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

سب سے زیادہ خوش حسین خان تھا۔ ڈسمنڈ نے اس کو حقیقت بتا دی تھی۔ حسین خان نے عجلت میں ان کا حجلہ عروسی تیار کیا اور پھر ان کو پھولوں سے سجی ہوئی سیج تک اس طرح پہنچایا جیسے وہ اس کے اپنے بچے ہوں۔

رات خاصی ہو گئی تھی۔ باربرا خوشی سے نڈھال تھی۔ اس نے کبھی اس مسرت انگیز لمحہ کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

وہ بستر پر لیٹے ہوئے مستقبل کے سنہرے خواب دیکھ رہے تھے کہ اچانک باربرا چونک اٹھی۔

"کیا ہوا؟" ڈسمنڈ نے پوچھا۔

"یہ......... یہ آواز سن رہے ہو؟"

ڈسمنڈ نے غور کیا۔ شیطانی موسیقی۔ وہی موسیقی جو اس نے راج محل میں سنی تھی۔ آواز آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ باربرا خوف سے سہم کر اس سے لپٹ گئی۔

ڈسمنڈ خاموش تھا۔ اس نے مضبوطی کے ساتھ باربرا کو اپنے بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ آواز بہت قریب آ چکی تھی۔ دروازے کے قریب' کمرے کے اندر۔ اور پھر اچانک ایک مکروہ چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ کوئی اذیت ناک آواز میں چیخا۔ اور پھر آواز بڑی تیزی کے ساتھ دور ہوتی چلی گئی۔ ذرا دیر بعد مکمل سناٹا طاری ہو گیا۔

وہ دونوں حیران تھے۔ باربرا کی آنکھوں سے اطمینان کے آنسو رواں تھے۔ ڈسمنڈ مسکرا رہا تھا۔

"اب وہ کبھی تمہارے قریب نہ آ سکے گا باربرا۔ بزرگ نے کہا تھا کلام الٰہی پر ایمان رکھنے والوں پر بدی کی قوتیں اثر نہیں کرتی ہیں۔ اس نے سچ کہا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا۔"

☆======☆======☆

"میری طرف سے دلی مبارک قبول کرو۔" مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کہا۔ وہ دونوں ریذیڈنسی کے لان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ مہاراجہ اچانک آ گیا۔

"بہت بہت شکریہ۔" ڈسمنڈ نے مسکرا کر کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ چائے نہیں پئیں گے؟"

"نہیں۔ شام ہو رہی ہے پھر کبھی سہی۔" رنبیر سنگھ نے کہا۔ "دعوت میری طرف سے ہوگی۔ کیا خیال ہے اگر کل رات تم دونوں کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔"

ڈسمنڈ کے ذہن میں راج محل کی رات کا منظر گھوم گیا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"شکریہ ہز ہائی نس لیکن ابھی ہم........."

"اوہ۔ کوئی بات نہیں۔" مہاراجہ نے مسکرا کر کہا۔ "ہنی مون کے بعد سہی' لیکن بھولنا نہیں۔ ویسے میں نے پہلے دن ہی یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ڈسمنڈ اپنا دل ہار بیٹھا ہے۔" اس نے باربرا کی طرف دیکھ کر کہا۔

سورج غروب ہونے والا تھا۔ ڈسمنڈ نے دیکھا کہ مہاراجہ کا چہرہ مضطرب سا ہے۔ وہ اسے احتراماً گیٹ تک چھوڑنے آیا۔

"تمہارے کام کا کیا حال ہے؟" مہاراجہ نے گھوڑے پر سوار ہو کر پوچھا۔

"ٹھیک ہے لیکن مزدوروں کی کمی سے کام کی رفتار متاثر ہو رہی ہے۔"

"کیوں؟"

"میں نے آپ کو بتلایا تھا کہ اس جزیرے پر لاتعداد مزدور کام کر رہے ہیں۔ نہ جانے وہاں کیا تعمیر ہو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ بہت سے مزدور کام چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اگر یہی سلسلہ رہا تو پھر برسات سے پہلے کام مکمل ہونا دشوار ہو جائے گا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ جزیرے پر ہونے والے کام کو رکوا دیجئے۔ وہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"بند تعمیر ہونے پر یہ پورا علاقہ زیر آب آجائے گا۔ میں نے آپ کو بتلایا تھا۔"

"کیا وہ جزیرہ بھی زیر آب آجائے گا؟" مہاراجہ نے قدرے ترش لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ اور آس پاس کا علاقہ بھی۔"

"لیکن تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتلایا؟" اچانک مہاراجہ کا لہجہ غضبناک ہو گیا تھا۔ "تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو؟ یہ ریاست تمہاری نہیں میری ہے۔ یہاں کوئی کام میرے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن رنبیر........" ڈسمنڈ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"کیا بے ہودگی ہے؟ تم کس سے مخاطب ہو۔ تم کو تمیز نہیں ہے۔ مجھے کس طرح مخاطب کرنا چاہئے۔ میں ہز ہائی نس مہاراجہ رنبیر سنگھ ہوں۔ سمجھے؟"

"لیکن........"

"شٹ اپ۔ آئندہ یاد رکھنا۔"

اس نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ڈسمنڈ حیرت زدہ نگاہوں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اندھیرا ہوتے ہی رنبیر بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔

"حسین خان۔" صبح اٹھ کر ڈسمنڈ نے آواز دی۔

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا۔ خانساماں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ڈسمنڈ نے باہر نکل کر اسے پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے سوچا شاید وہ سرونٹ کوارٹر میں ہو........ لیکن کوارٹر خالی تھا۔ حسین خانساماں کا سامان بھی غائب تھا۔ وہ جا چکا تھا۔

باربرا غسل خانے سے باہر نکلی تو ڈسمنڈ کو دیکھ کر مسکرا دی۔ اس کے رخساروں کی

تازگی ایک ہی رات میں بحال ہونے لگی تھی۔

"تم یہاں کیسے کھڑے ہو؟"

"حسین خان بھاگ گیا۔" ڈسمنڈ نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

"اوہ لیکن کیوں؟"

ڈسمنڈ نے اسے چند روز قبل کی گفتگو بتلائی۔ "مجھے افسوس ہے کہ وہ بنا بتلائے کیوں فرار ہو گیا۔" اس نے کہا۔

"شاید اس نے سوچا ہو کہ آپ اجازت نہ دیں گے۔ اور اب میں آگئی ہوں تو آپ کو تکلیف نہ ہو گی۔"

اسی وقت ایک ادھیڑ عمر باوردی خانساماں نے آکر ان کو سلام کیا۔

"تم کون ہو؟" ڈسمنڈ نے پوچھا۔

"آپ کا نیا خانساماں ہوں سرکار۔" نووارد نے بڑے ادب کے ساتھ کہا۔ "میرا نام ملک ہے۔"

"لیکن حسین خان کہاں ہے؟"

ملک نے بتلایا کہ حسین خان صبح سویرے ہی اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ جانے سے قبل وہ ملک کو ہدایت کر گیا تھا کہ وہ اس کی جگہ سنبھال لے اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس سلسلے میں وہ ڈسمنڈ سے پہلے ہی بات کر چکا ہے۔

"لیکن تم کام سے واقف ہو؟"

"سرکار۔ میں پرانا خانساماں ہوں۔ کئی صاحب لوگوں کی خدمت کر چکا ہوں۔ ریذیڈنسی کا بٹلر میرا چچا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈسمنڈ نے کہا۔ "تم آج سے کام سنبھال لو۔"

☆======☆======☆

حسین خان بہت سویرے ہی روانہ ہو گیا تھا۔ دن نکلتے نکلتے وہ مدھرنا کے شہر سے خاصا دور نکل آیا تھا۔ اس نے دانستہ وہ پہاڑی راستہ اختیار کیا تھا جو جنگلوں کے درمیان سے جاتا تھا تاکہ ڈسمنڈ اسے واپس بلانے کے لئے کسی کو نہ بھیج سکے۔

راستے میں اسے دو آدمی مل گئے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ حسین خان نے دو ہم سفر مل جانے پر کسی خطرے کا احساس نہ کیا تھا نہ ہی اس کی نظران کے گلے میں بندھے ہوئے ریشمی رومالوں پر پڑی تھی........ اور نہ ہی اس غریب کو یہ معلوم تھا کہ

کالی کے پجاری ٹھگوں نے اپنا خونی کاروبار شروع کر دیا ہے۔

ایک ویران علاقے میں پہنچ کر دونوں نے کچھ دیر ستا لینے کی تجویز پیش کی۔ حسین خان بھی تھک گیا تھا۔ وہ ایک ساتھ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے......... اور پھر اچانک حسین خان کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن ایک جھٹکے نے حسین خان کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

دونوں ٹھگوں نے اطمینان سے زمین کھود کر حسین خان کو دفن کر دیا اور پھر فاتحانہ انداز میں جے کالی کا نعرہ بلند کر کے جنگل میں غائب ہو گئے۔

☆======☆======☆

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی خواب گاہ راج محل کے بالائی منزل پر واقع تھی۔

وہ اس وقت انتہائی اضطراب کی حالت میں کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا......... وہ اس وقت ان دیکھی تاریک قوتوں سے جنگ کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے برسرپیکار تھا۔ وہ اپنے اندر پوشیدہ اس خونی شیطان سے لڑ رہا تھا جس نے اس کی شخصیت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا جس نے اسے بے بس کر دیا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی مزاحمت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

جب سے اس کی یہ کیفیت ہوئی تھی اس نے تنہائی کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی تھی۔ کمرے میں بچھی ہوئی خوبصورت مسہری اور اس کا نرم و گداز بستر اس وقت خالی تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اجتناب برت رہا تھا۔ اس کی راتیں مہارانی راج کنول کے نرم و نازک جسم کی نرمیت سے محروم ہو چکی تھیں۔ وہ خود کو اس سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

غصہ میں مٹھیاں بھینچ کر اس نے عہد کیا کہ آج وہ اپنی تمام تر قوتِ ارادی کے ساتھ مزاحمت کرے گا۔ آگے بڑھ کر اس نے خوابگاہ کے دروازے کو اندر سے مقفل کیا اور پھر کنجی دریچے سے باہر پھینک دی۔ ایک بے گناہ طمانیت اور سکون کا احساس اس کے ذہن پر طاری ہو گیا۔ اس کا ذہن ایک اذیت ناک بوجھ سے نجات پا گیا۔ اب کوئی اسے اس کے کمرے سے باہر نہیں نکال سکتا۔

اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر وہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اور فوراً ہی وہ جانا پہچانا قہقہہ اس کے ذہن میں گونج اٹھا۔ مترنم نسوانی قہقہہ......... لیکن آج اس میں ایک زہریلا تمسخر تھا......... قہقہے کی آواز اس پر کوڑے برسا رہی تھی......... رنبیر نے اپنی کنپٹی پر گھونسے مار کر اس آواز کو ذہن سے نکال پھینکنے

کی کوشش کی۔

لیکن قہقہوں کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی گئی......... اسے اپنا سر پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اور پھر بے ساختہ اس کے لبوں سے بھیانک قہقہہ بلند ہونے لگا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔

”احمق! تو مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا.........؟“ ایک آواز ذہن میں گونجی۔ ”تو سمجھتا ہے مقفل دروازے مجھے روک لیں گے۔ مورکھ۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا......... دروازے......... دیواریں......... یہ سب میرے لئے بے حقیقت ہیں۔“

اور ذرا دیر بعد وہ بستر سے چھلانگ لگا کر نیچے اترا......... اس کی گھنی دم خوشی سے ہل رہی تھی۔ اس کے جسم پر لمبی لمبی سفید لکیریں چمکنے لگی تھیں۔ اس نے دونوں پیر آگے کر کے ایک انگڑائی لی......... اس کے بھیانک جبڑوں سے ایک خوفناک غراہٹ بلند ہوئی۔ اس کی سرخ لمبی زبان خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لئے باہر نکل آئی۔ وہ دریچے کے قریب پہنچ کر پچھلے پنجوں کے بل جھکا......... اور پھر ایک ہی جست میں وہ دریچے سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا باغیچے میں جا رکا۔

یہ جست مہاراجہ رنبیر سنگھ کی نہیں......... ایک خطرناک ٹائیگر کی تھی.........

اب وہ رنبیر نہیں......... ایک بھوکا شیر بن چکا تھا۔

☆======☆======☆

مدھرنا کی قدیم اور خشک جھیل کے درمیان واقع جزیرے کے گھنے جنگل کے اختتام پر جانے والا راستہ درختوں کے درمیان کالی کے پوشیدہ مندر پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ مندر کی عمارت کے کھنڈر اب مرمت کے بعد پھر سے آباد ہو چکے تھے۔ دیواروں پر جمی ہوئی کائی صاف ہو چکی تھی۔ چھتوں کے جالے غائب ہو چکے تھے۔ مندر میں ہر سمت زندگی کے آثار نمایاں تھے۔ دیواروں اور چھتوں پر نیا رنگ و روغن چمک رہا تھا۔ چھت میں لٹکی ہوئی مدھم قندیلیں روشن تھیں اور درمیانی ہال میں رکھا ہوا کالی کا ٹوٹا ہوا سیاہ بت اب پھر سے تعمیر ہو چکا تھا......... اس میں پڑی ہوئی دراڑیں پھر سے بھر دی گئی تھیں اور اس کے جسم کا سیاہ رنگ تازہ اور چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی باہر لٹکی ہوئی خوفناک زبان خون کی طرح سرخ اور تازہ نظر آ رہی تھی......... اس کے گرد بنی ہوئی منڈیروں کے درمیان جلتے ہوئے انگاروں سے لوبان کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ تلک کے لئے گھسے جانے والے صندل کی خوشبو مہک رہی تھی.........

اور بت کے سامنے بنی ہوئی قربان گاہ کا چبوترہ چمک رہا تھا۔

کالی کے چاروں ہاتھ فاتحانہ انداز میں ہوا میں بلند تھے۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے ہار کی کھوپڑیوں کے بھیانک دانت بھوکے شکاری کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ موسیقی کی آواز اور طبلے اور جھانجھر کی دھمک سے پورا مندر گونج رہا تھا.......... ان گنت پروہت مدھیا اور میتھونا کے اشلوک پڑھ رہے تھے۔

اور اسی لمحے اچانک دیوداسیوں کی ایک قطار رقص کرتی ہوئی کالی کے بت کے گرد پھیل گئی۔ یہ سب کنواری لڑکیاں تھیں۔ کالی کی پوجا شروع ہونے کے بعد گرد و نواح کی آبادی سے ان دیوداسیوں کو مندر کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ یہ کالی پوجا کے لئے مخصوص ہو جاتی تھیں.......... یہ اس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتی تھیں اور بڑے پروہت کے حکم پر خوبصورت لڑکی مندر کی دیوداسی بننے پر مجبور ہوتی تھی۔ اس حکم عدولی کی ہمت نہ اس میں تھی نہ اس کے والدین میں.......... وہ کالی کی داسیاں تھیں.......... ان کی عمریں بارہ تیرہ سے لے کر چودہ پندرہ سال کے درمیان تھیں۔ پجاریوں کی بھوکی نگاہوں کی حرص بڑھتی جا رہی تھی۔

اچانک ایک لمبے تڑنگے پروہت نے جے کالی کا نعرہ بلند کیا اور مستی کے عالم میں دیوداسیوں کے درمیان تھرکنے لگا۔ موسیقی کا شور بتدریج بلند ہونے لگا.......... اس کے ساتھ ساتھ رقص کا انداز بدمستی کی شکل اختیار کرنے لگا.......... اور پھر بڑے پروہت کے ہلکے سے اشارے پر بت کے عقب کا دروازہ کھلا اور دو پروہتوں نے ایک نیم بے ہوش لڑکی کو لے کر قربان گاہ کے چبوترے پر لٹا دیا.......... وہ سحر زدہ انداز میں کالی کی پھیلی ہوئی بھیانک آنکھوں کو گھور رہی تھی.......... بڑے پروہت کی گردن کو ہلکی سی جنبش ہوئی.......... اشلوک کا زور تیز ہو گیا.......... ایک تیز دھار خنجر چمکا اور لڑکی کی گردن جسم سے الگ ہو گئی.......... اس کا تازہ تازہ گرم لہو بہہ کر قربان گاہ کے نیچے رکھے ہوئے پیالہ نما برتن میں جمع ہونے لگا..........

اور عین اسی لمحہ ایک شیر کی دھاڑ سے فضا گونج اٹھی.......... تاریکی میں بڑی دیر سے چمکتی ہوئی دو آنکھیں قریب آنے لگیں.......... اور پھر اطمینان اور مستی کے عالم میں چلتا ہوا وہ شیر قربان گاہ کے قریب آیا.......... اس نے لمبی زبان سے قربان ہونے والی لڑکی کا لہو چاٹنا شروع کر دیا۔ پیالہ خالی ہو گیا تو اس نے انگڑائی لے کر کالی کے بت کو دیکھا اور غرا کر ایک بار پھر دھاڑا.......... اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔ یہ وہ شیر

تھا جو مہاراجہ رنبیر سنگھ کی خواب گاہ سے چھلانگ لگا کر باہر نکلا تھا۔

شیر کے جاتے ہی پروہت اور پجاریوں کے مجمع نے جے کالی کا فلک شگاف نعرہ لگایا اور پھر شیطنیت کا وہ گھناؤنا کھیل شروع ہو گیا جس سے کالی خوش ہوتی تھی' جس سے کالی کی بدی کی قوتیں تازہ ہوتی تھیں۔

☆======☆======☆

مہاراجہ کی آنکھ کھلی تو صبح کی سپیدی مشرق سے نمودار ہو رہی تھی۔

اس نے ایک طویل انگڑائی لی.......... اس کا تمام جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا.......... اور رات کے ڈراؤنے خواب سے اس کے جسم پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری تھی جس کو وہ خود کوئی نام نہ دے سکتا تھا۔

کیسا بھیانک خواب تھا.......... اس نے سوچا اور پھر اندر سے مقفل دروازے کی سمت دیکھ کر اطمینان کی گہری سانس لی.......... پھر فوراً ہی لپک کر وہ دریچے کے پاس آ کر باہر جھانکنے لگا.......... کھڑکی سے زمین کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ بلاشبہ کوئی انسان یہاں سے چھلانگ مار کر صحیح سلامت نیچے نہیں پہنچ سکتا تھا.......... اس کی ہڈیاں ٹوٹ کر بکھر جاتیں.......... اور بفرضِ محال کود کر نیچے پہنچ بھی جاتا تو چھلانگ لگا کر اوپر آنا ناممکن تھا.......... یقیناً وہ خواب تھا.......... لیکن کتنا بھیانک' ڈراؤنا اور وحشت انگیز..........

لیکن جیسے ہی وہ آئینے کے سامنے پہنچا' لرز کر رہ گیا.......... اس کا جسم کانپنے لگا۔ آئینے میں نظر آنے والا چہرہ اس کا اپنا تھا.......... لیکن اس کے جبڑوں تک سرخ سرخ لہو جما ہوا تھا..........

مہاراجہ رنبیر سنگھ شکست خوردہ انداز میں بستر پر گر کر سسکیاں بھرنے لگا۔

☆======☆======☆

مسٹر پلکاٹ بے یقینی کے عالم میں ڈسمنڈ کی بات سنتے رہے۔

"اگر یہ سچ ہے کہ کالی پوجا دوبارہ شروع ہو گئی ہے.......... اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ صحیح ہے تو بھی مجھے بتلاؤ کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"اوہ گاڈ۔ تو کیا آپ بالکل بے بس ہیں؟"

"مدھرنا ایک خود مختار ریاست ہے۔ جب تک کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے برطانوی حکومت متاثر ہو' ہم دلی سے بھی مدد نہیں مانگ سکتے.......... ہمارے پاس یہاں فوج اور پولیس بھی نہیں ہے۔ اور پھر یہ پوجا کا مسئلہ خالصتاً مذہبی مسئلہ ہے۔ جس میں ہم مداخلت

نہیں کر سکتے۔"

"لیکن بند کی تعمیر کا کیا ہو گا.......... اب تو مزدور بھی مشکل سے ملتے ہیں.......... وہ کالی کے مندر کی تعمیر میں مصروف ہیں۔"

"اس سلسلے میں صرف مہاراجہ ہی مدد کر سکتا ہے۔" پلکاٹ نے بے زاری کے ساتھ کہا۔

"لیکن کالی پوجا کے نام پر بے گناہ لوگوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ انسانی قربانی دی جا رہی ہے.......... کیا یہ غیر قانونی نہیں ہے؟"

"ہم اسے ثابت کیسے کریں گے؟ ہاں اگر مہاراجہ رنبیر چاہے تو وہ اس کا سدباب کر سکتا ہے۔"

"مہاراجہ.........." ڈسمنڈ نے غصے میں جواب دیا۔ "وہ خود اس میں پوری طرح شریک ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ تعلیم یافتہ آدمی ہے.......... اور میں جب بھی اس سے ملا ہوں.........."

"آپ اس سے رات میں نہیں ملے ورنہ اندازہ کر لیتے۔"

"اوہ.......... میرا خیال ہے تم یہ مسئلہ ریذیڈنٹ پر چھوڑ دو.......... وہ چند روز میں واپس آ جائیں گے.......... اور تم کو معلوم ہے کہ وہ اسے اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔"

☆======☆======☆

"مشکل یہ ہے کہ میں قطعی بے بس ہوں۔" ڈسمنڈ نے باربرا کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ اپنے کمرے میں غصے کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ "پلکاٹ میری باتوں پر یقین نہیں کرتا۔"

"وہ باتیں ہی ایسی ہیں۔ کوئی بھی شخص ہماری باتوں پر اس وقت تک یقین نہیں کر سکتا جب تک ان حالات سے خود دو چار نہ ہو۔" باربرا نے کہا۔

شادی کے بعد چند روز میں ہی وہ ایک بار پھر گلاب کی طرح تروتازہ اور شاداب ہو گئی تھی۔ اس کے رخساروں اور آنکھوں کے گڑھے ختم ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ اطمینان اور سکون کی گرمی سے گلنار تھا۔

"لیکن میں اس وقت تک چین سے نہیں سو سکتا جب تک کہ یہ شیطانی کھیل ختم نہ ہو جائے۔" ڈسمنڈ نے کہا۔ "رنبیر کو دن میں دیکھ کر کون شبہ کر سکتا ہے کہ وہ تاریکی

چھاتے ہی ایک آدم خور درندہ بن سکتا ہے۔ رات کو ایک شیطانی روح اس کے جسم میں حلول کر جاتی ہے۔"

"وہ پہلے کبھی ایسا نہیں تھا ڈسمنڈ!" باربرا نے کہا۔ "لیکن تمہاری آمد کے بعد اس میں اچانک تبدیلی آ گئی ہے.......... اور خصوصاً اس دن کے بعد جب تم لوگ شیر کا شکار کرنے گئے تھے۔"

"شیر کا شکار.......... عجیب بات ہے کہ اس دن بھی میری کیفیت بالکل سحرزدہ انسان کی سی ہو گئی تھی.......... مشکل یہ ہے کہ شادی کے بعد سے مہاراجہ کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے.......... وہ دن میں مجھ سے ملنے سے کتراتا ہے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا ہے.......... کبھی سو رہا ہے.......... کبھی شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔"

"کیا تم نے یہ محسوس کیا ڈیئر کہ شادی کے بعد سے ان شیطانی قوتوں نے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا ہے؟"

"ہاں۔ شاید اس لئے کہ اب ہم آیاتِ الٰہی کے تحفظ میں ہیں.......... اور ایک خدا دوست بزرگ کی برکتوں کے سائے میں ہیں۔"

"بے شک.......... اب ہم خدا کے دین پر ایمان لا چکے ہیں.......... طاغوتی قوتیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہیں۔" باربرا نے اتنے اعتماد سے کہا کہ ڈسمنڈ نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

☆======☆======☆

مہاراجہ رنبیر سنگھ کو زندگی عذاب محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ جس کے اشارے پر ریاست مدھرنا کی پوری آبادی حرکت کرتی تھی، اب خود کو مجبور و لاچار اور ایک انجانی شکتی کا غلام محسوس کرتا تھا۔ اس سے وہ تمام گھناؤنے کام لئے جا رہے تھے جن سے اس کے تعلیم یافتہ ذہن کو نفرت تھی.......... لیکن اس سے نجات کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ہر لمحہ خائف رہتا تھا۔ اسے بیوی بچوں کے پاس جاتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ وہ انسان نہیں درندہ بن چکا تھا۔

ایک طویل مدت کے بعد اس نے سراوہا پوجا کا بندوبست کیا۔ پتری کی اس رسم کے مطابق آباؤ اجداد کی روحوں کی پوجا کی جاتی ہے اور ان سے اشیرباد طلب کی جاتی ہے۔ اس طویل ہال میں جہاں ڈسمنڈ نے شیطانی رقص دیکھا تھا اور جو اب باقاعدہ کالی پوجا کے لئے مندر کا کام دے رہا تھا۔ مہاراجہ رنبیر سندھیا کر رہا تھا۔ یہ شام کی ایک مخصوص پوجا ہوتی

ہے۔ کمرے میں کالی کی قد آدم مورتی رکھی ہوئی تھی۔ دھات کی یہ مورتی خاص طور پر مہاراجہ نے بنوائی تھی جسے بنارس سے بہت احتیاط کے ساتھ یہاں لایا گیا تھا۔ اس کے برابر اس کے باپ اور خوفناک شکل والے دادا مہاراجہ کرشن کی قد آدم تصویر بھی کھڑی ہوئی تھی۔

رنبیر نے پوجا کی رسم ادا کی۔ چاول کے بنے ہوئے پنڈے نذر کیے۔ گنگا جل چھڑک کر دعا کی اور پھر اپنے باپ کی تصویر کے سامنے سجدے میں گر گیا۔ اس کے آنسو رواں تھے اور وہ گڑگڑا کر التجا کر رہا تھا کہ "پتا جی! بھگوان کے لئے مجھے اس عذاب سے نجات دلا دیجئے۔ اب مجھ سے تو برداشت نہیں ہوتا۔ میری زندگی جہنم بن گئی ہے خدا کے لئے میری مدد کیجئے۔"

رنبیر بڑے درد مندانہ لہجے میں دعا کر رہا تھا...... کمرے میں اس کی آواز کے علاوہ پُراسرار سکوت طاری تھا۔

اس لمحہ کمرہ ایک زور دار قہقہہ سے گونج اٹھا...... قہقہہ بڑا ظالم اور بھیانک تھا...... رنبیر کانپ اٹھا...... اور اس نے جب نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کے باپ کی تصویر غائب تھی۔ اس کی جگہ مہاراجہ راج کرشن کا خوبصورت چہرہ اس کو گھور رہا تھا...... اس کے چہرے پر ایک انتہائی سفاک مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"مورکھ...... جب تک میرا انتقام پورا نہیں ہوتا، تجھے نجات نہیں ملے گی۔"

اور پھر مہاراجہ نے دیوانوں کی طرح قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ رنبیر کو اپنا دماغ پھٹتا سا محسوس ہوا...... اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور پھر اسے کچھ یاد نہیں رہا۔

☆------☆------☆

لال بہادر ذات کا کمہار نہیں تھا مگر حسین مورتیاں بنانا اس کا پیشہ تھا۔ اسے اپنے فن میں بڑی مہارت تھی اور اس کی بنائی ہوئی مورتیوں کی بڑی مانگ تھی۔ دیوی دیوتاؤں کی چھوٹی بڑی مورتیوں سے اس کا کمرہ بھرا پڑا تھا۔ وہ ان پر اتنے سندر رنگ کرتا کہ لوگ حیران رہ جاتے۔

لیکن کچھ عرصے سے وہ بے حد پریشان تھا...... اس کی فروخت بے حد کم ہو گئی تھی۔ پرانا اسٹاک یونہی پڑا تھا کیونکہ اچانک ہر طرف کالی کی مورتی کی مانگ شروع ہو گئی تھی۔ کالی کی مورتی بنانا دشوار بھی تھا اور اس کا رنگ و روغن بھی دگنی محنت کا کام تھا لیکن

کاروبار کو جاری رکھنے کے لئے اس نے یہ کام بھی شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی مورتیوں کی جتنی مانگ تھی اتنی تعداد میں وہ نہیں بنا پا رہا تھا۔

لال بہادر کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی رادھیکا کسی حسین مورتی کی طرح خوبصورت اور کامنی سی تھی۔ لال بہادر کو رادھیکا سے بڑا پیار تھا اور یہ مشہور تھا کہ رادھیکا جیسی حسین عورت راج محل کے علاوہ اور کہیں نہ تھی۔ لال بہادر نے رادھیکا کے لئے بمبئی سے ایک بہت ہی قیمتی مسہری خریدی تھی۔ پیتل کی بنی ہوئی یہ لمبی چوڑی، کشادہ مسہری بہت خوبصورت تھی...... اس پر بچھے ہوئے موٹے دبیز گدے رادھیکا کے جوان جسم کی طرح گداز تھے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ رادھیکا کونے میں رکھی ہوئی میز پر لال بہادر کے لئے دودھ کا گلاس تیار کر رہی تھی۔ وہ بار بار مسکرا کر لال بہادر کو دیکھتی جس کی حریص نگاہیں رادھیکا کے قیامت خیز شباب کی رعنائیوں پر جمی ہوئی تھیں...... اچانک لال بہادر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ منوں وزنی بوجھ کے تلے دب کر رہ گیا ہو۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر اس انجانے وزن کو اپنے آپ سے ہٹانے کے لئے ہلنا چاہا لیکن کسی نے اسے آہنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ لال بہادر نے دونوں ہاتھوں سے اپنے گلے پر بڑھتی ہوئی گرفت چھڑانے کی کوشش کی...... لیکن وہ گرفت اور بھی سخت ہو گئی...... اچانک لال بہادر کی نگاہیں سامنے اٹھیں اور دہشت سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

اس کے سینے پر سوار کوئی انسان نہیں...... ایک لمبا تڑنگا اور خطرناک شیر تھا جس کا بھیانک جبڑا اس کی گردن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد لال بہادر ساکت سا ہو گیا...... اس کے دل نے حرکت کرنا بند کر دیا تھا۔

رادھیکا دودھ کا گلاس لے کر مسہری کے قریب آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ لال بہادر کا مردہ جسم فرش پر پڑا ہوا تھا...... رادھیکا نے صرف چند لمحے کے لئے کمرہ چھوڑا تھا۔ وہ دودھ میں ڈالنے کے لئے شکر لینے گئی تھی اور انہی چند لمحات میں یہ سب کچھ ہو گیا...... دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ لال بہادر کی پھٹی پھٹی بے حس نگاہیں اسے گھور رہی تھیں۔

اور پھر اس سے پہلے کہ خوف کی چیخ رادھیکا کے لبوں سے بلند ہوتی، کسی نے اسے کھلونے کی طرح اٹھا کر پٹخ دیا۔

صبح لال بہادر اور رادھیکا کی لاشوں کا پتہ چلنے پر پوری آبادی میں سنسنی پھیل گئی............

لیکن اس کے بعد مدھرنا کی ہر حسین عورت اور دوشیزہ کا یہی حشر ہونے لگا............ لوگ حیران تھے کہ کون سی بلا ہے جو بند دروازوں اور دریچوں سے بھی اندر داخل ہو کر اپنی ہوس کو تسکین پہنچاتی ہے............ لیکن کوئی پتہ نہ چلا سکا............

اس دوران ریاست کے دور دراز علاقوں سے آنے والی دیوداسیوں اور پجاریوں کی تعداد کالی کے مندر میں بڑھتی رہی۔ اب ہر رات کالی کی قربان گاہ پر کسی نہ کسی بے گناہ کی زندگی بھینٹ چڑھنے لگی تھی۔

☆======☆======☆

بند کی تعمیر کا کام تکمیل کے مراحل سے گزر رہا تھا............ دریا کے شمال میں اصل بند کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ اب جھیل کے کنارے پشتے تعمیر ہو رہے تھے تاکہ بند کا پانی جھیل میں محفوظ رہ سکے............ لیکن یہ کام بڑی سست رفتاری سے ہو رہا تھا کیونکہ ان دنوں مزدور بڑی مشکل سے مل رہے تھے۔ قائم مقام ریذیڈنٹ مسٹر پلکاٹ کے مشورے کے باوجود اب تک ڈسمنڈ کو مہاراجہ رنبیر سے اس مسئلے پر بات کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ وہ بہت فکرمند تھا اور اس وقت جھیل کے پشتوں کا معائنہ کرتا ہوا اپنے گھوڑے پر آگے بڑھ رہا تھا۔ غصے اور جھنجھلاہٹ میں اس نے کالی کے مندر کی سمت دیکھا جس کی تعمیرِ نو تیزی سے جاری تھی اور تب اس کی نگاہ ایک سفید گھوڑے پر پڑی۔ بلاشبہ یہ گھوڑا مہاراجہ کا تھا۔ ڈسمنڈ نے فوراً مندر کا رخ کیا۔

مندر کو جانے والے راستے کا جنگل اب بالکل صاف کر دیا گیا تھا۔ پوری عمارت کو اس طرح مرمت کیا گیا تھا کہ مندر بالکل نیا معلوم ہو رہا تھا۔ درمیانی ہال میں رکھی ہوئی کالی کی مورتی اب بالکل مکمل ہو چکی تھی۔ اس کی ڈراؤنی آنکھیں سامنے گھور رہی تھیں............ اس کی باہر نکلی ہوئی سرخ زبان چمک رہی تھی۔ مزدور اپنے کام میں مصروف تھے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ ان کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ وہ ایک پروہت سے مصروفِ گفتگو تھا۔

ڈسمنڈ کے کئی بار آواز دینے پر مہاراجہ چونک کر پلٹا۔ وہ ڈسمنڈ کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا لیکن خود ڈسمنڈ حیرت زدہ نگاہوں سے مہاراجہ رنبیر کو گھور رہا تھا............ اتنے مختصر عرصے میں کسی کو اس طرح تبدیل ہوتے ہوئے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ رنبیر سنگھ کا چہرہ بالکل زرد پڑ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ رخساروں پر سے گوشت غائب ہو گیا تھا اور گہری جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور وہ دق کا مریض نظر آ رہا تھا۔ چند لمحے تک وہ ڈسمنڈ کو وحشت زدہ نگاہوں سے گھورتا

رہا اور پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔

"ہیلو' مائی ڈیئر ڈسمنڈ!" اس نے گرم جوشی کے ساتھ ڈسمنڈ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "خیریت سے تو ہو۔ اور سناؤ باربرا کیسی ہے؟"

وہ باتیں کرتے ہوئے ایک درخت کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے جو مندر کے بالکل سامنے تھا۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" ڈسمنڈ نے پریشان لہجے میں کہا۔

مہاراجہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ "یہاں نہیں اس درخت سے دور چلو ڈسمنڈ۔" اس نے درخت پر خوف زدہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ یہ وہی درخت تھا جس پر مہاراجہ راج کرشن کو پھانسی سے لٹکایا گیا تھا۔ "ہاں اب بولو کیا کہہ رہے تھے؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"یہ آپ کی حالت کیا ہو گئی؟" ڈسمنڈ نے پوچھا۔ "کیا آپ بیمار تھے؟"

"اوہ............ ہاں............ ہاں مجھے بخار آ رہا تھا۔" مہاراجہ نے گھبرا کر کہا۔ نہ جانے کیوں وہ ڈسمنڈ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ "سناؤ تم کیسے ہو؟"

ڈسمنڈ نے مزدوروں کی کمی کے بارے میں بتلایا اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر یہی حال رہا تو برسات سے پہلے بند مکمل نہ ہو سکے گا۔

"اور اس سے پہلے بھی آپ کو بتلایا تھا کہ بند کا پانی کھولتے ہی یہ مندر اور اس کا ملحقہ علاقہ زیر آب آ جائے گا۔ اس لئے اس کی تعمیر پر وقت ضائع نہ کریں۔" ڈسمنڈ نے کہا۔

رنبیر نے پریشانی کے عالم میں اسے دیکھا۔ "یہ مذہب کا معاملہ ہے ڈسمنڈ!" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے پجاریوں کو یہ بات بتلائی تھی لیکن وہ کہتے ہیں کہ کالی دیوی خود اپنے مندر کی حفاظت کرے گی اور اگر یہ مندر ڈوب گیا تو وہ یہ سمجھیں گے کہ کالی کی شکتی ختم ہو گئی ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟" ڈسمنڈ نے کہا۔ "بند کا پانی وہ کیسے روک سکتی ہے؟"

"یہ فکر تم نہ کرو............ دیوتاؤں اور دیویوں کا معاملہ وہی بہتر جانتے ہیں............ اور............ اور میں تم کو مزدور بھی فراہم نہیں کر سکتا۔ جب تک مندر مکمل نہیں ہو جاتا یہ لوگ کہیں اور کام نہیں کریں گے۔"

"لیکن یہ کالی کی پوجا۔ کیا آپ کو اس سے گھن نہیں آتی؟ مجھے تو وحشت ہوتی ہے

اس کے تصور سے۔" ڈسمنڈ نے کہا۔

"یہ مذہب کا معاملہ ہے۔ تم اس میں مداخلت نہ کرو تو اچھا ہو گا۔" مہاراجہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "چھوڑو اس ذکر کو۔ بتلاؤ ہماری دعوت میں کب آ رہے ہو؟ میں نے باربرا کو اتنے دن سے دیکھا بھی نہیں۔ آج رات کیا خیال ہے؟"

"نہیں............" ڈسمنڈ نے گھبرا کر کہا۔ "آج کل بہت مصروف ہوں۔ یہ بند مکمل ہو جائے تب۔"

"اچھی بات ہے............ لیکن بھولنا نہیں............ میں منتظر رہوں گا۔"

ڈسمنڈ اب مہاراجہ سے ملاقات کر کے واپس ہوا تو اور بھی زیادہ پریشان تھا۔

ڈسمنڈ جب بند کے جنوبی پشتے کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے مزدور ڈائنا میٹ کی پیٹیاں اٹھا اٹھا کر ایک نئے تعمیر شدہ شیڈ میں لے جا رہے تھے۔ پروگرام کے مطابق ڈیم کی تعمیر کے بعد سامنے کے اس پشتے کو ڈائنا میٹ سے اڑا دیا جانا تھا جو پانی کے بہاؤ کو روکے ہوئے تھا تاکہ پانی بند سے ہو کر جھیل تک پہنچ سکے۔ بند کی سرنگیں پانی کی نکاسی کے لئے کافی مضبوط تھیں اور بعد میں پانی بند کرنے' کھولنے کا کام ان میں لگے ہوئے آہنی شٹرز کے ذریعے ہوتا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ڈسمنڈ نے اپنے اسسٹنٹ انجینئر میکنزی سے پوچھا۔ "ابھی پشتے کو توڑنے کا وقت تو نہیں آیا اور پھر اس طرح ڈائنا میٹ اٹھوانا خطرناک ہے۔"

"کچھ عرصے سے پرانے شیڈ سے ڈائنامیٹ چوری ہو رہے تھے۔" میکنزی نے بتایا۔ "اس لئے میں نے یہ نیا شیڈ تعمیر کرایا ہے۔ یہ یقیناً زیادہ مضبوط اور محفوظ ہے۔"

"اوہ' لیکن بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ خیال رکھنا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" میکنزی نے کہا۔ "میں نے اب نئے چوکیدار بھرتی کر لئے ہیں۔"

ڈسمنڈ جب ریذیڈنسی واپس پہنچا تو باربرا نے پریشان لہجہ میں بتلایا۔ "ڈارلنگ! مسٹر پلکاٹ صبح سے لاپتہ ہیں۔ وہ صبح یہ کہہ کر گئے تھے کہ شکار پر جا رہا ہوں لیکن ابھی تک واپس نہیں آئے۔"

"اوہ............ ممکن ہے وہ جنگل میں تفریح کر رہے ہوں۔" ڈسمنڈ نے ہنس کر کہا۔

"تم جانتی ہو وہ کچھ خبطی ہیں۔"

"لیکن وہ تنہا گئے تھے۔ مجھے فکر ہو رہی ہے۔"

"اچھا میں دیکھتا ہوں۔" ڈسمنڈ نے لباس تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

مسٹر پلکاٹ کا پی اے ایک بنگالی نوجوان تھا۔ وہ بھی بہت زیادہ فکر مند تھا۔

"صاحب کہہ گئے تھے کہ دوپہر تک واپس آ جائیں گے اور لنچ یہیں کریں گے۔" اس نے بتلایا۔ "صبح سے ڈاک رکھی ہے اور ضروری کاغذات پر ان کو دستخط بھی کرنا تھے۔ اب شام ہونے والی ہے۔"

ڈسمنڈ بھی اب فکر مند ہو گیا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ وہ کدھر گئے ہیں ڈسمنڈ نے اپنے گھوڑے کو تیار کرنے کا حکم دیا اور پھر مسٹر پلکاٹ کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ شام ہونے والی تھی۔ جنگل میں تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ ہوا بند تھی اور سیاہ بادل آسمان پر جمع ہو رہے تھے۔ بارش کسی وقت بھی ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار اور تیز کر دی۔ گھنے جنگل میں مکمل سناٹا طاری تھا اور ڈسمنڈ کا دل کسی انجانے خطرے سے ڈوب رہا تھا۔

اچانک ایک پہاڑی کے قریب اسے مسٹر پلکاٹ کا گھوڑا نظر آیا جو ایک پیڑ کے ساتھ بندھا ہوا تھا لیکن مسٹر پلکاٹ کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ڈسمنڈ نے اپنا گھوڑا بھی وہیں چھوڑ دیا اور اس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ نرم زمین پر مسٹر پلکاٹ کے شکاری بوٹ کے نشان واضح تھے اور پہاڑی کی چڑھائی پر جا کر ختم ہوئے تھے...... اور اسے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ اس کی نظر اچانک مسٹر پلکاٹ پر پڑی۔

وہ زمین پر چت پڑے ہوئے تھے اور ان کی گردن میں ریشمی رومال کا ایک پھندہ پڑا ہوا تھا۔ مسٹر پلکاٹ مر چکے تھے لیکن ان کے قاتل کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

ابھی وہ لاش پر جھکا ہی تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

ڈسمنڈ واپس پہنچا تو بوڑھا ریذیڈنٹ مسٹر فرنچ رخصت سے واپس آ چکا تھا۔ ڈسمنڈ نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل کئے اور فوراً ریذیڈنٹ کے پاس پہنچا۔ باربرا اس کے ساتھ تھی۔ جیوفری فرنچ فکرمند انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

"او...... ڈسمنڈ...... آؤ' آؤ...... میں تمہارا ہی منتظر تھا۔" ریذیڈنٹ نے کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے آتے ہی تمہاری شادی کی خبر ملی تو جی خوش ہو گیا۔ باربرا کو میں بیٹی کی طرح پیار کرتا ہوں لیکن یہ حادثہ۔ پلکاٹ کی موت نے تمام خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔"

"حادثہ نہیں قتل۔" ڈسمنڈ نے غصے میں کہا۔

"قتل؟" بوڑھے ریذیڈنٹ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ہاں قتل۔" ڈسمنڈ نے اسے تفصیل سے بتلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھگوں نے اس علاقے میں پھر سے اپنی سرگرمیاں شروع کر دی ہیں اور آپ کی عدم موجودگی میں یہاں کالی پوجا پھر سے شروع ہو گئی ہے۔"

ڈسمنڈ نے اسے تفصیل کے ساتھ اس دوران ہونے والے واقعات بتائے۔

"حیرت انگیز...... مجھے یقین نہیں آتا......" فرنچ نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم رنبیر کو نہیں جانتے۔ میں نے اسے اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ اسے لندن میں تعلیم دلائی ہے۔ اس جیسا روشن خیال نوجوان اس قسم کے گھناؤنے توہمات ہرگز نہیں برداشت کر سکتا۔ اگر یہ سب کچھ صحیح ہوتا تو وہ اب تک سختی سے اس کے خلاف قدم اٹھا چکا ہوتا۔"

"یہ سچ ہے مسٹر فرنچ۔" ڈسمنڈ نے جواب دیا۔ "اور آپ کا رنبیر اس میں شامل ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔"

ریذیڈنٹ غیر یقینی انداز میں اسے گھورتا رہا۔

"میں نہیں مان سکتا۔ رنبیر ایسی گھناؤنی سرگرمیوں میں کبھی ملوث نہیں ہو سکتا۔" اس نے کہا۔ "ممکن ہے کچھ مذہبی جنونیوں نے مندر کو تعمیر کر لیا ہو لیکن انسانی قربانی...... ٹھگی...... اور رنبیر کی مرضی پر۔ یہ ناممکن ہے۔"

"ڈسمنڈ سچ کہہ رہے ہیں سر۔" باربرا نے کہا۔ "ہم اس حقیقت کے چشم دید گواہ ہیں۔"

"او مائی گاڈ! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" جیوفری فرنچ نے غصے میں اپنا گلاس میز پر پٹخ کر کہا۔ "میں نے اپنی پوری زندگی اس ریاست میں بسر کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ رنبیر کو ان جہالت آمیز قدیم رسموں سے کتنی نفرت ہے۔ وہ ہمیشہ ان کو وحشیانہ درندگی کہتا ہے۔ اس نے ریاست میں ایسی حرکتوں کا قلع قمع کرنے میں میرا ساتھ دیا۔ پھر وہ کیسے یہ سب کچھ گوارا کر سکتا ہے۔" اس نے دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے کہا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"راج محل اور کہاں؟" ریذیڈنٹ نے شدید غصے کے عالم میں کہا۔ "میں ابھی رنبیر سے دریافت کروں گا۔"

ڈسمنڈ نے دوڑ کر اسے روکا۔ "سر! آپ اس وقت نہ جایئے۔ رات ہو چکی ہے.......... اور باہر مکمل تاریکی ہے.......... مکمل تاریکی اور.......... اور.......... آج کالی رات ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" بوڑھا فرنچ غصے میں گرجا۔ "نہ جانے تم کو کیا ہو گیا ہے۔ کالی رات.......... ہونہہ، میں رنبیر سے حقیقت معلوم کروں گا۔"

"سر.........." ڈسمنڈ نے اس کا بازو تھام کر التجا کی۔ "آپ بھڑکے ہوئے ہیں.......... صبح چلے جایئے گا.........."

"نہیں۔ میں ابھی جاؤں گا۔"

"سر.......... اس وقت نہ جایئے.......... آج رات کالی پوجا کی رات ہے.......... آپ کا تنہا جانا خطرناک ہو گا۔"

"ہٹ جاؤ.......... تم مجھے بزدل بنا رہے ہو۔" ریذیڈنٹ نے اسے دھکا دیا۔ "وہ مجھے باپ کی طرح سمجھتا ہے.......... اور میں اسے ان گھناؤنی حرکتوں میں ملوث نہیں دیکھ سکتا.......... نہیں.......... تم ساتھ نہ آؤ میں تنہا اس کے پاس جاؤں گا۔"

ریذیڈنٹ کے جانے کے بعد ڈسمنڈ نے کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند باربرا کو دیکھا۔

"افسوس کہ ہم مجبور ہیں ڈارلنگ! میں نے آخری حد تک انہیں روکنے کی کوشش کی ہے۔"

"ہاں.......... لیکن مہاراجہ واقعی ان کو باپ کی طرح مانتا ہے.......... اس لئے.......... میرا خیال ہے.......... کہ وہ انہیں.........."

وہ خوف کے مارے جملہ مکمل نہ کر سکی۔

☆======☆======☆

ریذیڈنٹ جیوفری فرنچ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ محل کے گیٹ پر کوئی گارڈ موجود نہ تھا۔

اس نے غصے میں سوچا کہ واپسی پر وہ اس لاپرواہی پر متعلقہ حکام کے خلاف سخت کاروائی کرے گا۔ گارڈ کمانڈر کو اس کی سخت سزا ملنا چاہیے۔

اندر کا گیٹ اس کی مسلسل دستک پر کافی دیر بعد کھلا۔ جس لانسر نے گیٹ کھولا اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے.......... ریذیڈنٹ کا خون غصے میں کھول

اٹھا.......... اس نے سوچا کہ اس کی عدم موجودگی میں یقیناً تمام انتظامات درہم برہم ہو گئے ہیں.......... وہ رنبیر سے اس کی شکایت کرے گا۔ وہ اس قدر غصے میں تھا کہ یہ محسوس نہ کر سکا کہ تمام محل تاریک ہے۔ روشنی کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا.......... محل کے اندر داخل ہو کر جب وہ مہاراجہ کے کمرے میں پہنچا تو اس نے گارڈ سے غصے میں پوچھا۔

"مہاراجہ صاحب کہاں ہیں؟"

گارڈ نے اشارے سے بڑے ہال کی سمت اشارہ کر دیا.......... ڈر کے مارے اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔

اور جب جیوفری فرنچ ہال میں داخل ہوا تو اسے یقین آگیا کہ ڈسمنڈ نے جو کچھ کہا تھا.......... وہ سچ تھا۔ کالی کی قدآدم مورتی فرنچ کو خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی اور رنبیر اس کے سامنے جھکا ہوا پرستش کر رہا تھا۔

ریذیڈنٹ کی آواز پر مہاراجہ رنبیر نے چونک کر اسے دیکھا.......... چند لمحے تک اس کی نگاہیں غیر یقینی انداز میں بوڑھے جیوفری فرنچ کو گھورتی رہیں جیسے کسی نے اسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو.......... اور پھر اچانک اس کی نگاہوں میں شیر کی سی درندگی چمک اٹھی.......... وہ آہستہ قدموں سے ریذیڈنٹ کی سمت بڑھا۔

"یور ایکسی لینسی.......... آپ..........؟" اس نے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ بڑھایا۔

"میں بڑا خوش قسمت ہوں جو کالی پوجا کی رات کو آپ آ گئے۔ اب میری پوجا صحیح معنوں میں مکمل ہو جائے گی۔"

اس نے زور سے تالی بجائی.......... اس کی آنکھوں میں درندگی جھلک رہی تھی اور ہونٹوں پر حریص مسکراہٹ تھی۔

"اسے گرفتار کر لو۔" اچانک اس نے گارڈ کو حکم دیا۔

☆======☆======☆

بارش زور و شور سے ہو رہی تھی.......... بادلوں کی زور دار گرج اور بجلی کی کڑک سے ریذیڈنسی کی پرانی عمارت لرز رہی تھی۔

باربرا مارے خوف کے ڈسمنڈ کے بازوؤں میں چھپی ہوئی تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی۔

"مسٹر فرنچ اب تک واپس نہیں آئے۔" باربرا نے آہستہ سے کہا۔

"میں خود پریشان ہوں.......... میرا دل اس خیال سے لرز رہا ہے کہ وہ تنہا گئے

ہیں۔" ڈسمنڈ نے کہا۔

"آپ نے تو روکنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن انہوں نے مانا ہی نہیں۔ وہ خیریت سے ہوں گے؟"

ڈسمنڈ نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔

"میں اب انتظار نہیں کر سکتا۔" اس نے اچانک کہا۔

"کیا ہوا؟"

"سارے محل پر تاریکی چھائی ہوئی ہے.......... روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی.......... میرے خدا.......... کہیں وہ.........." ڈسمنڈ دروازے کی سمت بڑھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" باربرا نے گھبرا کر کہا۔

"مسٹر فرنچ کی زندگی خطرے میں ہے باربرا اور ممکن ہے مزید تاخیر کے بعد وہ.........."

اس نے جملہ مکمل نہیں کیا لیکن باربرا سمجھ گئی۔

"لیکن تم.........."

"فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھ پر کالی کی منحوس قوت اثرانداز نہیں ہو سکتی اور پھر یہ تعویذ میرے بازو پر بندھا ہوا ہے۔"

"بہت احتیاط کرنا ڈارلنگ! خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔" باربرا تقریباً رو پڑی۔

"تم بھی محتاط رہنا باربرا.......... میری واپسی تک باہر نہ نکلنا.........." ڈسمنڈ نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

☆======☆======☆

راج محل بالکل خالی تھا.......... ڈسمنڈ کو وہاں ایک متنفس بھی نظر نہ آ سکا۔

اور اب اس کے قدم تیزی سے کالی کے مندر کی سمت بڑھ رہے تھے.......... بارش زور و شور سے ہو رہی تھی.......... جھیل کے اندر خاصا پانی جمع ہو گیا تھا اور ڈسمنڈ نے محسوس کیا کہ بارش اسی طرح ہوتی رہی تو شاید پشتے ٹوٹ جائیں.......... اس کے قدم اور تیز ہو گئے.......... عجیب بات تھی کہ اسے ذرہ برابر خوف محسوس نہ ہو رہا تھا.......... شاید یہ قرآنی آیات کی برکت تھی.......... ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کا دل بالکل مطمئن تھا۔

موسیقی کی مخصوص آواز سے اس نے اندازہ کر لیا کہ کالی پوجا کی رسومات جاری

ہیں.......... لیکن ڈسمنڈ کو یہ اندازہ نہ تھا کہ اسے وہاں پہنچنے میں بہت تاخیر ہو چکی ہے۔

مندر کے ستون کی آڑ سے وہ کالی کے بت کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ہی قربان گاہ کا لمبا چبوترا تھا۔

اور اس چبوترے پر بوڑھے جیوفری فرنچ کا جسم عریاں پڑا ہوا تھا۔ اس کی گردن جسم سے تقریباً الگ ہو چکی تھی.......... اور کالی کی مورتی کے گرد مرد اور عورت پجاریوں کا ہجوم رقص کرتا ہوا گردش کر رہا تھا۔ ان پر جنون کا عالم طاری تھا.......... ہونٹوں سے کف جاری تھا.......... ان کے لبوں سے عجیب ڈراؤنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ان گنت پروہت اشلوک پڑھتے ہوئے کالی کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ تیز موسیقی سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اور تب اس کی نظر اچانک مہاراجہ رنبیر سنگھ پر پڑی.......... وہ بوڑھے ریذیڈنٹ کی لاش کے سامنے جھکا ہوا تھا لیکن جب وہ کھڑا ہوا تو ڈسمنڈ نے اسے پہچان لیا اور خوف سے لرز اٹھا۔ مہاراجہ کا منہ انسانی خون سے تر ہو رہا تھا۔ خوف کے بھیانک احساس کے ساتھ ڈسمنڈ کو اندازہ ہوا کہ وہ جیوفری فرنچ کی کٹی ہوئی گردن سے لہو پی رہا تھا۔ کسی درندے کی طرح.......... اس نے روشنی میں مہاراجہ کے چہرے پر ایک عجیب سفاک سی مسکراہٹ دیکھی.......... اور پھر مہاراجہ نے ایک پروہت سے کچھ کہا۔

وہ پروہت آگے بڑھا.......... ڈسمنڈ نے دیکھا کہ کالی کے بت کے پیچھے بیٹھی ہوئی مہاراجہ رنبیر کی کم عمر بیٹی لکشمی کا چہرہ خوف سے سفید ہو چکا تھا۔

پروہت نے لکشمی کو بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا مہاراجہ کی سمت لے چلا۔ لڑکی خوف سے چیخنے لگی لیکن پروہت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ڈسمنڈ حیران تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ اپنی بیٹی کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کی بیٹی نہ ہو' قربانی کا جانور ہو' اور پھر مہاراجہ نے آگے بڑھ کر لکشمی کو دونوں بازوؤں میں اوپر اٹھا لیا۔ لکشمی کی بھیانک چیخیں موسیقی کی آواز اور پجاریوں کے شور و غل میں دب کر رہ جاتی تھیں۔ مہاراجہ اسے کالی کے بت کے سامنے اوپر اٹھائے کچھ پڑھتا رہا اور پھر اس نے ایک بھیانک اور فلک شگاف نعرہ لگایا۔

"جے کالی کی۔"

دوسرے ہی لمحے لکشمی کا تڑپتا ہوا جسم قربان گاہ پر تھا۔ پروہت کے ہاتھ میں چمکتا ہوا تیز خنجر بلند ہوا۔

ڈسمنڈ مزید کچھ نہ دیکھ سکا.......... وہ دیوانوں کی طرح ریذیڈنسی کی عمارت کی سمت

بھاگ رہا تھا۔ تاریکی میں اس نے بہت سے افراد کو مندر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا لیکن اس کے قدم نہ رکے.......... وہ بے تحاشا بھاگتا رہا.......... اور پھر اس وقت اسے ہوش آیا جب وہ اپنے کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اسی وقت اس منحوس جگہ کو چھوڑ دے گا۔

"باربرا۔" اس نے آواز دی۔

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ باربرا وہاں موجود نہ تھی۔ ڈسمنڈ نے پاگلوں کی طرح اسے تلاش کیا۔ وہ دیوانہ وار اسے پکارتا رہا۔

خانساماں ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوا۔

"میم صاحب کہاں ہیں؟" ڈسمنڈ نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"صاحب.......... وہ.........."

"جلدی بتلاؤ۔ کہاں ہیں وہ؟"

"صاحب۔" خانساماں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "کچھ دیر پہلے وہ باہر گئی ہیں۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔"

"او مائی گاڈ.........." ڈسمنڈ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

وہ یقیناً مندر گئی ہوگی.......... ڈسمنڈ نے بد حواس ہو کر سوچا۔ ڈسمنڈ کانپ رہا تھا.......... وہ سوچ رہا تھا کہ باربرا جب اس کی تلاش میں مندر پہنچے گی تو کیا ہوگا..........

اس نے لپک کر دراز سے اپنا ریوالور نکالا' اسے چیک کیا.......... اور دوبارہ کالی کے مندر کی سمت بھاگنے لگا۔

☆======☆======☆

باربرا کا سارا جسم خوف کے پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے گرد بھڑکتے ہوئے شعلوں اور لوبان کے دھوئیں کے بادلوں کو دیکھا۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ یہ جہنمی آگ کے شعلے اسے نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ سامنے کالی کا مکروہ اور بھیانک چہرہ اسے گھور رہا تھا۔ اس کی سرخ زبان جیسے باربرا کا لہو چاٹنے کے لئے بے چین تھی لیکن باربرا خاموش تھی۔ اس کا دل ربِ کعبہ سے مدد کے لئے دعا کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی دعا قبول ہوگی۔

باربرا جب مندر میں داخل ہوئی تو ڈسمنڈ وہاں سے جا چکا تھا اور پھر جیسے ہی اس کی نظر مہاراجہ رنبیر کے چہرے پر پڑی' وہ اپنے لبوں سے بلند ہونے والی چیخ کو نہ روک سکی۔

مہاراجہ نے گھوم کر اسے دیکھا اور خوشی سے مسکرا دیا۔ اس کی مراد بر آئی تھی۔ تازہ تازہ انسانی لہو اس کے منہ سے بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی عزیز ترین بچی بھی کالی کے بھینٹ چڑھا دی تھی اور آج کی رات وہ امر ہونے والا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب اسے ابدی زندگی مل جائے گی۔

وہ ہاتھ پھیلائے ہوئے آگے بڑھا۔ باربرا کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا اور دوسرے لمحے اس کا بے ہوش جسم مہاراجہ کے بازوؤں میں تھا۔ اسی وقت وہ بے ہوش ہو گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسی حالت میں کالی کے بت کے سامنے بنے ہوئے قربانی کے چبوترے پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد لپکتے شعلوں نے اس کی عریانیت کی پردہ پوشی کر دی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ سامنے بیٹھا پوجا کے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ باربرا نے اندازہ کر لیا کہ اب اس کو قربان کیا جانے والا ہے۔ باربرا سکتے کے عالم میں لیٹی رہی۔ وہ ڈسمنڈ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نہ جانے اس کا کیا حشر ہوا ہو۔ کیا اسے بھی ان درندوں نے قتل کر دیا؟

اچانک مہاراجہ رنبیر اشلوک ختم کر کے کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک خنجر چمک رہا تھا۔ اس کی بھوکی نگاہیں باربرا کے جسم کے قیامت خیز نشیب و فراز پر جمی ہوئی تھیں.......... باربرا گھبرا کر بیٹھ گئی۔ خوف سے لرزتی ہوئی چیخ فضا میں گونجی۔

اور اسی وقت ڈسمنڈ وہاں پہنچ گیا۔ باربرا کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے ہونٹ پروردگار سے سلامتی کی دعا مانگ رہے تھے۔ اس کے گرد بھڑکتے ہوئے شعلوں نے اس کے جسم کو چھپا لیا تھا۔

مہاراجہ رنبیر آگے بڑھا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ وہ کالی کو اپنی آخری بھینٹ دینے جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ امر ہو جائے گا۔

اچانک بیک وقت کئی فائر ہوئے.......... مہاراجہ لڑکھڑایا.......... اس نے تیزی سے گھوم کر دیکھا.......... ڈسمنڈ کی نگاہوں سے نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کا چہرہ تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ اب وہ رنبیر نہیں.......... مہاراجہ راج کرشن بن چکا تھا.......... اس کی داڑھی خون سے تر تھی اور وہ بھوکے شیر کی طرح ڈسمنڈ کی سمت بڑھ رہا تھا۔

فائر پھر ہوا.......... اس مرتبہ گولی ٹھیک اس کی پیشانی پر لگی تھی.......... مہاراجہ شیر کی طرح دھاڑا.......... لڑکھڑایا اور پھر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑا۔

چند لمحوں بعد فرش پر مہاراجہ رنبیر سنگھ کی لاش پگھلنے لگی.......... فضا میں خوفناک قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہاراجہ کی لاش کی جگہ ایک انسانی لاش کا ڈھانچہ باقی رہ گیا.......... پھر اس کے بے گوشت و پوست کے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے جیسے وہ باربرا کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"باربرا.......... بھاگو۔" ڈسمنڈ چلایا۔

باربرا جیسے خواب سے چونک اٹھی ہو۔ اس نے قربان گاہ سے چھلانگ لگائی اور کود کر ڈسمنڈ کے بازوؤں میں سما گئی۔

مندر میں موسیقی بند ہو چکی تھی۔ تمام پجاری یہ منظر متوحش نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

اور پھر ان کا ہجوم ڈسمنڈ اور باربرا کی طرف بڑھا۔ ان کا انداز خطرناک تھا.......... بڑا پروہت آگے آگے تھا۔

ڈسمنڈ کے ریوالور نے شعلہ اگلا.......... بڑا پروہت لڑکھڑا کر گرا.......... اس کی پیشانی سے خون کا فوارہ بہہ نکلا.......... مجمع سہم کر پیچھے ہٹا..........

"بھاگو۔" ڈسمنڈ نے باربرا کو کھینچتے ہوئے کہا۔

اور پھر وہ دیوانہ وار بھاگنے لگے.......... تاریکی میں انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں.......... ڈسمنڈ باربرا کو تقریباً گھسیٹ رہا تھا۔

اچانک فضا میں ایک دل ہلانے والا دھماکہ ہوا.......... اور پھر مسلسل دھماکے ہونے لگے.......... زمین لرز اٹھی.......... لیکن ڈسمنڈ کے قدم نہ رکے۔ وہ بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

"مسٹر ڈسمنڈ!" کسی نے اسے پکڑ کر گھسیٹا۔ ڈسمنڈ کا ریوالور بلند ہوا لیکن پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس کا اسسٹنٹ انجینئر میکنزی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"سر! میں نے بند کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا ہے۔ ذرا دیر بعد یہ پورا علاقہ غرقاب ہو جائے گا اور اس منحوس جگہ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا.........." اس نے جلدی سے اپنا رین کوٹ باربرا کے جسم پر لپیٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے سے ان شیطانی حرکات کا علم تھا.......... لیکن جب میں نے ریذیڈنٹ صاحب کا حشر دیکھا تو برداشت نہ کر سکا۔ میں نے سوچ لیا کہ ان ناپاک لوگوں کو نیست و نابود کر دینا ضروری ہے.......... اس لئے میں نے بند کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا ہے۔ پانی تیزی سے بہہ رہا ہے۔ چند لمحوں بعد یہ سب اس

میں غرق ہو کر ختم ہو جائیں گے۔"

"اوہ میکنزی! خدا تم کو خوش رکھے۔" ڈسمنڈ نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"ادھر آئیے.......... میں گھوڑے ساتھ لے آیا تھا۔ ہمیں بلا تاخیر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ورنہ فرار کا کوئی راستہ نہ رہے گا۔"

"گھوڑے کہاں ہیں؟"

"آئیے.........." میکنزی نے کہا۔

اور جب وہ رضوان احمد کی جھونپڑی کے سامنے جا کر رکے تو ڈسمنڈ نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ وہ مسجد کے فرش پر عبادت کر رہے تھے.......... ان کو دیکھ کر وہ اٹھے.......... اور بڑے پیار کے ساتھ مسکرائے۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ اب طاغوتی قوتیں تم دونوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔" انہوں نے پیار سے باربرا کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ "جاؤ.......... اس شیطانی فضا سے دور نکل جاؤ.......... خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔"

"لیکن.......... لیکن.......... وہ بند.......... بند ٹوٹ گیا ہے۔" ڈسمنڈ نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے بیٹے۔"

"یہ سارا علاقہ ڈوب جائے گا۔ آپ.......... بھی ہمارے ساتھ چلئے۔"

رضوان احمد مسکرائے۔ "تم میری فکر نہ کرو.......... جاؤ.......... خدا حافظ بچو!" پھر وہ عبادت میں مصروف ہو گئے۔

تاریکی میں ان کے گھوڑے پوری رفتار سے بلندی کی سمت دوڑ رہے تھے۔

☆======☆======☆

نادیہ خاموش ہو گئی اور کچھ لمحے تک کچھ نہ بولی۔ غلام شیر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اطراف میں سیلاب کا پانی اٹھ رہا ہو۔ چاروں طرف وہی ماحول، وہی کیفیت تھی جو نادیہ کی کہانی میں تھی۔ ڈسمنڈ کے بارے میں نادیہ نے جس طرح تفصیل بتائی تھی، غلام شیر کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسی ماحول میں موجود ہو۔ ایک ایک لمحہ اس پر سے گزر رہا ہو۔ ڈسمنڈ وہ خود اور باربرا نادیہ۔ کئی بار اس کا سر بری طرح چکرایا اور اس نے زور زور سے جھٹکے دیئے۔ نادیہ غالباً اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ کسی قدر پریشان لہجے میں بولی۔

"غلام شیر تم ٹھیک تو ہو؟"

”ایں۔“ غلام شیر نے تحیر بھرے انداز میں پوچھا تو نادیہ کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ غلام شیر آہستہ آہستہ کراہنے لگا تھا۔ نادیہ نے کہا۔

”نہیں۔ خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرو۔ بابا صاحب نے جب مجھے پہلی بار ڈسمنڈ کے بارے میں تفصیلات سنائی تھیں تو کیا تم اس بات پر یقین کرو گے کہ اس وقت میری بھی یہی کیفیت ہوئی تھی۔ یہ کہانی اپنے اندر ایسا ہی سحر رکھتی ہے۔ ڈسمنڈ کا جذبۂ ایمان اور باربرا کی محبت ایک ٹھوس حقیقت بن گئی ہے اور جب بھی یہ کہانی کسی کو سنائی جائے گی‘ مرد ہو گا تو اپنے آپ کو ڈسمنڈ سمجھے گا‘ عورت ہو گی تو خود کو باربرا۔ ہاں یہ الگ بات ہے تم یقین کرو یا نہ کرو کہ جب بابا صاحب نے یہ کہانی مجھے سنائی تھی تو میں بھی اپنے آپ کو باربرا محسوس کر رہی تھی لیکن میری نگاہوں میں ڈسمنڈ کا جو چہرہ ابھرا تھا۔ غلام شیر وہ............ وہ............ وہ............“ نادیہ کے انداز میں ہلکی سی جھجک پیدا ہو گئی۔

”وہ............“ غلام شیر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”وہ تمہارا چہرہ تھا۔ جب بابا صاحب نے پہلی بار مجھے تمہارے سامنے بلایا تھا اور میں نے تمہیں دیکھا تھا تو میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ ڈسمنڈ کا چہرہ میرے خوابوں میں بس گیا تھا۔ غلام شیر یہ نہ سمجھنا کہ تنہائی‘ تمہاری کیفیت اور اپنے آپ کو عورت سمجھ کر میں تم سے یہ الفاظ کہہ رہی ہوں اور تمہیں اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مان سکو تو مان لینا کہ یہ حقیقت ہے جو میں نے تم سے کہی۔“

غلام شیر سچ مچ اس وقت نادیہ سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”نادیہ انسان کتنے واقعات کا مرکز ہے۔ میں ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا جس میں غربت تھی۔ جہاں میرے لئے کوئی مستقبل نہیں تھا۔ ایک سرکش اور ضدی لڑکے کی طرح میں نے پرورش پائی۔ میرے ماں باپ کے دل میں میرے لئے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بات میں غلط کہہ رہا ہوں یا صحیح۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری ماں اور میرا باپ اب مجھے کس انداز میں یاد کرتے ہوں گے۔ نادیہ! میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ مجھے بھول گئے ہیں۔ انہیں یاد بھی نہیں رہا کہ بیس ہزار روپے لے کر انہوں نے جس لڑکے کو فروخت کیا تھا اس کی کیا حیثیت ہے‘ کیا کیفیت ہے۔ وہ ان کا کیا لگتا تھا۔ مگر میں نے تمہیں اپنے بارے میں صحیح انداز میں تفصیل نہیں بتائی۔ نادیہ! میں بہرحال اپنے گھر میں پرورش پا رہا تھا کہ ایک ہندو شخص جو ہمارے گھر کے سامنے رہتا تھا‘ ہمارے گھر آیا۔ میں پائیل ہوں۔ یعنی پیروں کی طرف سے پیدا ہونے والا اور پائیل میں ایک

خاص صفت ہوتی ہے۔ کسی ایسے بیمار شخص جس کی کمر میں تکلیف ہو‘ اس کے لات مار دی جائے تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ پتہ نہیں سچ ہے کہ صرف وہم‘ ایک بوڑھے شخص کے سلسلے میں‘ میں گیا تھا اور دوسرے ہندو شخص جس کا نام کنہیا لعل تھا اس نے بیس ہزار کے عوض مجھے خرید لیا لیکن وہ کنہیا لعل نہیں بلکہ ایک شیطان تھا جس کے بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“

”ہاں۔ وہی شیطان جو تمہارا جسم لے کر فرار ہو گیا ہے۔“

”اسی کی بات کر رہا ہوں۔ بیس ہزار روپے میں اس نے مجھے میرے باپ سے خرید لیا اور مجھے ایک قربان گاہ میں لے جا کر قربان کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنا کوئی جادو منتر مکمل کرنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت ایک شخص وہاں پہنچ گیا۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ۔ یہ ایک ڈاکو تھا اس کا نام سنگلی تھا۔ بہرحال سنگلی مجھے اپنے ساتھ لے آیا اور اس نے بہت اچھے انداز میں میری پرورش کی۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے ایک ڈاکو بنا دیا لیکن میں ڈاکو نہ رہ سکا۔ وہ شیطان مسلسل میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور میں اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”اس کا نام ہیرا اچھوت تھا نا؟“ نادیہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”اور وہ سنگلی کون؟“

”میں نے بتایا نا نعمت خان سنگلی تھا اس کا نام۔ ڈاکو سنگلی۔ بہرحال ڈاکو سنگلی کا مسئلہ اس انداز میں ختم ہوا کہ ہیرا اچھوت وہاں پہنچ گیا۔“ غلام شیر نے نادیہ کو مکمل کہانی سنائی اور نادیہ بہت زیادہ متاثر نظر آنے لگی پھر اس نے کہا۔

”ہاں۔ ہم لوگ عجیب و غریب معاملات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ واقعی یہ بڑی سنگین صورت حال ہے لیکن اکال ساگر میں ایسے ہی واقعات جنم لیتے ہیں۔“

”اکال ساگر؟“

”یہ ایک اصطلاح ہے ایک نام ہے۔ اکال ساگر دکھوں کا گھر‘ دکھوں کا تالاب جس میں انسانی روحیں تڑپتی اور سسکتی ہیں‘ اس کو اکال ساگر کہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے نادیہ! اب مجھے یہ بتاؤ‘ آخر کار ہمارا مستقبل کیا ہو گا؟“

”دیکھو غلام شیر‘ تم خود ہی یہ بات سوچ لو اور کسی بھی انداز میں سوچ لو۔ میں تمہیں صرف ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ بابا صاحب نے جب تمہیں کسی مشن پر

بھیجا ہے تو سمجھ لو اس کا کوئی مقصد ہے۔ تم نے رضوان بابا کو دیکھا ہے۔ یہ بزرگ، درویش کس طرح اپنے آپ کو انسانوں کے لئے قربان کر دیا کرتے ہیں۔ ان کے لئے، جو انہیں کوئی صلہ نہیں دیتے۔ ڈسمنڈ نے بابا رضوان کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا اور بابا رضوان نے نہ صرف اس کے لئے بلکہ ایک آبادی کو بچانے کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟ بابا صاحب نے تمہیں بے مقصد نہیں بھیجا ہے۔ ضرور تمہیں کوئی فائدہ ہو گا۔"

"ایک بات بتاؤ نادیہ! کیا بابا صاحب نے تمہیں اس بارے میں کچھ بتایا ہے کہ ہمارا تمہارا کیا ہو گا؟"

"نہیں۔ یقین کرو۔ بابا صاحب نے مجھے نہیں بتایا۔ اگر وہ بتاتے اور اس بات سے منع نہ کرتے کہ میں تمہیں بتا دوں تو میں تمہیں ضرور بتا دیتی۔"

"اور اگر بابا صاحب منع کرتے تو؟"

"تو غلام شیر! میں تمہیں نہیں بتاتی۔ بہرحال اعتماد بھی تو ایک ایسی منزل ہوتا ہے جس کے بعد آگے پیچھے کچھ نہیں رہتا۔"

غلام شیر عجیب سے انداز میں نادیہ کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ "نادیہ تم نے مجھ سے محبت کا اقرار کیا ہے۔"

"ہاں۔ غلام شیر تم یقین کرو، میں کوئی بری لڑکی نہیں ہوں۔ میں نے تو زندگی کے اتنے الٹ پھیر دیکھے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں اپنے کسی خاص جذبے کے تحت تم سے یہ الفاظ بالکل نہ کہتی لیکن میرے دل میں پہلی بار یہ جذبہ پیدا ہوا ہے اور آخری بار بھی۔ بالکل نہیں چاہوں گی اس بات کو کہ تم اپنی مرضی کے خلاف کسی بھی مشکل میں مجھے قبول کرو لیکن کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"تو نادیہ دنیا کی ہر بات چھپائی ہے تم نے مجھ سے۔ ہیں۔ بولو جواب دو۔ اعتماد اسے کہتے ہیں؟"

نادیہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"کیا میں تمہارے بارے میں کچھ جانتا ہوں؟" غلام شیر نے کہا اور نادیہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

غلام شیر نے اس سے پہلے کبھی بھی کسی سے اس طرح کے سوالات نہیں کئے تھے۔ ذہنی طور پر وہ کبھی کسی سے اتنا متاثر ہی نہیں ہوا تھا جو ایسے سوالات کرنے کی ضرورت

پیش آتی۔ اور پھر سچی بات تو یہ تھی کہ یہ پہلی لڑکی تھی جو اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں اس کے لئے ایک جگہ بن گئی تھی۔ بہرحال نادیہ سر جھکائے بیٹھی سوچتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ماضی کی قبر کھود رہی ہو۔ وہ قبر جس میں اس نے اپنا ماضی دفن کر دیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ غلام شیر اس کی ہر کیفیت پر غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا پھر نادیہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تو غلام شیر کسی قدر بے چین ہو گیا۔

"یہ کیا نادیہ۔ تم رو رہی ہو۔" نادیہ اس طرح چونکی جیسے اپنے ماحول سے پوری طرح بے خبر ہو گئی ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ میرے ماضی میں اتنے دکھ بھرے ہوئے ہیں غلام شیر کہ میں اسے یاد کرتے سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں لیکن ماضی جب بھی کبھی یاد آ جاتا ہے، دل کی حالت ایسی ہو جاتی ہے۔ تم نے ڈالیوں پر ہنستے ہوئے گلاب دیکھے ہوں گے جن کی مسکراہٹ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ گلاب دل میں کھلے ہیں۔ آنکھوں کو فرحت اور دل کو تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ ہنسنے والے گلاب کبھی نہیں روئیں گے لیکن چند ہی لمحوں کے بعد ہوا کے تیز جھونکے انہیں اس طرح منتشر کر دیتے ہیں کہ ان کی بکھری ہوئی پتیاں تک سمیٹی نہ جا سکیں اور اس لمحوں کی زندگی پر غم کے آنسو نہ نکلیں تو انسان کو انسان ہی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ میں ایسی ہی ایک لڑکی ہوں جو کسی شاخ پر چٹکی اور اس کے بعد آنسوؤں کی تحریر بن گئی۔ کون جانے کس دل میں کیا چھپا ہوا ہے۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں جو کہانی سجائے ہوئے ہوں، سنو گے تو دکھ ہو گا تمہیں بھی لیکن اب تم نے دل کی وادیاں چھیڑ دی ہیں۔ ان وادیوں میں طوفان اٹھ رہے ہیں اور وقت چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ ایک بار پھر اسی ماحول میں کھو جاؤں۔ اس ماحول سے گہرا ربط ہوتا ہے انسان کا۔ تم کیا جانو غلام شیر کہ خوبصورت گھر کے آنگن میں لگے ہوئے پیپل کے درختوں پر پڑے ہوئے جھولے جب ہچکولے لیتے ہیں تو کیا محسوس ہوتا ہے۔ تم کیا جانو غلام شیر کہ سرمئی پھواروں کے بیچ میں، سہیلیوں کے گیتوں میں، کھو کر زندگی کیا چیز بن جاتی ہے۔ آرزوئیں بڑی بے درد ہوتی ہیں اور مایوسیاں بہت ہی قاتل، میری زندگی کی کہانی بھی اتنی ہی مختصر اور اتنی ہی بھیانک ہے کہ تمہیں سناؤں تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"ہاں۔ میں نے زندگی کو اتنا قریب سے نہیں دیکھا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا نادیہ کہ زندگی سے تو متاثر ہوا ہی نہیں۔ بس وقت کے تھپیڑوں میں اِدھر سے اُدھر گردش

کرتا رہا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ شاید ہر دل زخمی ہے۔ ہر وجود کے اندر ایک کہانی چھپی ہوئی ہے۔ بس بات اتنی سی ہے کہ کوئی اس کہانی کو کرید کر دیکھے۔"

"میرے زخم بہت گہرے ہیں غلام شیرا! میرے دل کی دنیا میں جس قدر ویرانی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میری زندگی میں روشنی کی کوئی کرن نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ بابا صاحب نے سکون کا ایک سمندر میرے سینے میں سجا دیا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی چیز میرے لئے قیمتی نہیں ہے........ اور غلام شیرا اب یہ کہنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتی کہ میرے دل میں جو جذبے پھوٹے ہیں۔ شاید وہ مجھے زندہ رہنے میں بڑی مدد دیں۔"

"واقعی ایسا ہوتا ہے۔ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں یہ اندازہ لگا رہا ہوں کہ بہت ہی سنگین کوئی کہانی تمہاری زندگی سے وابستہ ہے۔"

"ہاں۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں بس' میں تمہیں کیا بتاؤں۔ کیا تھی کیا بن گئی تھی۔ گھر تھا میرا بھرا پُرا۔ سب تھے۔ میرے والد ایک نواب کے ہاں ملازمت کرتے تھے۔ اس نواب کا نام نواب شیرا تھا۔ ایک چھوٹی سی ریاست تھی اس کی بس ریاست کیا جاگیر سمجھ لو۔ کہا جاتا تھا اسے خیر نگر لیکن حقیقتاً وہ شر نگر تھا۔ خیر نگر میں نواب شیرا کا پورا خاندان آباد تھا۔ بڑا سا محل تھا اس کا اور اس محل نما حویلی کے گیت گائے جاتے تھے کیونکہ لوگوں کی نگاہوں میں نواب شیرا بہت رحم دل اور نفیس انسان تھا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ نواب شیرا کے والد' نواب احتشام الدین اور ماں اپنی بستی میں رہنے والوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔ بڑی ذمے داری قبول کر لی تھی انہوں نے۔ آس پاس کی جاگیروں کی بہت بڑی آمدنی تھی لیکن جب تک نواب شیرا کے والد برسرِ اقتدار رہے اس آمدنی کا بہت بڑا حصہ خیر نگر میں رہنے والوں کے کام آتا تھا اور بڑی روایات اس سے وابستہ تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ اس حویلی میں جو بھی چلا جاتا تھا اور اپنی ضرورت لے کر جاتا تھا وہ خالی ہاتھ کبھی نہیں لوٹتا تھا۔ بڑے نواب صاحب بچیوں کی شادیاں کرواتے تھے۔ بوڑھوں کی زندگی بنا دی جاتی تھی اور خاص طور سے وہ جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا تھا' یہ حویلی ان کا سب سے بڑا سہارا ہوتی اور اس حویلی میں نواب شیرا بھی موجود تھا۔ نواب شیرا نے ایک عجیب ہی چکر چلا رکھا تھا وہ اپنے آپ کو ایک درویش کہتا تھا۔ ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ باپ نے شادی کے لئے کہا تو گردن خم کر کے کھڑا ہو گیا اور غم بھرے لہجے میں بولا۔

"آپ لوگوں کی یہ خواہش میں کبھی پوری نہیں کر سکوں گا۔ میری زندگی دنیاوی بوجھ اٹھانے کے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔ میری روح تو آسمان کی گہرائیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ دنیا میں بکھرے ہوئے ان تمام غم نصیبوں کی زندگی سے غم دور کر دوں جو زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ بہرحال چونکہ نواب صاحب خود بھی ایک نیک دل انسان تھے۔ بیٹے کی ان باتوں سے بہت زیادہ خوش ہوئے اور اس درویش صفت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ عظیم الشان حویلی کے ایک بڑے سے حصے میں اس کے لئے ایک بڑا سا حجرہ بنوا دیا گیا جہاں وہ عبادت کرتا تھا۔ اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں باپ دہری کیفیت کے شکار تھے۔ ایک طرف تو ان کے دل میں یہ خیال تھا کہ بیٹے کی دنیا آباد کر کے حویلی کی رونق بڑھائی جائے۔ نسل کو بڑھایا جائے لیکن اس کی آرزو کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ درویش بن گیا۔ بڑا علم حاصل ہوتا جا رہا تھا اسے اور لوگ اس کی بڑی عزت کرنے لگے تھے۔ اب تو لوگ دور دور سے اس کے پاس آنے لگے۔ کسی کی کوئی منت ہوتی' مجال ہے پوری نہ ہوتی۔ تاحدِ نظر ہر طرف نواب شیرا کے افسانے پھیل گئے۔ بیٹوں میں کوئی اور بیٹا نہ تھا لیکن نواب شیرا کی کئی بہنیں تھیں۔ ان میں سے کچھ کی شادیاں ہو چکی تھیں اور کچھ کنواری تھیں۔ خاص طور سے ایک بہن نواب شیرا کو بہت پیاری تھی۔ بہرحال بستی اور بستی کے آس پاس چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے تھے۔ بہت سی کہانیاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کہانیوں میں ایک کہانی خاص طور سے بیان کی جاتی تھی۔ خیر نگر سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی ایک لڑکی نیلا اپنے گھر سے گم ہو گئی اور پھر جنگل میں اس کی نوچی ہوئی لاش پڑی ہوئی ملی۔ نیلا کا منگیتر نیلا کے لئے بے حد پریشان ہو گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ نیلا کے قاتلوں سے بدلہ لے کر چھوڑے گا۔

چنانچہ اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن نیلا کا منگیتر' نیلا کے قاتلوں کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ نہ جانے کیسے کیسے اس نے معلومات حاصل کیں اور اسے پتہ چلا کہ نیلا کا قاتل کون ہے اور ایک دن اس نے بڑے افسوس بھرے لہجے میں لوگوں سے کہا کہ خیر نگر کا درندہ نواب شیرا نیلا کی موت کا باعث ہے۔ لوگ اس طرح نواب شیرا سے متاثر تھے کہ وہ نیلا کے منگیتر پر ٹوٹ پڑے اور اسے مار مار کر ادھ مرا کر دیا۔ بھلا نواب شیرا جیسے فرشتہ صفت آدمی کے بارے میں یہ بات کون سن سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بدنصیب نے خودکشی کر لی اور کہانی ختم ہو گئی لیکن صرف ایک کہانی ختم ہوئی تھی۔ اس دوران اور بھی

ایسی کہانیاں جنم لیتی رہیں لیکن اب کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ جاننے کے باوجود یہ کہہ سکے کہ نواب شیرا اس کہانی کا موجد ہے۔ نواب شیرا زیادہ تر اپنے حجرے میں رہتا تھا اور عام طور سے لوگ دیکھتے تھے کہ وہ عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ ہاں کہیں کسی غمی خوشی کا یا کسی اور قسم کا مسئلہ ہوتا تو وہ آگے بڑھ کر اس میں حصہ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ بڑے نواب صاحب کا انتقال ہو گیا اور پھر ان کی بیوی بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ چھوٹی بہن بھی اب جوان ہو گئی تھی۔ مگر نواب شیرا کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ بہن کی طرف دیکھتا۔ اس نے تو صرف عبادت کے سوا اور کچھ کرنا ہی نہیں تھا۔ میرے والد جن کے بارے میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ نواب شیرا کے ہاں ملازمت کرتے تھے' ان کا نام نادر خان تھا۔ ہم بھی' میرا مطلب ہے میرے والد بھی اپنی کئی پشتوں سے اس خاندان کے نمک خوار تھے۔ بڑے نواب صاحب کی موت کے بعد بھی وہ اپنی جگہ کام کرتے رہے۔ بہت اعتماد کیا جاتا تھا ان پر۔ ریاست کا سارا خزانہ ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور وہ ریاست کے تمام کاموں کے ذمے دار تھے لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا جب وہ خاصی حد تک پریشان ہو گئے۔ زمینوں کی آمدنی' جائیدادوں کی رقم' ملوں اور فیکٹریوں کا سرمایہ یہاں لمبے عرصے سے آ رہا تھا اور اس کے آنے کے رفتار بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ حساب کتاب تو اپنی جگہ تھا لیکن کچھ ایسے کھاتے بھی کھولے گئے تھے جو اس سارے حساب کتاب سے الگ تھے اور ان کا حساب کروڑوں میں جمع کیا جا رہا تھا۔ یہ پیسے کہاں سے آ رہے تھے' میرے ابو کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہرحال یہ کوئی ایسی تشویش کی بات تو نہیں تھی جس پر وہ پریشان ہوتے۔ جب بھی کوئی ضرورت ہوتی تو وہ آرام سے نواب شیرا کے حجرے میں پہنچ جاتے۔ وہاں ان سے بات کرتے اور نواب صاحب بہت ہی پُراخلاق لہجے میں انہیں تفصیلات بتا دیا کرتے تھے۔ پھر ایک مرتبہ شہر سے ایک نمائندہ ایک بہت بڑی رقم مانگنے کے لئے آیا۔ اس نے کہا کہ یہ رقم اس کو صبح بھرنی ہے اور اگر وہ نہ بھری گئی تو خواہ مخواہ بدنامی ہو گی جو نواب شیرا جیسے عظیم انسان کے لئے مناسب نہیں تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ساری تفصیلات طے کرنے کے لئے میرے والد صاحب بحالت مجبوری اس حجرے میں چلے گئے جہاں نواب شیرا نے اپنی تنہائی قائم کر رکھی تھی۔ جب میرے والد صاحب اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ پورا حجرہ ویران اور سنسان پڑا ہوا ہے۔ ویسے بھی یہاں سوائے شیرا کے اور کوئی نہیں آتا تھا۔ حجرے میں کئی حصے تھے۔ میرے والد صاحب کو یہ احساس ہوا کہ وہاں ایک دروازے کے دوسری جانب شاید نواب شیرا موجود ہے۔ چنانچہ وہ وہاں اندر

داخل ہو گئے اور وہیں سے ان کی بدنصیبی کا آغاز ہو گیا۔ یہاں انہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جسے دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی اپنی زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہی ہے۔ اسے گردن دبا کر مار دیا گیا تھا۔ اس کا جسم بے لباس تھا اور اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرنے والا وہی نواب شیرا تھا جس کی درویشی اور بزرگی کے افسانے چاروں طرف مشہور تھے۔ میرے والد ساکت رہ گئے تھے۔ ان کے جسم کا جیسے سارا خون نچڑ گیا تھا۔ نواب شیرا نے انہیں دیکھ لیا اور اچانک ہی اس کے چہرے پر شیطانیت ابھر آئی۔

"میاں.......... تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"وہ.......... نواب صاحب میں ایک کام سے آیا تھا۔"

"کام.......... کیسا کام؟ تم کو یہاں اندر آنے کی اجازت کس نے دی؟"

"وہ دراصل ایک نمائندہ شہر سے.........." میرے والد کی نگاہیں مظلوم لڑکی کا جائزہ لے رہی تھیں جسے شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے قتل کیا گیا تھا۔ وہ آخری ہچکی لے کر ان کے سامنے ہی مر گئی تھی۔ اچانک ہی نواب شیرا کے اندر سکون ابھر آیا۔

"ہاں۔ اب بتائیے کیا بات ہے؟ کیسی رقم؟ آپ ایک اچھے اور شریف آدمی ہیں۔ آپ کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہئے تھا لیکن بہرحال اب آ ہی گئے ہیں تو بتائیے کیا بات ہے؟"

"یہ.......... یہ کون ہے؟" اچانک ہی میرے والد صاحب کے اندر انسانیت ابھر آئی اور انسان کسی کی بڑائی کو نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک نیکی اور شرافت ہی سب سے بڑی بڑائی ہوتی ہیں۔

"اوہ.......... یہ پتہ نہیں بے چاری کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ روتی ہوئی ہمارے پاس آئی۔ کوئی گنڈا' تعویذ چاہتی تھی مگر پوری بات نہیں بتا سکی اور مر گئی۔" نواب شیرا نے مکارانہ انداز میں کہا۔

"لیکن یہ تو ابھی ابھی.........."

"ہاں ہاں۔ کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"اسے.......... اسے آپ نے قتل کیا ہے۔ نواب شیرا اسے آپ نے قتل کیا ہے؟"

"ارے نہیں نہیں۔ زندگی اور موت انسان کے ہاتھوں میں کہاں ہوتی ہے۔ نادر

علی صاحب یہ تو بس جس کی بھی تقدیر میں جو کچھ لکھا ہو' اسے مل جاتا ہے۔ ہم کیا ہماری اوقات کیا۔ جب ہم کسی کو زندگی دے نہیں سکتے تو لے کیسے سکتے ہیں۔"

"یہ.......... یہ آپ نے بہت برا کیا ہے۔ آپ جتنے بڑے باپ کی اولاد ہیں نواب شیرا.........."

"الو کے پٹھے! تو ہمیں یہ سب کچھ سمجھا رہا ہے۔ ہم سے زیادہ جانتا ہے تو۔ ہم تجھے بتائیں کہ انسان کیا چیز ہوتی ہے۔ وقت پر ضرورت ہی روح ہے۔ اگر ضرورت وقت پر پوری نہ ہو تو روح مرجاتی ہے اور روح مرجاتی ہے تو انسان بھی مرجاتا ہے۔ اگر ہماری روح کی یہ خواہش پوری ہوتی رہے تو ہم زندہ رہیں گے ورنہ زندگی ضروری تو نہیں ہے' اور تم .... تم یہاں منہ اٹھا کر چلے آئے۔ جانتے ہو تم نے اپنی زندگی کا کتنا بڑا نقصان کرلیا ہے۔ تمہاری آنکھوں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ کانوں نے سب کچھ سن لیا۔ اب تم بتاؤ ہم کیا کریں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم جیسے آدمی کو ہم نقصان پہنچائیں لیکن ہم کیسے بھروسہ کر لیں کہ تمہاری زبان بند رہے گی؟ تمہیں یہ سب کچھ معلوم نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لڑکیوں کی جنگلوں میں ملنے والی لاشیں ہماری ہی وجہ سے عالم وجود میں آتی ہیں لیکن.......... لیکن اس کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم۔"

"اوہ۔ یہ درندگی آپ کرتے تھے نواب شیرا؟"

"پاگل کے بچے! بار بار ایسی باتیں کر رہے ہو کہ میری زبان تم سے گستاخی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ ہمارے پاس آتی ہیں اور پھر اس دنیا سے دور چلی جاتی ہیں۔ اب وہ کہاں جاتی ہیں' ہم تم جیسے بے وقوف لوگوں کو کیوں بتائیں؟"

"میں کیا کہوں۔ میں کیا کہوں آپ سے؟ دنیا آپ کو کیا سمجھتی تھی اور آپ کیا ہیں۔"

"آہ۔ نہیں مان رہا تو۔ نہیں مان رہا نادر علی! کتنے افسوس کی بات ہے۔ بڑا اچھا سمجھتے ہیں ہم تجھے۔ بہت سی ذمے داریاں سنبھال رکھی ہیں تو نے ہماری۔ مگر تو اپنی ہی بکواس کیے جا رہا ہے۔"

"آج سے یہ نوکری تو خیر میں ویسے بھی نہیں کروں گا چھوٹے نواب! لیکن یہ بتاؤ یہ لڑکی ہے کس کی؟ تم زبان بند کرنے کے لئے کہتے ہو مجھے' میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسی وقت تمہارے گناہوں کی سزا دے دوں۔"

"ہوں۔ اچھا۔" اچانک ہی نواب شیرا نے اپنے لباس سے پستول نکال لیا اور اس کا

رخ نادر علی کی طرف کر کے کہا۔

"نادر علی اس پستول میں جتنی گولیاں ہیں خاموشی سے تمہارے بدن میں اتاری جا سکتی ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمہاری موت اس وقت انتہائی ضروری تھی لیکن میں تمہیں پھر ایک موقع دیتا ہوں کہ اپنے آپ کو سنبھالو اور مجھ سے سمجھوتا کرو۔"

شدت اور جوش کا طوفان اتر گیا۔ میرے والد نے سوچا کہ اگر اس وقت وہ نواب شیرا کے ساتھ سختی کرتے ہیں تو وہ آرام سے انہیں قتل کر دے گا۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ چنانچہ چالاکی سے کام لینا ضروری ہے۔ چنانچہ ان کی گردن جھک گئی۔ کچھ لمحے وہ سوچتے رہے پھر انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اصل میں انسان پر ایک لمحے کے لئے شرافت کا بھوت سوار ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے میں نہ تو مرنا چاہوں گا اور نہ یہ چاہوں گا کہ میری نوکری چھوٹے۔ جینا تو ہے مجھے اپنے خاندان کے ساتھ۔"

"ہاں۔ زندگی بہت قیمتی چیز ہے اور پھر ایک بے مقصد عمل جو تمہیں کچھ بھی نہ دے اس کے لئے تم زندگی کھو دو۔ کوئی عقل کی بات تو نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"اچھا۔ اب یہ بتاؤ کہ کیسے آنا ہوا تھا؟"

میرے والد انہیں میری آمد کا مقصد بتایا تو وہ کہنے لگے۔ "بس ایسے کام خود ہی نمٹا لیا کرو۔ ہمیں تم پر مکمل اعتماد ہے اور اب مزید اعتماد ہو گیا ہے۔"

"واقعی؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"تو پھر آپ مجھے ایک بات بتایئے نواب شیرا۔"

"ہاں۔ پوچھو۔"

"آپ ان لڑکیوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں مگر انہیں قتل کیوں کر دیتے ہیں؟"

"تم پاگل ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے' اگر ہم انہیں قتل نہ کریں تو یہ ہمارا راز کھول نہیں دیں گی۔"

"یہ تو بہت ہی خوفناک بات ہے۔"

"بیکار باتیں نہ کرو۔ ہم ان باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور پھر تمہیں سچ بتائیں'

ایک بار جو ہمارے استعمال میں آ جائے' جو کچھ لمحوں کے لئے ہی ہمارے بدن کا قرب حاصل کرے' بعد میں اسے کسی اور بدن کا قرب حاصل ہو ہم یہ پسند نہیں کرتے۔ سمجھ رہے ہو نا۔ ہم یہ پسند نہیں کرتے۔"

"جی۔"

"اچھا تو تم اس مسئلے کو حل کر لو۔ کیا ہمیں یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو گے؟"

"نہیں۔ نہیں ضرورت نہیں ہے۔" میرے والد نے کہا۔

"اچھا اب تم ایک کام کرو۔ یہ لاش ٹھکانے لگا دو۔" نواب شیرا نے کہا اور والد صاحب کا پورا بدن کانپ کر رہ گیا۔

"میں؟"

"ہاں۔ تاکہ تم ہمارے کام میں برابر کے شریک ہو جاؤ۔ یہ لاش تم اپنے کندھے پر لاد کر لے جاؤ اور جنگل میں کسی بھی جگہ پھینک دو۔ بلکہ جگہ ہم بتائے دیتے ہیں۔ سنو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تم سچے دل سے ہمارے لئے کام کر رہے ہو اور اگر ایسا نہ کیا تو ظاہر ہے ہم تمہیں یہ سب کچھ نہیں کرنے دیں گے۔"

نادر علی نے عقل سے کام لیا۔ جو کچھ ہوا تھا اس پر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن ظاہر ہے میرے سیدھے سادے والد نواب شیرا سے ٹکر نہیں لے سکتے تھے۔ بہرحال انہوں نے دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی موقع ملا وہ اس شیطان کو بے نقاب کردیں گے۔ ویسے تو وہ جانتے تھے بلکہ ایسے کچھ واقعات پیش آ بھی چکے تھے جب کسی نے لڑکیوں کے قتل کے سلسلے میں نواب شیرا کی نشاندہی کی تھی اور نواب شیرا نہیں بلکہ ان لوگوں نے اس کا تیا پانچا کر دیا تھا جو نواب شیرا کے عقیدت مند تھے۔ نواب شیرا نے اپنا جال جس طرح پھیلایا تھا' اس کے بعد اس کے خلاف کچھ کرنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن نواب شیرا بھی انتہائی شیطان صفت آدمی تھا اس نے میرے والد کی زبان بند کرنے کے لئے فوری طور پر انتظام کر ڈالا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ لاش میرے والد کو ٹھکانے لگانی ہے۔ چنانچہ نادر علی نے لاش کندھے پر ڈالی۔ نواب شیرا نے انہیں چور دروازہ بتا دیا تھا۔ وہ چور دروازے سے باہر نکل گئے اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں انہیں لاش ٹھکانے لگانی تھی لیکن عین اس وقت جب وہ لاش کو اپنے کندھے سے اتار رہے تھے' ان پر تیز روشنیاں پڑیں اور ایک لمحے کے اندر انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کی تصویریں بنائی جا رہی

ہیں۔ ان کا خون خشک ہو گیا تھا۔ لڑکی کی لاش ان کے پاس موجود تھی اور ان کی تصویریں اس لاش کے ساتھ بن گئی تھیں۔ وہ دنیا میں کسی سے بھی کہتے پھرتے لیکن اب یہ ذمے داری ان پر ہی عائد ہو گئی تھی۔ یہ جواب دینا مشکل تھا کہ یہ لاش ان کے پاس کیوں ہے۔ بہرحال ان تمام باتوں کو جاننے کے بعد بھی انہوں نے اپنا کام کیا اور واپس چل پڑے۔ مگر ان کی جو کیفیت تھی ان کا دل ہی جانتا تھا۔ گھر میں میری والدہ اور ایک بہن بھی تھی۔ اس کے علاوہ میرے چچا کے کچھ بچے بھی ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ میرے والد کی آمدنی اچھی خاصی تھی۔ تھوڑی سی زمینیں بھی تھیں ہمارے پاس۔ یہ زمینیں ہمیں بڑے نواب صاحب نے دی تھیں۔ اس طرح ہمارے حالات بھی بہت بہتر تھے۔ بہرحال میرے والد کی حالت بہت خراب ہو گئی اور انہوں نے میری ماں کو ساری تفصیلات بتا دیں۔ یہ تفصیلات سن کر میری ماں کا برا حال ہو گیا تھا۔ میرے والد نے زخمی لہجے میں کہا۔

"تم یہ سمجھ لو بہانشہ کہ میرا اب اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ پتہ نہیں کون بچی تھی وہ۔ میں جانتا ہوں کہ خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"وہ ان تصویروں سے کیا کام لے گا؟"

"بس۔ میری زبان بند رکھے گا وہ' لیکن میں کیا کروں؟ میرا ضمیر بھی تو مجھے چین نہیں لینے دے گا۔ خدا کی پناہ بستی میں ملنے والی لاشیں اس شیطان کی شیطنیت کا نتیجہ تھیں۔ آہ اگر میں بستی کے چوک میں بھی کھڑے ہو کر یہ بات لوگوں کو بتاؤں تو میں جانتا ہوں وہ مجھے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ کاش! ان بچیوں کو اس سے بچا سکوں جو مستقبل میں اس کی بھینٹ چڑھنے والی ہیں۔"

بہرحال یہ ساری باتیں وہ کرتے رہے لیکن انہیں اپنا کام تو کرنا ہی تھا۔ ہم بڑے خوف زدہ ہو گئے تھے کیونکہ میری والدہ نے ساری باتیں مجھے بھی بتا دی تھیں۔ جب مجھے ان تمام باتوں کا پتہ چلا تو میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت ابھر آئی۔ میں نے ماں سے کہا۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگر اس طرح لڑکیاں اس کی بھینٹ چڑھتی رہیں اور لوگوں کو پتہ نہ چلا تو جو اس کا دل چاہے کرتا رہے گا۔ یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں سمجھتی ہوں ہمیں اس کے خلاف کچھ کرنا چاہئے۔"

"پاگل ہوئی ہو تم' بکواس بند کرو۔ دنیا کے بارے میں کچھ جانتی ہو کہ نہیں؟ ہمارا اور اس کا کیا مقابلہ! وہ اتنا بڑا آدمی اور ہم اس کے غلاموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اسے کیا نقصان پہنچا سکیں گے۔"

ماں نے جو کچھ کہا اور میں یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ صبح کو میرے والد اپنی ملازمت پر چلے گئے تھے لیکن شام کو جب وہ واپس آئے تو ان کا چہرہ بری طرح اترا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنے ضمیر سے جنگ کر رہے ہیں لیکن میں ایک الھڑ اور بے وقوف لڑکی تھی۔ میں ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ انہوں نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ بولے۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

"کیا یہ معلوم ہو سکا کہ جو لاش آپ نے ٹھکانے لگائی ہے وہ کس کی تھی؟"

میرے والد یہ سن کر دنگ رہ گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "تت.......... تجھے...... تجھے کس نے بتائی یہ بات؟"

"کیا ہم اتنے ہی چھوٹے ہیں؟ میں تو اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتی تھی۔ بہت بڑے باپ کی بیٹی سمجھتی تھی میں اپنے آپ کو لیکن ہم.......... ہم.........." میری آواز لرز گئی لیکن نادر علی صاحب کی گردن نہیں جھکی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"تیرا کیا خیال ہے اتنا ہی بے غیرت ہوں میں۔ نہیں.......... ایسی بات نہیں ہے نادیہ! میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں بیٹا! لیکن ذرا سی غلطی کرتا تو تجھے اپنے باپ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں جس کی لاش میں اپنے کندھے پر ڈال کر پھینک کر آیا ہوں۔ وہ کسی اور کی نہیں میری اپنی ہی بیٹی تھی۔ اس بیٹی کی لاش کو میں کیسے نظر انداز کر سکتا ہوں۔ خدا کی قسم میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ مگر میں کچھ کئے بغیر نہیں مرنا چاہتا۔ مجھے وقت چاہئے۔ تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ اسے زیر کرنا آسان کام نہیں ہو گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ میں ایک بات اور جانتا ہوں وہ یہ کہ وہ صرف یہاں خیر نگر میں اپنے ملازموں پر ہی بھروسہ نہیں کرتا بلکہ اس کا تعلق کچھ ایسے لوگوں سے بھی ہے جو یہاں نہیں رہتے۔ میں اس کے خزانے کا حساب جانتا ہوں۔ اس کے خزانوں میں جس طرح دولت باہر سے آتی ہے' وہ نہ زمینوں کی کمائی ہوتی ہے نہ جائیدادوں کی۔ کچھ پراسرار لوگ اس سے ملتے رہتے ہیں۔ ایسے آدمی سے جھگڑا مول لینا آسان کام تو نہیں ہے لیکن بہرحال میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ چھوڑوں گا نہیں اسے۔ ایسا اسے زیادہ عرصے تک نہیں کرنے دوں گا میں' اور اگر ایسے مسئلے میں میری جان چلی جائے تو تم سمجھ لینا کہ تمہارا باپ برا آدمی نہیں تھا۔"

بے شک نادر علی صاحب کے الفاظ بڑے مکمل تھے۔ میں نے کہا۔ "ابو اگر اس سلسلے میں میری کہیں ضرورت ہو تو میں بھی اس نیک مقصد کو پورا کرنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی نہیں بیٹا! ابھی نہیں۔ میں ہار گیا۔ میں تھک گیا تو وعدہ کرتا ہوں کہ تجھ سے مدد لوں گا۔"

بہرحال اس کے بعد ابو نواب شیرا کے بارے میں تفصیلات معلوم کرتے رہے۔ میری اس سلسلے میں اکثر ان سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ وہ واقعی بہت ہی برا انسان تھا۔ شاید اپنے باپ کی زندگی میں ہی اس نے چاروں طرف اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا لئے تھے اور بہت کچھ کرتا رہتا تھا۔ اس طرح کافی وقت گزر گیا۔ مجھ سے نواب شیرا کے متعلق بات ہوتی رہتی تھی اور میرے ابو مجھے بتایا کرتے تھے کہ وہ کس طرح ایک درویش بن کر اللہ والا بن کر بدترین وارداتیں کر رہا ہے۔ البتہ ایک اور بات خیر نگر میں ہو رہی تھی۔ وہ یہ کہ وہاں کے رہنے والے خوشحال ہوتے جا رہے تھے۔ نواب شیرا غریب لوگوں کو پیٹ بھر کر رقم دیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ اپنی ضرورتیں پوری کریں اور اس کے لئے کام کر کے اس رقم کی ادائیگی کریں۔ اس طرح دیکھنے والے یہ دیکھ رہے تھے کہ نواب شیرا کے لئے لوگوں کے دلوں میں عقیدت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ان لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو نواب شیرا کی اصلیت کو جانتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ وہ ایک برا انسان ہے لیکن وہ اس کے خلاف کوئی عمل نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ایک دفعہ میرے ابو کو کہیں باہر کسی کام سے جانا پڑا۔ انہوں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہمارے کہیں دور کے رشتے دار پولیس میں ایک افسر اعلیٰ تھے اور سب انکل۔ ہماری ان سے کوئی ملاقات وغیرہ نہیں ہوتی تھی لیکن رشتے تو رشتے ہوتے ہی ہیں۔ ابو نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے ملاقات کی۔ پھر انہوں نے نواب شیرا کے بارے میں انہیں ساری تفصیلات بتائیں اور کہا۔

"میں اس خاندان کا نمک کھا رہا ہوں اور اپنی ساری زندگی اس کے لئے وقف کر چکا ہوں لیکن یہ مجبوری ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ وہ وارداتیں نواب شیرا نے کی ہیں؟"

"ہاں۔ نواب شیرا نے یہ سب کچھ کیا ہے اور آپ اگر اس سلسلے میں کوشش کریں تو آپ ایک بہت بڑے اسمگلر کو گرفتار کر سکتے ہیں۔ وہ بے شمار چیزیں اسمگل کرتے ہیں اور باہر سے منگواتے ہیں۔"

میرے والد کا کہنا ہے کہ پولیس افسر کے چہرے کے نقوش تبدیل ہو گئے تھے۔

انہوں نے کہا۔ ”آپ نے کسی اور افسر سے بھی گفتگو کی ہے؟“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔“ میرے والد نے تمام تفصیلات انہیں بتا دیں۔

”ہوں۔ اس کہانی کا کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟“

”ہزاروں ثبوت مل جائیں گے اگر آپ اس سلسلے میں تحقیقات کریں۔“

”میں ضرور تحقیقات کروں گا آپ خاموشی سے اپنے گھر جایئے اور احتیاط رکھئے۔“

بہرحال میرے والد وہاں سے چلے آئے لیکن وہ بے سکون تھے۔ دو تین دن اسی طرح گزر گئے۔ ان کی کیفیت دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ پھر یہ چوتھے دن کی بات ہے کہ صبح ہی صبح ہمارے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی اور میں دروازہ کھولنے چلی گئی لیکن میں نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گئی تھی۔ یہ نواب شیرا تھے۔ میں نے تو انہیں کئی بار دیکھا تھا لیکن کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ہمارے گھر کے دروازے پر بھی آ جائیں گے۔ اس وقت وہ ہمارے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میں ہکابکا رہ گئی۔ وہ خود بھی حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے بڑی نرم اور میٹھی آواز میں کہا۔

”تم نادر علی کی بیٹی ہو؟“

”جی۔“

”مجھے جانتی ہو؟“

”جی ہاں کیوں نہیں۔“

”ہوں۔ تم اکیلی بیٹی ہو نادر علی کی؟“

”نہیں میری بہن بھی ہے۔“

”چھوٹی ہے تم سے؟“

”ہاں۔“

”تمہارا کیا نام ہے؟“

”نادیہ۔“

”اور تمہاری بہن کا؟“

”فوزیہ۔“

”ہوں۔ نادر علی ہیں گھر میں؟“

”جی۔“

”تو انہیں بتاؤ کہ ہم آئے ہیں۔“ میں واپس مڑی تو مجھے یوں لگا جیسے نواب شیرا کی نگاہیں میرے بدن میں داخل ہوئی جا رہی ہیں۔ بہرحال جب میرے والد نے یہ بات سنی تو ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ پھر وہ باہر جا کر بڑی عزت کے ساتھ نواب شیرا کو گھر کے اندر لے آئے۔ نواب شیرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نادر علی! بڑے عزیز ہو تم ہمیں' بڑی عزت کرتے ہیں ہم تمہاری شاید تم ہم سے ناراض ہو گئے ہو۔ ہم تمہیں منانے آئے ہیں۔“ میرے والد کی کیفیت جو کچھ تھی' میں ایک درز سے پوشیدہ طور پر انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ نواب شیرا نے کہا۔

”دیکھو۔ ہم تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ عام طور سے ہم کسی کے گھر جاتے نہیں۔ لیکن نادر علی تو نادر ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہمارا دل چاہا تو ہم تم سے ملنے آ گئے۔ کیا سمجھے؟ لیکن ہمارا دل عام طور سے ایسی کسی بات کو نہیں چاہتا۔ تم سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن سوچا کہ چھوڑو' نادر علی تو اپنے برسوں کے ساتھی ہیں اچھا۔ پھر چلتے ہیں۔“

”لیکن نواب صاحب!“ میرے والد نے کہا۔ نواب شیرا کی وہ مکروہ ہنسی مجھے آج بھی یاد ہے جس میں ہزاروں خوف کے احساسات چھپے ہوئے تھے۔ بھلا میرے والد اسے کیسے روک سکتے تھے۔ وہ چلا گیا لیکن میرے والد سکتے میں رہ گئے تھے۔ آہستہ آہستہ میں چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر سنبھل گئے۔

”تُو............ تُو............ تو یہاں کیوں آ گئی؟ ایک بات بتا۔“

”جی ابو۔“

”دروازہ کھولنے تُو گئی تھی؟“

”ہاں۔“

”کیوں گئی تھی بے وقوف؟ ہر آواز پر دروازہ کھولنے چلی جاتی ہے۔ جب میں گھر میں موجود تھا تو تُو کیوں گئی تھی؟ نوکر بھی موجود تھا۔ جانتی نہیں ہے۔ کیا کرے گی تُو آخر؟ کیسے گزر کروں گا میں اس گھر میں۔“

میں خاموشی سے گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے والد مجھ پر کیوں بگڑ رہے ہیں۔ بہت دیر تک وہ اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔

”کیا باتیں کر رہے تھے وہ تجھ سے؟“

"بس۔ پوچھ رہے تھے مجھ سے میرے بارے میں کہ میں کون ہوں۔ میرے کتنے بہن بھائی وغیرہ ہیں۔"

"تجھے اس کے سامنے نہیں جانا چاہیے تھا۔ تجھے اس کے سامنے کسی قیمت پر نہیں جانا چاہیے تھا۔"

اور نہ جانے کیوں میرے دماغ میں ایک غصے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"میں حلوہ تو نہیں ہوں کہ کوئی مجھے کھا جائے گا۔"

"پاگل تو نہیں سمجھتی۔ تو نہیں سمجھتی بیٹا!"

"سب سمجھتی ہوں۔ آپ ایک بات کا اطمینان رکھیں میری طرف سے۔ ابو!" نادر علی چونک کر مجھے دیکھنے لگے پھر بولے۔

"کیا مطلب؟"

"میں آپ کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی لیکن اس بات کو ذہن میں رکھ لیجئے کہ کوئی میری عزت سے نہیں کھیل سکتا۔"

"آہ۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ خدا کرے۔"

بہرحال بات ختم ہو گئی۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کام پر حویلی چلے گئے۔ رات کے کوئی دس بجے کا وقت ہو گا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ ابو گھر میں موجود تھے۔ نہ جانے کیوں وہ ایک دم سہم سے گئے۔ بڑی مشکل سے وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور دروازے پر پہنچ گئے۔ پھر وہ کسی سے باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد ایک آدمی کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔

"سناؤ رحیم الدین خیریت سے تو ہو؟"

"آپ کے پاس آیا تھا نادر علی صاحب! آپ جانتے ہیں، میں شہر میں پولیس میں ملازم ہو گیا ہوں۔"

"ہاں بھائی! مٹھائی بھی کھا چکا ہوں تمہاری حوالداری کی۔"

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"خیریت۔ پولیس کو مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش آ گئی کیا؟"

"نہیں۔"

"ایک بات بتائیے کیا آپ نواب شیرا کے خلاف کوئی رپورٹ درج کراتے گئے تھے۔" میرے والد کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"جواب دیجئے اور جلدی دیجئے۔" رحیم الدین نے کہا۔

"ہاں گیا تھا۔"

"بہت ہی برا کیا آپ نے بہت ہی برا کیا۔ آپ نہیں جانتے" آپ نہیں جانتے نادر علی! یہ بڑے لوگ جو ہوتے ہیں نا۔ اتنے لمبے ہاتھ رکھتے ہیں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ نواب شیرا نے جو ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کیا لوگ اس کے بارے میں نہیں جانتے۔ آپ نے اپنے آپ کو برباد کر لیا نادر علی صاحب! بہرحال۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو رحیم الدین! وہ مجرم ہیں۔ میں تو جرم کی اطلاع دینے گیا تھا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ آپ جانتے ہیں کہ برائی اگر غریب آدمی کرتا ہے تو وہ جرم بن جاتی ہے اور کوئی بڑا آدمی کرتا ہے تو وہ ایک پالیسی ہوتی ہے۔ اسے بہت بڑا کام کہا جاتا ہے۔"

"میں نے جو رپورٹ لکھوائی تھی' وہ کچھ اور تھی۔"

"جانتا ہوں.......... جانتا ہوں.......... اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہرحال اس سلسلے میں تحقیقات شروع ہو گئی ہیں لیکن نواب شیرا کے بارے میں نہیں بلکہ آپ کے بارے میں۔"

"میرے بارے میں؟" میرے والد نے حیرت سے کہا۔

"ہاں آپ کے بارے میں۔ آپ نے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ کل ان تمام لاشوں کا ذمے دار آپ کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری بات سن لیجئے۔ صبح صبح یہاں پولیس فورس پہنچنے والی ہے آپ کو گرفتار کرنے کے لئے' چنانچہ جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں سے فرار ہو جائیے۔ آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ لیکن آپ اپنی نیکیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو میں حق کی بات پر ڈٹا رہوں گا۔ ارے واہ اتنی ساری بچیوں کو زندگی سے اور عزت سے محروم کر دیا گیا۔ میں بھی بیٹیوں والا ہوں۔"

"آپ سوچ لیجئے۔ اگر آپ یہاں سے نہیں گئے تو بے وقوفی کریں گے۔ میں نے صرف پرانے تعلقات کی بناء پر اتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ خاموشی سے آیا ہوں اور خاموشی سے واپس چلا جاؤں گا۔ آپ کی اپنی مرضی ہے دیکھ لیجئے۔ میں چلتا ہوں کیونکہ خود میری زندگی کو بھی خطرہ پیش آ سکتا ہے۔"

رحیم الدین چلا گیا میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے ابو کا چہرہ دیکھا۔ جلدی

کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ میری ماں نے بھی یہ باتیں سن لی تھیں۔ بہرحال وہ آگے آئیں اور انہوں نے کہا۔

"سن لیا آپ نے' آپ کو آپ کی نیکیوں کا بہترین صلہ ملا ہے۔"

"دیکھو۔ میں خود بھی جانتا تھا کہ یہ سب کچھ کر کے میں اپنے لئے خطرہ مول لے رہا ہوں لیکن میں نے جو لاش ٹھکانے لگائی ہے' وہ چیخ چیخ کر مجھ سے یہ سوال کر رہی ہے کہ بتاؤ ضمیر فروشی اور کسے کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے میری تصویریں بھی بنالی ہیں لیکن جو کچھ بھی ہے میں اپنا راستہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"بچیوں کے باپ ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

"کچھ بھی ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ویسے اگر بچیوں کی بات کرتی ہو تو میرا خیال ہے۔ میں تمہارے لئے بندوبست کر دیتا ہوں۔ تم انہیں لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

"اور پھر تم؟"

"نہیں۔ میں میدان چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا۔ سنو' جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ تم ایسا کرو۔ ان بچیوں کو لے کر اپنے ماموں کے ہاں چلی جاؤ۔ میں تمہیں ابو کے ہاں بھیجنے کے لئے کہتا لیکن تمہارے ماموں زیادہ محفوظ ہیں۔ ان کے بارے میں بستی کے لوگ نہیں جانتے اور وہ ہیں بھی ذرا الگ تھلگ فاصلے پر' ٹھیک ہے؟"

بہرحال اس کے بعد ان لوگوں نے ہمیں میرا مطلب ہے میرے ابو نے ایک بیل گاڑی میں ہمیں وہاں سے روانہ کر دیا اور راتوں رات ہم بستی سے کافی دور نکل آئے۔ ادھر ابو کا معاملہ بڑی سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کے بارے میں ہمیں بعد میں ہی تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔

☆======☆=====☆

بے چارے نادر علی صاحب! شرافت کی آڑ میں جھلس گئے تھے۔ صبح کو توقع کے مطابق پولیس کی گاڑی دروازے پر آ کر رکی تھی اور ایک پولیس آفیسر نے فوراً ہی ابو کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں۔

"میرا جرم جناب؟"

"یہ بات تو تھانے چل کر ہی معلوم ہو گی تمہیں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ نواب صاحب کو میری گرفتاری کی اطلاع دے دی جائے۔"

"آپ آیئے۔ انہیں اطلاع دے دی جائے گی۔" پھر اس کے بعد ابو کو لاک اپ میں بند کر دیا گیا اور بعد میں تھانے دار نے انہیں بتایا کہ انہیں قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔

"قق.......... قتل۔"

"ہاں۔ تمہارے بارے میں سارے ثبوت مل چکے ہیں۔" پھر جو کچھ ابو کو سمجھایا گیا ابو اس سے ناواقف نہیں تھے۔ یہ وہی تصویریں تھیں جو اس وقت بنائی گئی تھیں۔ جب ابو لاش کو اپنے کندھے پر لے کر جا رہے تھے۔

"جی۔ کیا کہتے ہیں آپ ان تصویروں کے بارے میں؟"

"یہ لاش میں نے نواب شیرا کے کہنے پر ٹھکانے لگائی تھی۔"

"خوب۔ آپ نے نواب شیرا کے کہنے پر یہ سارا کام اتنی آسانی سے کر دیا۔ ویسے آپ کو شرم آنی چاہئے۔ آپ ایک درویش پر الزام لگا رہے ہیں۔" بہرحال پولیس آفیسر نے ابو سے اتنا کچھ کہا کہ ابو کی زبان بند ہو گئی۔ ابو کو باقاعدہ جیل میں پہنچا دیا گیا اور بستی کے لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ غرض یہ تمام کارروائی ہوتی رہی اور یہ سب کچھ جاری رہا۔ ہم لوگ ماما کے گھر میں قیدیوں کی سی حیثیت رکھتے تھے لیکن جب ساری تفصیلات سامنے آئیں تو ماما بھی بگڑ گئے۔

"وہ اتنا برا انسان تھا ہمیں پتا ہی نہیں تھا۔"

"وہ ایسے نہیں ہیں۔ ایسے نہیں ہیں وہ' آپ کیا کیا کہہ رہے ہیں۔" میری والدہ اپنے بھائی سے لڑ پڑیں۔

"ارے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ دنیا کہہ رہی ہے۔" بہرحال ہماری بربادی کا دور شروع ہو گیا تھا۔ میری والدہ بیمار ہو گئیں اور پھر وہ زندہ نہ رہ سکیں۔ ہمارے اوپر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ہمارا بھرا پُرا گھر ویران ہو گیا تھا۔ بہرحال پھر میرے ابو کو موت کی سزا سنا دی گئی۔ اب اس دنیا میں ہمارا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ ماما جی پر ہمارا بوجھ آ پڑا تھا۔ ہمارے گھر بار پر نواب شیرا نے قبضہ جما لیا تھا اور پھر ایک دن بستی ہی کا ایک آدمی جو ہمارا ہمدرد تھا' ہمارے پاس آیا اور اس نے آ کر ماما جی کو بتایا کہ نواب شیرا ان دونوں لڑکیوں کی تلاش میں ہے اور وہ یہاں پہنچنے والا ہے۔ بہرحال آپ دیکھ لیجئے جو کچھ کر سکتے ہیں' کریں۔ اطلاع دینے والا چلا گیا لیکن ماما جی کی حالت خراب تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں کیا کروں میری ہستی انتہائی کمزور تھی۔ میرے سامنے میری بہن کی زندگی بھی تھی۔ ماں رہی تھی۔

باپ ادھر ماما جی، سب پریشان تھے کہ کیا کریں ہمارے لئے۔ آخر کار ایک دن میں نے ان سے کہا۔

"ماما جی! میں آپ کو یہ بتاؤں کہ نواب شیرا یا اس کے آدمی آپ سے بات کریں تو آپ انہیں بتا دیجئے کہ ہم دونوں آپ کے پاس ہیں۔ اگر وہ مجھے حاصل کرنا چاہیں تو آپ منع نہ کریں۔ میری بہن تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

ماما جی چونک پڑے پھر آہستہ سے بولے۔ "نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آہ۔ میں کیا کروں! ایک طرف بہن کی نشانیاں ہیں اور ایک طرف شیطان۔ میرے حالات اتنے خراب ہیں۔ کیا کروں میں کیا کروں؟"

"جو کچھ میں کہہ رہی ہوں آپ وہی کریں۔"

"میرا دل نہیں مانتا۔ دیکھو اللہ کی کیا مرضی ہے۔" میں اپنے ذہن میں کچھ منصوبے بنا رہی تھی اور اس کے لئے میں نے آپ کو آہستہ آہستہ تیار کرلیا تھا میں اپنے ماں باپ کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ بہرحال اس کے لئے میں نے تیاریاں کی تھیں اور اس کے لئے ایک دوپہر کو کچھ افراد یہاں آ گئے۔ وہ ماما جی کے پاس پہنچے تھے اور انہیں ساتھ لے کر آئے تھے۔ ماما جی رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"بیٹا! میں کیا کروں وہ چاہتے ہیں کہ تم دونوں۔"

"دونوں کیا۔ میں چلی جاتی ہوں ماما جی۔ میں ان سے بات کئے لیتی ہوں۔" بہرحال میں نے ان لوگوں سے بات کی۔ ان سے بھی شاید یہی کہا گیا تھا کہ مجھے لے آیا جائے۔ چنانچہ میں وہاں سے چل پڑی لیکن جانے سے پہلے میں نے اپنے لباس میں ایک لمبا چاقو چھپا لیا تھا تاکہ یہ میری اپنی زندگی کو ختم کرسکے اور اگر ممکن ہو سکے تو نواب شیرا کو بھی۔ پھر مجھے نواب شیرا کے پاس پہنچایا گیا۔ نواب شیرا مخصوص حلئے میں ایک لمبی عبا پہنے ہوئے، سر پر پگڑی باندھے ہوئے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔

"دو تھیں، ایک لائے ہو۔"

"وہ آٹھ سال کی بچی ہے۔"

"ہاں ہاں بڑی ہو جائے گی تو آ جائے گی۔ کوئی بات نہیں، پلنے دو اسے، لیکن ایک بات کا خیال رکھنا جو اسے پال رہا ہے اس سے کہنا کہ اس کے پالنے کا خرچہ ہم دیں گے لیکن جانے نہ پائے کہیں۔"

"جی۔"

پھر اس نے میری جانب متوجہ ہو کر کہا۔ "ہاں لڑکی! تمہارے والد صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ ہمیں ان کی موت کا بہت افسوس ہے۔ سنا ہے، تمہاری والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو نواب شیرا بولا۔

"خیر ماں باپ کس کے سدا بیٹھے رہتے ہیں۔ جانا تو تھا ہی انہیں اس دنیا سے۔ تم بے فکر رہو، ویسے غلطی تمہارے باپ کی ہے۔ ہمارا کھاتا تھا ہمارے ہی خلاف کھڑا ہو گیا تھا۔ ہٹانا تو تھا ہی اسے، چلو خیر جاؤ۔ آرام سے رہو۔ تم رہا کرو۔ ابھی تو یہیں قیام کرو اور اس کے بعد ہم تمہارے لئے بہت اچھا بندوبست کر دیں گے۔ اور ایک بات سنو، جو ہمارے وفادار رہتے ہیں، زندہ بھی رہتے ہیں اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہاں جو ٹیڑھا ہوتا ہے اسے اسکرین سے ہٹانا ہی ہوتا ہے۔ تمہارے باپ کی طرح۔ کیا سمجھیں؟ اگر ہماری وفاداری میں رہیں تو جیتی بھی رہو گی اور عیش بھی کرو گی۔ ورنہ۔" وہ مکاری سے ہنسا بہرحال اس کی بعد مجھے اس حجرے کے نیچے بنے ہوئے تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ تہہ خانہ ایک عظیم الشان عیش گاہ تھی۔ موٹے موٹے قالین ریشمی پردے۔ پھل برتنوں میں سجے ہوئے تھے۔ حسین و جمیل مجسمے چاروں طرف رکھے ہوئے تھے۔ ایک بڑی سی مسہری ایک طرف رکھی ہوئی تھی جس پر موٹا سا گدا تھا۔ فانوس میں شمعیں روشن تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر دہشت سے سمٹ گئی۔ ویسے میری سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان لوگوں کی رسی اتنی دراز کیوں ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ بات ابو بتا چکے تھے کہ نواب شیرا صرف ایک نواب ہی نہیں ہے بلکہ باہر کی دنیا سے بھی خاص طور سے انڈر ورلڈ سے بھی اس کے گہرے مراسم ہیں۔ کسی خطرناک گروہ کا ایک فرد بھی ہے وہ۔ بہرحال پھر اس کے بعد میری بدبختی کا دور شروع ہو گیا۔ میرے لئے ایک خوبصورت لباس لایا گیا اور لانے والی دونوں عورتوں نے اسے پہننے کی ہدایت کی۔ بڑی مشکل سے میں واش روم میں جا کر اس لباس کو تبدیل کر سکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ لایا ہوا لمبا چاقو واش روم میں ایک بہترین جگہ چھپا دیا تھا۔ پھر رات کی تاریکیوں میں مجھے منحوس نواب شیرا کا سایہ نظر آیا۔ اس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔

"ہوں۔ بڑے بے وقوف تھے تمہارے والد جو انہوں نے تمہارے حسن سے فائدہ نہ اٹھایا۔ عزت آبرو کے ساتھ اگر تمہیں ہماری عیش گاہ میں پہنچ دیتے تو خود بھی عیش و آرام کی زندگی گزارتے اور تمہیں بھی ایک اچھی زندگی دے سکتے تھے۔ خیر کوئی بات

نہیں، یہاں رہو۔ تم دیکھو گی کہ یہ سب تمہارا حکم مانیں گے۔ کوئی بھی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔"

"میں بے سہارا ہو گئی ہوں نواب صاحب!"

"کیا بات کرتی ہو۔ ہم جو ہیں۔ ہمارے بارے میں تم کیا سوچتی ہو؟"

"یہی کہ آپ میرے باپ کی جگہ ہیں۔" میرے ان الفاظ پر وہ بری طرح اچھل پڑا۔

"ک.......... کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"سچ ہی تو ہے۔ آپ میرے باپ کی جگہ ہیں۔ میں آپ کو کسی بھی طرح اپنے باپ سے کم نہیں سمجھتی۔" میرے ان الفاظ پر نواب شیرا سخت برافروختہ ہو گیا اور کہنے لگا۔

"کتے کی بچی! میں کہاں سے تیرے باپ کے برابر ہو گیا۔ لعنت ہے تجھ پر، سارا موڈ خراب کر دیا۔" بہرحال اس کے بعد وہ وہاں سے نکل گیا تھا۔ دوسری شام ایک سوکھا سڑا آدمی میرے پاس پہنچا اور بڑے پیار سے مجھ سے بولا۔

"نادیہ ہے نا تمہارا نام بیٹا!"

"کون ہو تم؟"

"تیرا ہمدرد۔ ہم تیرے ہمدرد ہیں۔"

"کیا بات ہے، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"دیکھو بیٹا! انسان وقت کا غلام ہوتا ہے۔ تیرا باپ اس دنیا میں نہیں رہا۔ تُو اس دنیا میں اکیلی ہے۔ کیا تُو یہ نہیں چاہتی کہ تیری بہن آرام سے زندگی گزارے۔"

"مطلب کی بات کرو۔"

"صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں تجھ سے، نواب شیرا سے تعاون کر۔"

"ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں بولو۔"

"تمہاری کوئی بیٹی ہے؟"

"بیٹی۔ نہیں تو۔"

"تبھی تم یہاں یہ سب کچھ کرنے آئے ہو۔ چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔"

"تو سوچ لے اپنی تقدیر پر سیاہی مت پھیر۔"

"تو جاتا ہے یا جوتا اتاروں۔" میں نے کہا اور وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ پھر رات کو

ساڑھے دس بجے کے قریب پہلے دن کی مانند نواب شیرا میرے پاس نشے میں دھت پہنچا۔ میں نے پھر اسے وہی کہانی سنائی اور کہا کہ وہ میرے باپ کے برابر ہے تو وہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

"دیکھو لڑکی آج میں اپنے تمام احساسات شراب میں ڈبو کر آیا ہوں۔ کیا سمجھیں۔ اب اپنے آپ کو میرے حوالے کر دے ورنہ تیری لاش بھی تیرے باپ جیسا کوئی آدمی کسی ویرانے میں ٹھکانے لگا دے گا۔"

"نہیں میں مرنا نہیں چاہتی۔"

"ہاں یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ تیرے جینے کے دن ہیں۔ تُو یقیناً جینا چاہتی ہو گی لیکن جینے کے لئے کچھ کرنا ہوتا ہے۔ جا کپڑے بدل کے آ جا ہمارے پاس تو دیکھ کیا کرتے ہیں ہم تیرے لئے۔"

میں اپنا آخری عمل کرنے کے لئے واش روم میں داخل ہو گئی۔ میں نے وہ لمبا چاقو نکال لیا اور پھر نواب شیرا کے سامنے آ گئی۔ نواب شیرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور میں آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے مجھے اپنے سینے سے بھینچ لیا لیکن میرے ہاتھ پکڑا ہوا چاقو اپنے عمل کے لئے تیار تھا اور عقب سے میں نے اس کے دل کے مقام پر پورے کا پورا داخل کر دیا۔ نواب شیرا کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور وہ ایک دم سے پیچھے ہٹا۔ میں نے چاقو کھینچ کر اس بار سامنے سے اس کے دل میں پیوست کر دیا اور کئی وار اس پر کئے لیکن نہ جانے کہاں سے کم بخت کچھ افراد آ گئے اور انہوں نے پیچھے سے میرے اوپر وار کئے اور کچھ لمحوں کے بعد میری نگاہوں میں تاریکی چھا گئی۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ بہرحال نہ جانے کب ہوش آیا اور جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند پایا۔ خالی کمرہ تھا جس میں چاروں طرف ایک مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے سلاخوں والا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے گزرے ہوئے واقعات یاد آئے اور میں جلدی سے اچھل کر بیٹھ گئی۔ موٹی موٹی سلاخوں اور اس کے باہر پڑے ہوئے تالے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ میں کسی قید خانے میں قید ہوں۔ پتہ نہیں نواب شیرا کی کیا کیفیت ہوئی تھی۔ آہ۔ کاش کم از کم ایک بار میں اسے مردہ حالت میں دیکھ لیتی۔ آہستہ آہستہ میں اپنی جگہ سے اٹھی اور سلاخوں والے دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر کی سمت دیکھا تو ایک چوڑا سا کمرہ نظر آیا۔ جس کے دوسری طرف ایک دروازہ تھا۔

بہرحال مجھے آس پاس کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر کوئی چھ سات گھنٹے گزرے اور اس کے بعد میں نے چند افراد کو دیکھا جو میرے قریب آگئے تھے۔ انہوں نے سلاخ دار دروازے سے کھانے پینے کی کچھ اشیاء میری طرف سرکائیں اور کہا۔

"لو۔ تمہیں زندہ رہنا چاہئے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے' تمہیں اس کا صلہ بھگتنا پڑے گا۔"

"صرف ایک بات بتا دو۔ وہ شیطان مر گیا یا بچ گیا ہے۔"

لیکن مجھے کوئی جواب نہیں دیا گیا بہرحال وہ لوگ چلے گئے۔ مجھے زندہ رہنے کے لئے کھانا پینا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی لائی ہوئی چیزیں کھا لیں۔ نواب شیرا کے بارے میں مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کم بخت زندہ ہے یا مر گیا۔ ویسے میں نے اس پر وار تو بہت زیادہ کیے تھے لیکن اتنا میں جانتی تھی کہ یہ اناڑی کے وار تھے۔ آہ کاش! میرا کوئی وار کامیاب ہو گیا ہو۔ بہرحال پھر میں اس قید خانے میں وقت گزارنے لگی۔ دن رات' دن رات' صبح شام' اندھیرا اجالا۔ اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ مجھے یہاں کتنے دن ہو گئے۔ میری حالت جانوروں جیسی ہو گئی تھی۔ پھر ایک دن میری تقدیر میں کچھ روشن کرنیں نمودار ہوئیں۔ جو لوگ مجھے کھانا دینے آتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی اندر داخل ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھنے لگی۔ آج وہ کھانا دینے والی عورت کھانا دینے نہیں آئی تھی بلکہ دروازہ کھولنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

"چلو باہر نکلو۔" میں وحشت زدہ سی باہر نکل آئی۔ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کہاں لے جا رہے ہو مجھے تم لوگ؟"

"چل۔" ایک عورت نے میری کمر پر ایک لات رسید کی اور میں گرتے گرتے بچی۔ اس دوران میں کافی کمزور ہو گئی تھی۔ وہ لوگ مجھے لئے ہوئے پہلے اوپر اور پھر اس کے بعد ایک کمرے میں پہنچے۔ عورت نے غسل خانے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جاؤ۔ نہاؤ۔"

میری جو حالت ہو رہی تھی ان دنوں' وہ ایسی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ بہرحال میں غسل خانے میں داخل ہو کر نہانے لگی اور نہ جانے کتنے دن کی غلاظت میں نے اپنے بدن سے اتاری۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا لیکن وہ عورت اندر داخل ہوئی اور ایک لباس میرے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

"لو یہ کپڑے پہن لو۔" میں شدید حیران ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ دروازہ کھول کر کیسے اندر آگئی۔ بہرحال اس کے بعد میں باہر نکل آئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں پھر عورت نے کچھ دیر کے بعد مجھے ایک اور لباس دیا اور کہا۔

"یہ لباس پہن لو۔" میں نے اس لباس کو دیکھا۔ بہت باریک اور انتہائی شرمناک لباس تھا۔

"میں یہ نہیں پہنوں گی۔" میں نے کہا اور اس نے اتنے زور کا تھپڑ میرے منہ پر مارا کہ صحیح معنوں میں میری آنکھوں کے سامنے ستارے ناچ گئے۔ بہرحال کافی پٹائی کی اس نے میری اور آخر کار میں نے وہ لباس پہن لیا لیکن مجھے خود اپنے وجود کو دیکھ کر شرم آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی ایک احساس نے میرا خون خشک کر دیا تھا۔ اس کارروائی سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نواب شیرا زندہ ہے ورنہ اس طرح مجھے اور کس کے پاس لے جایا جاتا اور یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ پھر جس عظیم الشان کمرے میں مجھے پہنچایا گیا تھا۔ وہاں میری نگاہ اس شخص پر اٹھی جو سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میرا سارا خون رگوں میں جم گیا۔ اعصاب شل ہو گئے۔ وہ واقعی نواب شیرا ہی تھا اور مجھے بہتر حالت میں نظر آرہا تھا۔ وہ مجھے دیکھنے لگا اور پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی۔ دو خونخوار قسم کے آدمی اندر آگئے تھے۔ انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور میرا لباس میرے جسم سے جدا کر دیا۔ نواب شیرا دیر تک مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے ان دونوں کو اشارہ کیا اور وہ دونوں مجھ پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

☆------☆======☆

نادیہ کا سر جھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور غلام شیر غم زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اس کے بعد میری آنکھ ایک ہسپتال میں کھلی جہاں ایک نرس تیمار داری پر مامور تھی۔ بہرحال یہاں جو کچھ ہوا وہ میرے ذہن کے لئے بہت ہی دردناک داستان تھی۔ کہاں تک سنو گے غلام شیر۔ بس میں مرنا چاہتی تھی۔ نواب شیرا نے مجھ سے جو انتقام لیا تھا وہ بالکل الگ ہی تھا۔ اس نے میری بدترین توہین کی تھی۔ اسپتال میں' میں نے کئی بار خودکشی کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکی اور آخر کار ایک رات میں ہسپتال سے باہر نکل آئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آس پاس کیا ہے۔ ایک ویران سا علاقہ تھا کہیں

کہیں درخت نظر آرہے تھے۔ ان درختوں کے پس منظر میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں آگے بڑھتی رہی فاصلے پر ایک نشیب آیا اور میں اندھیرے میں اس میں اتر گئی۔ جیسے جیسے آگے بڑھتی جا رہی تھی علاقہ ویران ہوتا جا رہا تھا۔ میرے سامنے کوئی سڑک نہیں تھی بس جہاں تک نگاہ جاتی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جھونپڑیاں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور ستاروں کی مدھم چھاؤں میں کبھی کبھی مجھے قرب و جوار کا ماحول نظر آجاتا تھا جب بادل آسمان پر پھیلے ستاروں کو اپنی آغوش میں لے لیتے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے۔ پھر تھوڑے فاصلے پر مجھے ایک پگڈنڈی نظر آئی اور میں اس پر دوڑنے لگی۔ میں یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ بہت دیر تک میں دوڑتی رہی اور آخرکار ایک نہر کے پل کے پاس رکی۔ میں نے پل عبور کیا تقریباً ایک فرلانگ چلی تھی کہ درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ درخت آگے بڑھ کر بہت گنجان ہوتے جا رہے تھے اور ان کے درمیان شدید اندھیرا تھا لیکن میں ہر خوف سے بے نیاز آگے بڑھ رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں سفر کرتی رہی اور اس کے بعد بری طرح تھک کر ایک درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ہولناک آوازیں ابھر رہی تھیں۔ کبھی کبھی گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں اتنے قریب محسوس ہوتیں کہ لگتا وہ مجھے سونگھ رہے ہیں اور کبھی کسی درندے کی دھاڑ سنائی دیتی لیکن میں زندگی سے بیزار تھی۔ میرا پورا جسم پسینے سے تر تھا۔ بے بسی کے احساس نے میرے دل کو خوف کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ بالکل تنہا تھی میں اس کائنات میں اور پھر نہ جانے کیوں؟ میرے اندر سے ایک نئے وجود نے سر ابھارا۔ ساری جان آگ میں ڈوب گئی تھی۔ شاید تپش کا احساس ہو رہا تھا۔ نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ انسان ہوں میں۔ اس قدر بے بس نہیں ہوں جتنا خود کو سمجھ رہی ہوں۔ میں بہت دیر تک سوچتی رہی۔ خوف کا ہر احساس اب میرے دل سے نکل گیا تھا۔ جنگل میں گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں لیکن اب میرے دل میں خوف کا کوئی تصور نہیں تھا۔ میں اپنا آئندہ پروگرام مرتب کر رہی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب ان درندوں سے نمٹنے کے لئے مجھے خود بھی درندہ بننا پڑے گا۔ صبح کی روشنی طلوع ہوئی تو درحقیقت میں ایک نئی ہی شخصیت بن چکی تھی۔ دفعتاً مجھے قرب و جوار میں کسی مشین کی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ غالباً کوئی کار اس طرف آ رہی تھی لیکن جنگل میں کسی کار کی آمد کیا معنی رکھتی ہے۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد یہ آواز مجھے پھر اسی طرح سنائی دی اور میں سوچنے لگی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر

دیکھا تو مجھے اپنے بائیں جانب درختوں کا سلسلہ ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اسی سمت جانے کا فیصلہ کیا اور آخرکار اس سمت چل پڑی۔ کافی دور جانے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور یہاں کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں ایک ٹریکٹر تھا جو مٹی ہموار کر رہا تھا۔ ایک درمیانی عمر کا آدمی اسے چلا رہا تھا۔ وہ جدید لباس میں ملبوس تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں سرخ و سفید چہرہ۔ میں ایک طرف جا کھڑی ہوئی اور اس بار جب وہ میرے قریب سے گزرا تو اس کی نگاہیں مجھ پر پڑیں وہ حیران رہ گیا تھا۔ پھر اس کی نگاہیں میرے پیروں پر پڑیں اور اس نے آہستہ سے کہا۔

”چھل پیری تو نہیں ہے تو؟“

میں آہستہ آہستہ اس کے بہت قریب پہنچ گئی۔ ”میں چھل پیری لگ رہی ہوں تمہیں؟“

”ارے نہیں نہیں' ڈر گیا تھا بس میں۔“

”میں ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں۔“

”کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔ کیا مشکل پیش آئی ہے تمہیں؟“

”بس۔ کیا کیا جا سکتا ہے کبھی کبھی مشکلات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ انسان خود بھی ان کا تعین نہیں کر پاتا۔“

”اوہو پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہو۔“

”کوئی خاص نہیں۔ بس یوں سمجھ لو مجھے پناہ درکار ہے۔“

”ہوں۔ میں کسان ہوں لیکن ایک تعلیم یافتہ کسان اور خود اپنی زمینوں کو اپنا خون پسینہ دے کر سیراب کرتا ہوں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”لمبی کہانی ہے میری مجھے پناہ درکار ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ کچھ دیر تک میری صورت دیکھتا رہا پھر بولا۔

”آؤ.......... میرے ساتھ۔“ وہ ٹریکٹر سے نیچے اتر آیا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ راستے میں اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ایک موڑ پر آ کر اس نے پگڈنڈی چھوڑ دی اور دائیں ہاتھ کی سمت چل دیا۔ اب ہم ایک کچے میدان میں چل رہے تھے۔ جہاں غالباً کچھ وقت پہلے بارش ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ میدان کے اس دوسرے سرے پر درختوں کے قریب نیم پختہ مکان کی چاردیواری

نظر آرہی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی اور اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ چند کمروں کے دروازے' برآمدوں میں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے لانے والے نے ایک کرسی بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہا۔

"تم اگر مجھے اپنا نام بتا دو تو زیادہ بہتر ہو گا تاکہ تمہیں مخاطب کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔"

"بدنصیبی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔"

"یعنی میں تمہیں بدنصیبی کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں۔"

"بڑا اچھا ہو گا۔"

"خیر اگر تم نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی۔ میں تمہیں بے لوث جذبے کے تحت یہاں لایا ہوں۔"

"نادیہ ہے میرا نام۔"

"ٹھیک تم غسل کر لو۔"

میں واقعی ضرورت محسوس کر رہی تھی چنانچہ میں غسل خانے میں داخل ہو گئی اور اس کے بعد نہا دھو کر فارغ ہوئی اور باہر نکل آئی۔

"بیٹھئے مس نادیہ۔"

"آپ کو دعائیں دینے کے علاوہ اور کیا دے سکتی ہوں؟"

"سنو۔ میں صرف دعاؤں کا قائل نہیں ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان اپنی کسی بھی بات کا صلہ چاہتا ہے۔" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ایک لمحے میں مجھے یوں لگا کہ میں ایک بار پھر غلط ہاتھوں میں آپڑی ہوں لیکن اب وہ خوف میرے دل سے نکل چکا تھا۔ میں دنیا کی ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھی۔ وہ ہنسنے لگا پھر بولا۔

"جو کچھ سوچ رہی ہو مجھے اس کا اندازہ ہے لیکن اب ایک بات بتاؤں۔ بس شرارت کی عادت ہے میری۔ برا انسان نہیں ہوں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا میری ذات سے۔ اس گھر میں اکیلا رہتا ہوں شہر میں تعلیم حاصل کی ہے۔ شادی بیاہ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑا۔ یہ گھر میرا آبائی گھر ہے۔ میرے گھر والے یہاں نہیں رہتے۔ میرے بھائیوں نے شادیاں کی ہیں اور ان کے خوب بیوی بچے ہیں۔ وہ سب الگ رہتے ہیں اور میں یہاں زمین کے اس ٹکڑے کو گلزار بنانے میں مصروف ہوں۔ میرا نام اجمل ہے اور بس اس کے علاوہ اور کوئی کہانی نہیں ہے۔"

"میں تمہیں دعائیں ہی دے سکتی ہوں۔"

"اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گی؟"

"بس مشکلات کا شکار ہوں۔ کسی ظالم درندے کی بھینٹ چڑھ گئی ہوں اور اپنی زندگی کو کسی راستے پر لانے کی فکر میں ہوں۔"

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتا دینا۔ تمہارے لئے کچھ کر کے مجھے اچھا لگے گا۔"

مجھے ایک کمرہ آرام کے لئے دے دیا گیا اور جب تمام معاملات سے فرصت ملی تو میں نے نواب شیرا کے بارے میں سوچا۔ نواب شیرا نے مجھے وحشی کتوں کے حوالے کر دیا تھا اور اس کے بعد مجھے ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ مارنا ہوتا تو وہیں کہیں آرام سے مجھے ہلاک کر دیتا۔ بہرحال اب میری اپنی ذات باقی نہیں رہ گئی تھی۔ خوف ختم کر دیا تھا میں نے اپنے دل سے اور اس دنیا سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انسانوں کے بارے میں اب میرے دل میں یہ تصور پیدا ہو گیا تھا کہ وہ صرف اور صرف بھیڑیئے ہیں اور ان بھیڑیوں سے لڑتے رہنا ہی زندگی کی علامت ہو گا ورنہ خود مرنا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو اس کے لئے پوری طرح تیار کر لیا تھا۔

☆======☆======☆

اجمل نے ابتدائی کچھ دن تو بڑے سکون کے ساتھ گزارے لیکن ایک رات وہی احساس میری آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو گیا کہ اس دنیا میں درندے بہت زیادہ ہیں اور انسان نہ ہونے کے برابر۔ اس دوران میرے لئے بہت سی آسائشیں فراہم کر دی گئی تھیں۔ اجمل کے چہرے کی کیفیت دوسری تھی۔ کبھی مجھے وہ ایک اچھا خاصا انسان نظر آتا تھا اور کبھی کبھی مجھے اس کی آنکھوں میں بھی وہی وحشت نظر آتی تھی جو بھیڑیوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ میں خود بھی سوچ رہی تھی کہ یہاں آنے کے بعد میں آخر اس کے گھر میں کیوں پڑی ہوئی ہوں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ باہر کی دنیا میں مجھے اپنا مقام تلاش کرنا چاہئے۔ اس بات کا مجھے علم ہو چکا تھا کہ نواب شیرا زندہ ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو پھر میرا انتقام بھی زندہ ہے لیکن اس دوران کچھ اور ہو گیا۔ اس وقت تقریباً رات ہو چلی تھی اور میں کھانا کھا کر لیٹ چکی تھی جب میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر پرسکون انداز میں دروازہ کھولا تھا لیکن آج اجمل کی کیفیت دیکھ کر مجھے ایک دم سے ایک عجیب سے سناٹے کا سا احساس ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور

آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ ایک لمحے کے اندر اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ میں نے اسے اندر آنے کے لئے راستہ دیا لیکن میرے وجود میں سناٹے آ گئے تھے۔ اجمل نے کہا۔

"ہوں۔ مس نادیہ! بلکہ آپ کو مس نادیہ نادر علی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔" اس کے منہ سے اپنے باپ کا نام سن کر مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے میرے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔ "ویسے مجھے حیرت ہے کہ ایک لڑکی ہونے کے باوجود آپ نے اتنے خوفناک آدمی سے ٹکر لی۔ نواب شیرا کوئی معمولی شخصیت تو نہیں ہے لیکن بہرحال بڑی بات ہے یہ اور ایسی بہادر لڑکیاں مجھے بے پناہ پسند ہیں۔ کیا سمجھیں؟"

"مگر تمہیں میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"اس لئے کہ اب تم میرے خوابوں کی تکمیل ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو میں نے تمہیں سہارا دیا۔ بہت برے حالات تھے تمہارے' اس کے باوجود میں نے تمہیں سہارا دیا۔ حالانکہ میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ تم اپنے دشمنوں سے چھپ کر یہاں تک پہنچی ہو لیکن یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ دشمن یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ البتہ اگر تم میری پناہ میں رہو تو کبھی کسی کو نہیں معلوم ہو گا کہ تم یہاں چھپی ہوئی ہو۔ میں تمہاری پوری پوری مدد کروں گا' تمہیں یہاں ہر طرح کی آسانیاں ملیں گی لیکن اس کے بدلے میں تمہیں اپنے آپ کو میرے حوالے کرنا ہو گا۔"

میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ "میں یہاں مستقل نہیں رہنا چاہتی اجمل! تم غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔ بہرحال میں ایک پامال ہستی ہوں۔ بہت برے حالات سے گزری ہوں میں۔ تم اگر میرے بارے میں اس انداز میں نہ سوچو تو میں تمہارا احسان مانوں گی۔"

"سنو۔ میں صرف تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم اچھائیوں کی طرف آ جاؤ؟ اس احساس کے ساتھ کہ تم نے کسی بے بس انسان کو سہارا دے کر اس کی زندگی کو برائیوں سے بچایا۔"

"دیکھو۔ میں ایک عام انسان ہوں۔ کوئی ولی یا درویش نہیں ہوں اور انسان ہی رہنا

چاہتا ہوں۔"

"تو پھر سنو۔ تم نے مجھے بے شک سہارا دے کر احسان کیا ہے لیکن وہ سب کچھ ممکن نہیں ہے۔ تم میرا پہلا شکار مت بنو۔ میں نے اپنے دل میں بھیڑیوں کا شکار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سمجھے؟"

"مطلب؟"

"مطلب۔" میں نے کہا اور گردن جھکا لی۔ کچھ لمحے خاموش کھڑی رہی اور اس دوران وہ آہستہ آہستہ میرے قریب پہنچا۔ اس نے میرے بازوؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ تبھی میں نے اپنے سر کی زوردار ٹکر اس کی ناک پر ماری اور اس کے حلق سے ایک مکروہ آواز نکل گئی۔ تب میں نے اپنی دونوں انگلیاں پوری قوت سے اس کی آنکھوں میں داخل کر دیں۔ پچاک کی ایک آواز ہوئی اور اس کی آنکھیں پھوٹ گئیں۔ وہ درندے کی طرح دہاڑنے لگا۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگیں ڈال کر اسے گرایا اور اس کی گردن دبانے لگی۔ میرے ہاتھوں کی انگلیوں میں نہ جانے اتنی قوت کس طرح پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے پوری قوت سے اس کی گردن پر دباؤ ڈالا اور اس کی زبان باہر نکل آئی۔ آنکھوں کی تکلیف نے ہی اسے تقریباً دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ مدافعت نہیں کر سکا اور کچھ لمحوں کے بعد اس نے دم توڑ دیا۔ پھر جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب اس کا تعلق دنیا سے نہیں ہے تو میں خاموشی سے وہاں سے باہر نکل آئی اور تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔ بستی کے دھندلے دھندلے مکان بہت دور نظر آ رہے تھے۔ میں نے وہ راستہ کاٹ دیا اور دوسری سمت چل پڑی۔ پھر تقریباً آدھی رات تک میں اس طرح سفر کرتی رہی۔ رات کے ہولناک سناٹوں میں مجھے کبھی کسی دور میں خوف محسوس ہوتا تھا لیکن آج میں ہر خوف سے عاری ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دھندلا دھندلا چاند نکل آیا۔ بادلوں نے آسمان پر بسیرا کیا ہوا تھا اور چاندنی مدھم نظر آ رہی تھی۔ میرے قرب و جوار میں کھیت ہی کھیت بکھرے ہوئے تھے۔ بہت طویل سفر کے بعد مجھے ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ مگر میں اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ پھر نہ جانے کب تک میں سفر کرتی رہی اور پھر کچھ فاصلے پر مجھے ریلوے لائن چمکتی ہوئی نظر آئی اور میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہو گیا۔ میں کوئی ایسی منزل تلاش کروں جو مجھے تھوڑا سا سکون دے سکے۔ میں وہاں رک کر اپنے آئندہ کے عمل کے بارے میں کوئی مناسب فیصلہ کر سکوں۔ یقیناً میں کوئی مناسب فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ بہرحال میں فاصلہ طے کر کے ریلوے لائن پر پہنچ گئی اور پھر ایک لمبا سفر

طے کر کے آخر کار ریلوے اسٹیشن۔

یہاں سے میری زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔ ٹرین آئی تھی اور میں ایک ڈبے میں چڑھ گئی تھی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ ٹرین کہاں جا رہی ہے۔ کہاں جائے گی۔ ڈبہ بھی فرسٹ کلاس تھا۔ بہت کم مسافر اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے قریب ہی بھاری بدن کی ایک عورت موجود تھی۔ اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"بیٹی! میرے پاس آجاؤ۔ آجاؤ۔ مجھے تم چہرے سے کافی پریشان لگتی ہو۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔"

"آجاؤ بیٹا ضد مت کرو۔" میں اٹھ کر اس عورت کے پاس جا بیٹھی۔ عورت کافی مشفق اور مہربان معلوم ہو رہی تھی۔ مجھ سے میرے بارے میں سوالات کرتی رہی اور میں نے اسے الٹے سیدھے جواب دیئے۔ بہرحال سفر میں اس نے میری کافی خاطر مدارت کی اور پھر ہم ٹرین کی آخری منزل تک پہنچ گئے۔ میں نے چونکہ عورت کو الٹے سیدھے جواب دیئے تھے اس لئے چلتے وقت اس نے مجھ سے میرا پتہ معلوم کیا۔ یہاں بھی میں نے اسے ٹیڑھا میڑھا جواب دے دیا تھا۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ ابھی میں ریلوے پلیٹ فارم پر ہی تھی کہ دفعتاً میں نے چند سادہ لباس افراد کو پولیس کے چند وردی پوش افراد کے ساتھ اس عورت کی جانب جھپٹتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گئی۔ ان کے ساتھ لیڈیز پولیس بھی تھی۔ وہ عورت کو لے کر ریلوے ہاؤس کے کسی کمرے میں داخل ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ سارا سلسلہ کیا ہے۔ بہرحال میں آگے بڑھی اور ریلوے پلیٹ فارم سے باہر نکل آئی۔ اب میں ذرا حیران پریشان تھی اور سوچ رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میری چھوٹی بہن ماماجی کے پاس تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ میں کیوں نہ ماماجی کے پاس چلی جاؤں لیکن میں یہ بات جانتی تھی کہ وہ جگہ نواب شیرا کے علم میں ہے۔ وہ ضرور مجھے وہاں تلاش کرے گا اور پھر وہاں جانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں تو نواب شیرا کے ساتھ کچھ اور ہی کھیل کھیلنا چاہتی تھی' اپنی بربادی کا انتقام لینا چاہتی تھی میں۔ غرض یہ کہ میں وہاں سے آگے چلتی رہی اور پھر ہمت کر کے میں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل کا رخ کیا اور یہاں آ کر ایک کمرہ حاصل کر لیا۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ تھوڑی سی رقم میرے پاس موجود تھی جو میں چلتے وقت اجمل کے گھر سے اٹھا لائی تھی۔ اس سے میں نے ہوٹل کے کمرے کا بل ادا کیا تھا۔ تقریباً بارہ گھنٹے گزر چکے تھے ہوٹل کے اس کمرے میں آئے

ہوئے اور میں اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلے کر رہی تھی۔ دل نے بہت سی باتیں بتائی تھیں مجھے' میں نے سوچا تھا کہ اب میں کوئی آبرو والی لڑکی تو ہوں نہیں۔ میرا وجود ٹوٹ چکا ہے' میری شخصیت تو قتل ہو چکی ہے۔ چنانچہ زندگی گزارنے کے لئے اگر کوئی راستہ مجھے مل جاتا ہے تو میں اس سے گریز نہیں کروں گی۔ چنانچہ اپنے اس فیصلے کے تحت میں نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا کہ بارہ گھنٹے کے بعد میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ وہی عورت جسے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا تھا' ایک مرد کے ساتھ میرے سامنے موجود تھی۔ اس نے مسکرا کر گردن خم کی اور بولی۔ "تمہیں حیرانی تو ہو گی لیکن حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اندر آسکتی ہوں؟"

"آیئے۔" میں نے اس خیال کے تحت کہا کہ اس عورت نے میری ریل کے ڈبے میں خاطر مدارت کی تھی۔ مرد بھی اس کے ساتھ اندر آگیا تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی عورت نے کہا۔

"ان لوگوں نے مجھے گرفتار کر لیا تھا۔ اصل میں میرے پاس ایک ایسی چھوٹی سی دستاویز تھی جس کی تلاش حکومت کو ہے اور وہ دستاویز ریل میں' میں نے تمہارے لباس میں چھپا دی تھی۔ کیا تم اس سے واقف ہو چکی ہو؟"

"م.......... میرے لباس میں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ ایک منٹ۔" وہ بولی اور اس نے میرے لباس کے ایک حصے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا تصویر نما چوکور بکس نکال لیا اور اسے چاروں طرف سے دیکھنے لگی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بکس کو دیکھ رہی تھی۔ بہت چھوٹا سا تھا۔ اتنا ہلکا ہو گا کہ مجھے اس کے وجود کا احساس نہیں ہو سکا لیکن اس نے یہ حیران کن عمل کر ڈالا تھا۔ عورت اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمہارا بہت شکریہ۔ بڑی مدد کی ہے تم نے میری۔ یہ ایک بہت قیمتی دستاویز ہے جو کچھ بڑے لوگوں کی ملکیت ہے اور مجھے یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ میں اسے ان تک پہنچا دوں۔ پتہ نہیں کس نے مخبری کر دی راستے میں۔ مجھے علم ہو چکا تھا۔ یہ میرا ساتھی ہے۔ شاید یاد ہو تمہیں ریلوے کے ڈبے میں میرے ساتھ سفر کر رہا تھا لیکن یہ مجھ سے الگ تھا۔ جب مجھے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا تو اسے پتہ تھا کہ میں تو چھوٹ ہی جاؤں گی کیونکہ دستاویزات میرے پاس سے نہیں برآمد ہوں گی۔ اس لئے اس نے تمہارا

تعاقب کیا اور اس ہوٹل تک پہنچ گیا۔ یہ معلومات کرنے کے بعد کہ تم کہاں ہو' وہ یہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ ظاہر ہے کہ مجھے پولیس کو چھوڑنا ہی پڑا کیونکہ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ سمجھ گئیں نا تم کہ ہم اس طرح تمہارے پاس آ گئے۔ ویسے لڑکی تم نے میرے اوپر جو احسان کیا ہے' میں تمہیں اس کا صلہ نہیں دے سکتی۔ اگر تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ تو میں ایک کام کر سکتی ہوں۔"

"کیا؟" میں نے پہلی بار سوال کیا۔

"میرا تعلق ایک گروہ سے ہے۔ ہم لوگ ایسے کارکنوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو ہمارے لئے کام کر سکیں۔ تم اگر چاہو تو ہمارے گروہ میں شامل ہو سکتی ہو۔ یوں سمجھ لو کہ زندگی کی ہر آسائش تمہارے قدموں میں ہوگی۔ برا مت ماننا لڑکی۔ ٹرین میں تم نے مجھے جو حالات بتائے ان سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ معافی مانگ چکی ہوں تم سے اپنے ان الفاظ کے بارے میں۔ مجھے یہ پتہ چل گیا کہ تم کسی مشکل کا شکار ہو۔ تجربہ ہے میرا اس زندگی کا' تم خود سوچ سکتی ہو۔ میری آفر ہے تمہیں۔ ہم لوگ تمہیں ٹریننگ دیں گے۔ اپنے کام کے لئے تیار کر لیں گے اور تمہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

ایک لمحے کے اندر اندر فیصلہ کرنا تھا۔ میں تو آنا ہی برائی کے راستوں پر چاہتی تھی چنانچہ میں نے اس عورت سے اقرار کر لیا کہ اس کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں اور بس غلام شیر' پھر اس کے بعد میرے حالات سنبھلتے چلے گئے۔ اس گروہ کے لئے میں نے چھوٹے چھوٹے کام سرانجام دیئے۔ یہ بہت ہی خطرناک گروہ تھا۔ قتل و غارت گری بھی کر لیتا تھا۔ اسمگلنگ دہشت گری سب کچھ کرتا تھا یہ۔ میں نے خیر اس کے بعد ایسا تو کوئی عمل نہیں کیا لیکن ایک بار لطف آ گیا۔ اس سے میرا مطلب ہے اس گروہ کے اس انچارج نے جس سے میرا تعلق تھا مجھے کچھ سامان دے کر ایک جگہ بھیجا اور یہ جگہ جانتے ہو کون سی تھی؟ یہ نواب شیرا کا گھر تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ نواب شیرا کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔ وہ اسمگلنگ بھی کرتا تھا۔ ڈاکے بھی ڈلواتا تھا۔ ہر کام کیا کرتا تھا وہ۔ میں بالکل بدلے ہوئے روپ میں جو انتہائی جدید اور خوبصورت تھا' وہاں پہنچی اور جب میں نواب شیرا کے سامنے گئی۔ تو وہ بری طرح اچھل پڑا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے مجھ سے کہا۔

"تم.......... تم کیا نام ہے تمہارا؟"

"ڈنیسا۔ کیا تمہیں میرے بارے میں اطلاع نہیں دی گئی تھی؟"

"ڈنیسا کے بارے میں تو اطلاع دی گئی تھی لیکن نواب شیرا کے بارے میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کی آنکھوں میں کوئی خاص قوت پوشیدہ ہے۔ یعنی وہ کسی کو ایک بار دیکھ لیتا ہے تو اس کی تصویر اس کی آنکھوں میں نقش ہو جاتی ہے۔ سانپ کی آنکھوں کی طرح ڈنیسا! تم ڈنیسا نہیں ہو۔"

"مسٹر نواب شیرا! آپ جیسے لوگ مجھ سے بہت ملتے رہتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھیے۔ وکٹر نے مجھے آپ کے پاس جس کام سے بھیجا ہے۔ اس کی تکمیل کریں' کیوں اپنے اور میرے لئے مشکلات پیدا کرتے ہیں؟"

نواب شیرا ہنس پڑا پھر بولا۔ "لڑکی اب تو پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو گئی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ نادیہ نے ڈنیسا تک کا سفر کس طرح طے کیا لیکن میں تمہیں بھول نہیں سکتا۔"

میرے ذہن میں ایک دم ایک خیال جاگا میں نے کہا۔ "مسٹر نواب شیرا۔ اگر دل میں کوئی اور خیال پیدا ہوا ہے تو کھل کر کیوں نہیں کہتے۔ یہ بے وقوفی کے راستے مجھے پسند نہیں ہیں۔"

نواب شیرا ہنسنے لگا پھر بولا۔ "سمجھدار لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ ڈیئر ڈنیسا! چلو ٹھیک ہے آج رات تو تم میری مہمان بھی ہو۔"

"ہاں کیوں نہیں لیکن فضول باتوں کے ساتھ نہیں۔ میرا اپنا نام ڈنیسا ہے مجھے ڈنیسا کی حقیقت سے قبول کرو اور کوئی احمقانہ بات نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" میں نواب شیرا کے حجرے میں ہی مقیم تھی اور یہ حجرہ انڈر گراؤنڈ ایک حسین عیش گاہ تھی۔ اس نے مجھے وہیں پہنچا دیا۔ میں نے اسے اشارہ دے دیا تھا کہ میں اس کی ہر خواہش کی تکمیل کرنے کو تیار ہوں لیکن میں سوچ رہی تھی کہ تقدیر نے مجھے ایک سنہری موقع دیا ہے۔ تو کیوں نہ میں اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ ہاں ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ جب گروہ میں شامل ہونے کے بعد میری مالی حالت بہتر ہوئی تو میں نے خفیہ طریقے سے ماما کو ایک بہت بڑی رقم بھیجی۔ اپنی بہن کی پرورش کے لئے چنانچہ یہ سارا کام اس طرح سے جاری رہا۔ میں بہرحال نواب شیرا کے اس قہوہ خانے میں اس کا انتظار کرتی رہی اور آخر کار وہ اندر آ گیا۔ میں نے ایک باریک سا لباس پہن لیا تھا اور اس سے میرا پورا بدن جھلک رہا تھا۔ اس چیز نے نواب شیرا کو حوصلہ دیا۔

وہ میرے قریب آکر بیٹھ گیا پھر بولا۔

"تم واقعی اگر نادیہ نہیں ہو تو اس کا دوسرا روپ ہو۔ کہیں تم اس کی چھوٹی بہن تو نہیں ہو۔" میں ہنسنے لگی پھر میں نے کہا۔ "دیکھو میں نے پہلے بھی تم سے یہ کہا تھا کہ فضول باتیں نہیں۔ ہم جدید دنیا کے لوگ ہیں۔ فضول باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ کیا سمجھے؟"

"ہوں' ٹھیک ہے۔ مجھے پھل کھانے سے غرض ہے' پیڑ نہیں گننا چاہتا۔"

وہ آگے بڑھا لیکن اس کی ہر جنبش اسے اس کی موت کی جانب لا رہی تھی۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے مجھے اپنی ہوس کی باہوں میں لپیٹنا چاہا تو میرے انگوٹھے کے ناخن اس کے حلقوم پر جم گئے اور اب میں اس قدر طاقتور ہو چکی تھی کہ اپنے مدمقابل کو بہ آسانی زندگی سے دور کر سکتی تھی۔ نواب شیرا کے حلقوم میں انگلیاں داخل کرتے ہوئے میں نے غرا کر کہا۔

"ہاں نواب شیرا۔ میں نادیہ ہی ہوں۔ میں وہی ہوں جس کے ہاتھوں تو پہلی بار بچ گیا تھا لیکن اس وقت ان ہاتھوں میں یہ قوت' یہ صلاحیت نہیں تھی اور آج' آج تو ان ہاتھوں کی طاقت دیکھ رہا ہے۔"

نواب شیرا کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی اور آخر کار اس نے دم توڑ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری زندگی پر سے سب سے بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں کھڑے ہو کر اس کی لاش کو گھورتی رہی۔ پھر میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

"تیرے جیسے کتے جب مرتے ہیں تو صحیح معنوں میں کتوں کی موت بھی تجھ سے بہتر ہوتی ہو گی۔ تو تو.......... ایک.......... تو ایک.........." میں جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ پھر اس کے بعد میرے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں وہاں سے نکل آؤں۔ چونکہ میں نواب شیرا کی ایک معزز مہمان تھی' اس لئے مجھے باہر نکلنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور میں بڑے پرسکون انداز میں وہاں سے باہر نکل آئی۔ باہر نکلنے کے بعد میں نے جس تیز رفتاری سے آگے کا سفر کیا' وہ قابل دید تھا۔ میں ایک بار پھر دور نکل آئی لیکن اب .... اب میرے دل میں یہ تصور موجود تھا کہ میں واپس اس گروہ میں نہ جاؤں۔ ظاہر ہے میرے ساتھ اچھا سلوک نہ ہوتا۔ نواب شیرا اس گروہ کا ایک معزز رکن تھا۔ چنانچہ میں چلتی رہی۔ تقدیر میری رہنمائی کرنا چاہتی تھی۔ میرا دل آبادیوں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے دو دو وقت کے فاقے کرنے پڑتے۔ کبھی کچھ کھانے کو مل جاتا۔ تنہا جنگلوں اور ویرانوں میں ایک نوجوان لڑکی بھٹک رہی تھی لیکن میں اندر سے کیا تھی یہ

میرا دل ہی جانتا تھا۔ نواب شیرا کو قتل کرنے کے بعد میری ساری ہمت دم توڑ چکی تھی۔ اب کوئی سہارا کوئی ٹھکانہ چاہتی تھی۔ چاہے وہ موت کا ہی ٹھکانہ کیوں نہ ہو اور پھر ایک رات میں ایک ویران سی جگہ وقت گزار رہی تھی کہ بہت دور مجھے ایک روشنی نظر آئی۔ آہ۔ یہ روشنی میری تقدیر کی وہ روشنی تھی جو مجھے دوبارہ زندگی کی جانب لانا چاہتی تھی اور یہاں ایک کٹیا میں بابا صاحب موجود تھے۔ روشنی کا سہارا لے کر میں یہاں تک پہنچی تھی اور بابا صاحب نے مجھے سہارا دیا۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے۔ بڑے اعلیٰ پائے کے انسان تھے وہ۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں زندگی بسر کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ مجھے ان کے بارے میں تمام تفصیلات معلوم ہوئیں اور مجھے اس بات کا علم ہو گیا کہ وہ بہت ہی عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ بس یہاں تک ہے میری کہانی۔ غلام شیر میں نے بھی تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم نے سب کچھ سن لیا ہے۔ مجھے دھتکار دو۔ تھوک دو میرے اوپر۔ بتا دو مجھے کسی سے محبت کرنے کا بھلا کیا حق ہے۔ میں تو ایک بے آبرو لڑکی ہوں۔"

وہ زار و قطار رونے لگی تو غلام شیر کے انداز میں بڑی ہمدردی اور بڑی محبت پیدا ہو گئی۔

"تم سے کس نے کہہ دیا نادیہ کہ تم آبرو باختہ لڑکی ہو۔ تم تو فرشتہ صفت ہو۔ انسان کے ساتھ بڑے بڑے بدنما حادثے ہو جاتے ہیں لیکن ان کے بدلے میں ہم زندگی یوں نہیں کھو دیتے۔ اب مجھے دیکھو بے جسم پھر رہا ہوں۔ کیا ہے میری زندگی مگر یقین کرو زندہ رہنا چاہتا ہوں اور اب تو.......... اب تو تمہارے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

نادیہ خاموش نگاہوں سے غلام شیر کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "غلام شیر! میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ بابا صاحب بہت گہرے انسان ہیں۔ وہ جو کچھ سوچتے ہیں کسی کو بتاتے نہیں ہیں۔ بلکہ وقت خود اسے بتاتا ہے۔ اب تم مجھے دیکھو کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ میں ایک جیتا جاگتا وجود ہونے کے باوجود تمہیں کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ یا میں خود دوسروں کی نگاہوں سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی ہوں؟"

"ارے ہاں! یہ تو سوچنے کی بات ہے واقعی.......... اف میرے خدا! کیسی عجیب بات ہے میں نے آج تک اس بارے میں نہیں سوچا۔"

"اصل میں بات یہ ہے غلام شیر کہ بابا صاحب نے مجھے اپنے کچھ علوم سے آراستہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھے کچھ پراسرار قوتیں عطا کی ہیں جن کی وجہ سے میں بہت کچھ دیکھ سکتی ہوں اور پھر تم تو ایک زندہ انسان ہو۔ کوئی روح نہیں ہو تم۔ تم سے تو صرف تمہارا

جسم چھین لیا گیا ہے۔ سنو۔ ہمیں کوئی طریقہ کار طے کر لینا چاہئے۔ کوئی ایسا منصوبہ بنانا چاہئے جس سے ہم ہیرا اچھوت کو تلاش کر سکیں۔ کوئی ایسا ہی طریقہ ہمیں سوچنا ہوگا۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ہم کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں۔"

"مگر کیا.........؟"

"اچھا ایک بات بتاؤ! تمہاری زندگی کا مقصد صرف یہ ہے تاکہ تم اپنا جسم حاصل کر سکو؟"

غلام شیر عجیب سے انداز میں نادیہ کو دیکھنے لگا پھر بولا۔ "ہاں۔ پہلے میری زندگی کا مقصد صرف یہی تھا۔"

"اور اب؟"

"نادیہ! اب تم بھی تو میری زندگی کا مقصد ہو۔ مگر ظاہر ہے ایسے تو نہیں۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا ہمیں۔"

"ہاں۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں سوچنا پڑے گا۔ خاص طور سے سوچنا پڑے گا۔" نادیہ نے کہا اور غلام شیر اور نادیہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

☆======☆======☆

زندگی ان لوگوں کے لئے کوئی مشکل نہیں تھی۔۔ دو محبت بھرے دل ایک دوسرے کے ساتھ گزار رہے تھے۔ نادیہ ان دنوں گہری سوچ میں ڈوبی رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے کہا۔

"میں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے غلام شیر!"

غلام شیر اچھل پڑا۔ اس دوران وہ نادیہ کی ذہانت کا دل سے قائل ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "کیا نادیہ؟"

"تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں باقاعدہ ایک جرائم پیشہ گروہ میں رہ چکی ہوں۔ ایسے گُر مجھے آتے ہیں جو ہمارے کام کے لئے بہترین ہوں۔"

"کوئی گُر آیا ہے تمہارے ذہن میں؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

"سب سے پہلے ہمیں شہری آبادی میں جا کر ایک پناہ گاہ حاصل کرنا ہوگی۔"

"پھر؟"

"اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اصل میں مجھے ایک آسانی حاصل ہے کہ میری آواز سنی جا سکتی ہے۔ جب کہ تمہیں یہ دقت ہے۔"

"ہاں بے شک۔"

"تو چلو۔ چلتے ہیں۔"

اور اس کے بعد ان لوگوں نے وہاں سے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ وہ شہر معمولی نہیں تھا بلکہ ملک کا دارالحکومت تھا جہاں انہوں نے قیام کیا تھا۔ نادیہ نے ٹیلی فون پر ایک پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ قائم کیا۔ اس کا نمبر ان لوگوں نے بازار میں چلتے ہوئے دیکھا تھا اور نوٹ کر لیا تھا۔ ٹیلی فون بھی ایک ایسی جگہ سے کیا گیا تھا جو پبلک کال بوتھ تھی اور قرب وجوار میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ نادیہ کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ریسیور کان سے لگا کر اس نے پراپرٹی ڈیلر سے کہا۔

"ہیلو......... میں تم سے اپنا تعارف نہیں کرا سکتی۔ مجھے ایک کرائے کا مکان چاہئے۔ تم رقم جتنی مانگو گے ادا کر دی جائے گی۔ مکان خوبصورت ہونا چاہئے اور کسی اچھے علاقے میں ہو۔"

"مگر آپ ہیں کون؟" پراپرٹی ڈیلر نے سوال کیا۔

"یہ نہ پوچھنے کے تمہیں ایک لاکھ روپے دیئے جا سکتے ہیں۔" ٹیلی فون کا ریسیور گرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر ریسیور اٹھا کر کہا گیا تھا۔

"میڈم میں آپ سے کیسے مل سکتا ہوں؟"

"تم نہیں ملو گے۔ تمہیں رقم پہنچا دی جائے گی۔ اپنی دکان پر موجود رہو۔"

"جی میڈم!"

"اور تمہیں ایک وعدہ بھی کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا میڈم؟"

"یہی کہ رازداری سے کام لو گے۔"

"آپ صرف ایک بات بتا دیجئے۔ آپ کوئی جرائم پیشہ خاتون تو نہیں ہیں؟"

"بالکل نہیں۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے یا تمہیں کسی ایسی بات کا علم ہو تو تم میرا کام بالکل مت کرنا۔"

"تو پھر ایک بہت ہی خوبصورت مکان میرے پاس موجود ہے۔ آپ آیئے۔"

"دیکھو۔ تم مجھے دیکھ نہیں سکو گے۔"

"جی؟"

"ہاں۔ تمہیں میری آمد کا پتہ اس وقت چلے گا جب نوٹوں کی گڈیاں تمہاری میز پر ہوں گی۔"

"جی............ جی۔" پراپرٹی ڈیلر کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔

"تو پھر میں آ رہی ہوں۔"

"جی میڈم۔"

اور نادیہ نے غلام شیر کو اشارہ کیا۔ نوٹوں کی گڈیاں حاصل کرنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پراپرٹی ڈیلر کی دکان میں پہنچنے کے بعد نادیہ اور غلام شیر اندر داخل ہو گئے۔ پھر نادیہ نے میز پر ہزار ہزار روپے کے نوٹوں کی دو گڈیاں رکھیں تو پراپرٹی ڈیلر کا منہ دہشت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ نادیہ نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے ہی تم سے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ وعدے کے مطابق ان ایک لاکھ روپے کی گڈیوں میں سے ایک تمہاری ہے' دوسری مکان کے ایڈوانس کے لئے رکھ لو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ مکان اچھا ہے تو مجھے دکھاؤ۔ تمہارے پاس کار موجود ہے۔ باہر تمہاری ہی کار کھڑی ہوئی ہے نا؟"

"جی.......... میڈم۔"

"جاؤ۔ اس کا دروازہ کھولو اور پچھلے دروازے بھی کھول دو۔ میرے ساتھ میرا ساتھی بھی ہے۔ ہم دونوں تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

پراپرٹی ڈیلر کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی۔ نہ صرف نادیہ کو بلکہ غلام شیر کو بھی اس کی حالت پر ہنسی آ رہی تھی۔ بہرحال پراپرٹی ڈیلر باہر نکلا۔ کار کا دروازہ کھول کر اس نے پچھلے دروازے بھی کھول دیئے اور غلام شیر اور نادیہ اندر بیٹھ گئے۔ پراپرٹی ڈیلر نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار ایک خوبصورت سی عمارت کے سامنے رک گئی۔ چھوٹا سا حسین بنگلہ تھا۔ اس بنگلے میں داخل ہونے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو نادیہ نے کہا۔

"کیا یہی مکان ہے؟"

"جی۔ جی میڈم۔" وہ ان دونوں کو لے کر مکان میں داخل ہو گیا اور غلام شیر اور نادیہ کو یہ مکان بہت پسند آیا۔ نادیہ نے کہا۔

"مکان ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ کرائے وغیرہ کی تم کوئی پرواہ مت کرو۔ یہ

تمہاری تحویل میں ہے؟"

"جی۔ اس کے مالک نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں جسے چاہوں یہ مکان دے سکتا ہوں مگر.......... مگر میں ایک سوال کر سکتا ہوں آپ سے؟"

"بس اسی سوال کی رقم میں نے تمہیں ادا کی ہے۔ اس کے بارے میں تم کچھ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔"

"جی ٹھیک ہے۔" پراپرٹی ڈیلر نے کہا اور نادیہ نے کچھ اور رقم اسے دیتے ہوئے کہا۔

"ایک خاص بات سنو مسٹر پراپرٹی ڈیلر۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی حیدر شاہ۔"

"حیدر شاہ ہم ایک مشکل کا شکار ہیں اور اس مشکل کی وجہ سے ہمارے جسم غائب ہو گئے ہیں۔ یہ بات بے حد حیرت ناک ہو گی تمہارے لئے لیکن تمہیں جو ایک لاکھ روپے کی رقم ادا کی گئی ہے' تم خود سوچو اس دور میں اتنی بڑی رقم کمانا کتنا مشکل کام ہے"

"جانتا ہوں میڈم۔"

"اور یہ رقم تمہیں صرف اس لئے دی گئی ہے کہ تم راز' راز ہی رکھو گے۔"

"جی میڈم۔"

"جی میڈم کی بات نہیں ہے۔ اگر تم نے کبھی کسی کو ہمارے بارے میں بتایا تو سمجھ لو مشکل میں پڑ جاؤ گے اور تمہیں ایک پیشکش اور کی جاتی ہے۔"

"جی میڈم۔"

"تم ہمارے دوسرے کام بھی کرو۔ ہر کام کا معاوضہ تمہیں پانچ ہزار روپے کے حساب سے دیا جائے گا۔"

"مم.......... میڈم میں تو دکان بند کرنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ مجھے اپنے ہاں نوکر رکھ لیجئے۔"

"نہیں۔ تم آرام سے دکان پر رہو۔ دکان پر ٹیلی فون ہے' اس گھر میں ہے؟"

"جی میڈم ٹیلی فون ہے۔"

"بس ٹیلی فون پر تم سے رابطہ رہے گا۔ ہم چھوٹے موٹے چند کام تمہارے سپرد کر دیں گے اور تمہیں اس کا معاوضہ نقد ادا کر دیا جائے گا۔"

"میڈم میں آپ کا غلام ہوں۔"

"اچھا حیدر شاہ بس ذرا زبان بند رکھنا۔ پیٹ کو مضبوط رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بعد میں ہم خود تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے۔ اب تم ایسا کرو کہ آدمی لاؤ۔ یہاں کی پوری طرح صفائی کراؤ۔ یہاں کے کچن کو کھانے پینے کی اشیاء سے بھر دو اور ضرورت کی ساری چیزیں پوری کر دو۔ میرا خیال ہے ویسے بھی یہ مکان فرنشڈ ہے۔"

"جی میڈم۔ میں تمام چیزیں مہیا کر دوں گا۔"

"لو یہ دس ہزار روپے رکھ لو۔ یہ تمام چیزیں تمہیں فراہم کرنی ہیں۔"

دس ہزار کے نوٹ بھی حیدر شاہ نے اٹھا کر جیب میں ٹھونس لئے اور پھر باہر نکل گیا۔ نادیہ غلام شیر کو دیکھنے لگی تھی پھر اس نے کہا۔ "ہوں۔ مطمئن ہو؟"

"خاک مطمئن ہوں۔ ابھی تک تو مجھے یہ نہیں پتہ چلا کہ تمہارا آگے کا پروگرام کیا ہے۔"

"جو کچھ ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ پرواہ مت کرو۔ میں نے ایک بہترین ذریعہ سوچا ہے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے بے فکر رہو۔"

بہرحال یہ تمام چیزیں ہوتی رہیں اور حیدر شاہ نے ان لوگوں کی تمام ضرورتیں پوری کر دیں۔ آرام دہ بستر' رہنے کے لئے پُرسکون مکان۔ غلام شیر نے ہنس کر کہا۔ "زندگی میں انسان کو اور کیا چاہئے ہوتا ہے۔ کیا کہتی ہو نادیہ۔ ایک خوبصورت حسین لڑکی جس سے محبت بھی ہو اور اسے اس کی محبت بھی حاصل ہو۔ اس کے بعد انسان کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے؟"

"بدن۔" نادیہ نے کہا اور غلام شیر چونک پڑا۔ پھر اس کے انداز میں اداسی گھل گئی۔

"ہاں بدن۔"

"جو مل جائے گا۔"

"اور اس کے بعد؟"

"اس کے بعد ایک حسین زندگی کا آغاز۔" غلام شیر کی آنکھیں خوابوں میں ڈوب گئی تھیں۔ کیا زندگی تھی۔ کہاں سے آغاز ہوا تھا۔ کنہیا لعل کی حرکت نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا لیکن اصل قصور تو ماں باپ کا تھا جنھوں نے بیس ہزار کے عوض اسے بیچ دیا تھا۔

نادیہ کی ذہانت پر خیر کوئی شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ پراپرٹی ڈیلر حیدر شاہ بھی ایک تعاون کرنے والا آدمی تھا اور واقعی اعصاب بھی مضبوط تھے اس کے کہ ایسی دو نادیدہ شخصیتوں کے لئے وہ کام کر رہا تھا۔ بہرحال ایک آرٹسٹ کو مہیا کیا گیا تھا اور آرٹسٹ سے ایک تصویر بنوائی گئی تھی جو یادداشتوں کی بنیاد پہ تھی۔ آرٹسٹ کو کہا گیا تھا کہ وہ اس گھر میں بیٹھ کر حیدر شاہ کے بتائے ہوئے نقوش والی تصویر تیار کرے۔ حیدر شاہ کو یہ نقوش خود غلام شیر بتاتا تھا اور آرٹسٹ اس کام کے لئے اپنی فنکارانہ مہارت سے کام لے رہا تھا۔ تقریباً بارہ دن گزر چکے تھے۔ آرٹسٹ ان کے بتائے ہوئے نقوش والی تصویریں بنا رہا تھا۔ پھر ایک دن جو تصویر اس نے تیار کی اسے دیکھ کر غلام شیر اچھل پڑا۔

"یہی ہے' یہی ہے۔ یہ میں ہی ہوں۔ آہ خدا کی قسم یہ میں ہی ہوں۔"

"تو پھر اب کیا کہتے ہو؟"

"میری تصویر بن گئی۔ یہ میں ہوں نادیہ! یہ میں ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔" نادیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آرٹسٹ کو ایک بھرپور معاوضہ دے کر رخصت کر دیا گیا اور تصویر پر طرح طرح کی تبصرہ آرائی ہونے لگی۔ حیدر شاہ ان کا بہترین معاون بن گیا تھا۔ نادیہ نے کہا۔

"اب ایک اخبار میں یہ تصویر شائع کرانی ہے۔"

"کیا کہہ کر؟"

"یہی کہ اس شخص کو تلاش کرنے والے کو بیس لاکھ روپے انعام دیا جائے گا۔"

غلام شیر اچھل پڑا تھا۔ وہ حیرت سے نادیہ کو دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔

"نادیہ اس طرح تو سینکڑوں آدمی اس کی تلاش میں لگ جائیں گے اور وہ چونکہ اصل شکل میں رہ رہا ہے اس لئے وہ اسے تلاش بھی کر لیں گے۔ پتہ کس کا دو گی؟"

"حیدر شاہ کا۔ حیدر شاہ کو اس سلسلے میں سمجھا دیں گے۔" نادیہ نے کہا اور غلام شیر نے گردن ہلا دی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"واقعی ہیرا اچھوت مشکل میں پڑ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی واقعی اس کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائے اور اگر نہ بھی پکڑ سکا تو کم از کم اس کے بارے میں اطلاع تو دے سکتا ہے۔"

"ہاں.......... ہم اپنے اشتہار میں یہ بات بھی چھپوائیں گے۔ پانچ لاکھ روپے اسے

دیئے جائیں گے جو اس کے بارے میں مکمل اطلاع دے اور بیس لاکھ اسے گرفتار کر کے یہاں تک لے آنے کے۔"

"میرا ایک مشورہ ہے!"

"ہاں بولو کیا؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ اسے پکڑ کرلانے کی بات نہ کی جائے کیونکہ ہیرا اچھوت گندے علوم کا ماہر ہے۔ آسانی سے اسے پکڑا نہیں جا سکے گا۔ البتہ یہ کہہ دیا جائے کہ اس کی اطلاع دینے والے کو پانچ لاکھ روپے دیئے جائیں گے۔"

"یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" نادیہ نے غلام شیر سے اتفاق کیا تھا۔

☆======☆======☆

بات ایک چھوٹی سی بستی کی ہے جس کا نام سید پور تھا۔ سید پور میں ہندو مسلمان سب ہی مل جل کر رہا کرتے تھے۔ ہیرا ایک چمار کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ الٹے سیدھے چکروں میں رہا کرتا تھا۔ کبھی کچی شراب بنا رہا ہے۔ کبھی چرس بیچ رہا ہے۔ یونہی دولت مند بن جانے کے خواب بیٹے نے بھی دیکھنے شروع کر دیئے تھے لیکن کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ گندے علوم کبھی کبھی بڑی قوت دے دیا کرتے ہیں اور انسان دولت کے انبار لگا لیتا ہے۔ چنانچہ ہیرا اچھوت سادھو' سنتوں کے چکر میں پڑ گیا تھا اور گندے علوم سیکھنے کے لئے اس نے تمام غلاظتیں خود پر لاد لی تھیں۔ پھر کالے علم کے ماہر کسی شخص نے اسے تھوڑے سے جادو منتر وغیرہ بتائے اور وہ ان میں مصروف ہو گیا۔ کافی کچھ سیکھ لیا اس نے اور بڑی غلیظ حرکتیں کرنے لگا۔ بے شمار لوگوں کو اس نے نقصانات پہنچائے اور اس کی شکایتیں چاروں طرف ہونے لگیں۔ مولوی منظور ایک اللہ والے بزرگ تھے اور اسی بستی میں لوگوں کے کام آیا کرتے تھے۔ جب انہیں اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے ہیرا کو بلا بھیجا۔ ہیرا اب کافی مغرور ہو گیا تھا۔ اس نے مولوی منظور کے پاس آنے سے منع کر دیا تو مولوی منظور خود اس کے ہاں پہنچ گئے۔ ہیرا نے انہیں دیکھ کر حقارت سے کہا۔

"کہو ملا جی کیسے آنا ہوا؟"

"ہیرا! جو کچھ تم نے بستی والوں کے ساتھ کر رکھا ہے۔ وہ اچھی بات نہیں ہے۔ بڑی شکایتیں ملی ہیں مجھے تمہاری۔ دیکھو بستی کے لوگ تو اپنے بہن بھائی ہوا کرتے ہیں۔ تم نے اگر کوئی ایسا چکر چلا بھی لیا ہے تو کم از کم بستی والوں کو تو تم ایسی کوئی تکلیف نہ دو۔"

"ملا جی! تم ان کے وکیل بن کر کیوں آئے ہو؟ تمہیں تو کوئی تکلیف نہیں دی میں نے۔"

"بھئی بستی والوں کا معاملہ ہے سب ایک دوسرے کا خیال کرتے ہیں۔ میں بھی کرتا ہوں اور تمہیں بھی کرنا چاہئے۔"

"دیکھو ملا جی! اپنے کام سے کام رکھو مجھے جو کرنا چاہئے میں کروں گا۔ میری پرواہ مت کیا کرو تم۔"

"نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر کیسا ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایک بار تمہیں سمجھاؤں گا اور اس کے بعد تمہیں سزا دی جائے گی۔"

"گھر پر آئے ہو ہمارے اور ہمیں دھمکیاں دے کر جا رہے ہو۔ ہم چاہیں تو تم واپس بھی نہیں جا سکتے مگر جاؤ۔ پہلی بار آئے ہو دوبارہ ادھر مت آنا۔" ہیرا اچھوت نے کہا اور مولوی منظور ہنستے ہوئے وہاں سے واپس چل پڑے۔ دوبارہ کوئی ایسا واقعہ ہوا جس پر بستی کے ایک شخص نے مولوی منظور سے شکایت کی اور جا کر کہا۔

"مولوی صاحب۔ اس کی حرکتیں اب حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ باقاعدہ اس نے اپنے لئے ایک مٹھ بنایا ہے جہاں بیٹھ کر وہ چلہ کشی کرتا ہے اور اپنے لئے جو عیش گاہ بنائی ہے اس نے' آپ ذرا دیکھیں وہ کس قدر قیمتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے پھر ملاقات کرتے ہیں اس سے۔" مولوی منظور نے کہا اور پھر وہ کافی دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ آخرکار انہوں نے کچھ کارروائیاں کیں اور ہیرا اچھوت کے پاس پہنچ گئے۔

"تم نے میری بات نہیں مانی نا ہیرا۔"

"مولوی صاحب! دیکھو اپنے کام سے کام رکھو۔ ہم تم سے آخری بار کہہ رہے ہیں۔ منہ اٹھا کر نہ چلے آیا کرو ہمارے پاس۔"

"اچھا۔ تو میں اب تھوڑا سا انتظام کئے دیتا ہوں تمہارے لئے۔ اس پر بھی نہ سنبھلا تو تجھے وہ سزا دوں گا جو تو زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

مولوی صاحب نے یہ کہہ کر کچھ پڑھا اور ہیرا اچھوت کی طرف پھونک دیا۔ اچانک

ہی ہیرا کے بدن سے بدبودار پانی نکلنا شروع ہو گیا۔ اس کے بدن میں جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے اور ان سے پانی نکل رہا تھا۔ ہیرا گھبرا گیا۔ اس نے راکھ نکالی اور اپنے بدن پر مل لی۔ اس نے بھی جادو کا عمل کیا تھا۔ راکھ نے وہ سارے سوراخ بند کر دیئے اور ان سے پانی بہنا بند ہو گیا لیکن دوسرا ردعمل یہ ہوا کہ چھوٹی چھوٹی سرخ زبانیں جو سانپ کی زبانوں کی طرح دو شاخہ تھیں' ان سوراخوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ بڑی سنگین صورت حال تھی۔ اسے سخت غصہ آنے لگا۔ مولوی منظور جو کچھ کر گئے تھے' اس نے اسے شدید بے آرامی کا شکار کر دیا تھا اور پھر اس نے اپنا جادوئی عمل شروع کر دیا تھا۔ مولوی منظور کو اندازہ تھا کہ کالے جادو کا ماہر اس سلسلے میں کیا کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گھر کے گرد حصار قائم کر لیا اور دشمن کی طرف سے بے خبر نہ رہے۔ یہی ہوا۔ سورج چھپے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دفعتاً ہی مولوی منظور کے گھر پر ہانڈیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ جلتی ہوئی ہانڈیاں فضا میں بلند ہو کر مولوی کے گھر پر گر رہی تھیں اور اس وقت انہوں نے جو کچھ کیا تھا' وہ واقعی بڑی عقل مندی کا کام تھا۔ آگ اگلتی ہوئی ان ہانڈیوں نے چاروں طرف تباہی مچا دی تھی۔ قرب و جوار کے کئی گھر آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے لیکن مولوی منظور کا گھر چونکہ حصار میں تھا۔ اس لئے مولوی منظور محفوظ رہے لیکن ان کے پڑوسیوں کو شدید نقصانات ہوئے اور ان نقصانات سے مولوی منظور پوری طرح برافروختہ ہو گئے۔ بہر حال جنہیں نقصان پہنچا تھا ان کا نقصان تو پورا نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن مولوی منظور نے لوگوں کے سامنے قسم کھائی کہ اب ہیرا کی کہانی ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جائے گی۔ انہوں نے جس حد تک بھی ممکن ہو سکتا تھا نقصان اٹھانے والوں کی مدد کی اور اس کے بعد وہ چند افراد کے ساتھ ہیرا اچھوت کے گھر پہنچ گئے۔ ہیرا باہر ہی ان کا منتظر تھا۔ انہیں دیکھ کر طنزیہ انداز میں ہنستا ہوا بولا۔

"کیو ملا جی! عقل ٹھکانے آ گئی؟"

"ہیرا! میرا گھر تو محفوظ ہے لیکن میرے پڑوسیوں کو شدید نقصان پہنچا ہے میری وجہ سے۔"

"میرے آدمی کی وجہ سے پڑوسیوں کو نقصان ہی ہوتا ہے فائدہ تو نہیں ہوتا۔"

"ہیرا۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ دو دفعہ تجھے معاف کر دوں گا۔ تیسری دفعہ تجھے معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

"اچھا تو تم مجھے سزا دینے آئے ہو۔"

"ہاں۔ مجبوری ہے۔ تو نے اپنے چھوٹے موٹے منتروں سے کام لے کر اپنے بدن سے بہنے والے پانی کو بند کر دیا ہے لیکن اب میں دوسرا کام کروں گا۔ مجبوری ہے کیونکہ میں جانتا ہوں تو مانے گا نہیں۔"

"وہ دوسرا کام کیا ہو گا ملا جی؟"

"میں بہت جلد تجھے اس بارے میں بتا دوں گا۔"

مولوی منظور وہاں سے واپس چل پڑے۔ پھر انہوں نے ساری رات چلہ کشی کی اور دوسری صبح اپنے پڑوس سے چند افراد کو بلایا اور کہا۔ "آپ لوگوں کو ایک کام کرنا ہو گا۔ میں نے ہیرا اچھوت کو اس کے بدن سے محروم کر دیا ہے اور اب اس کی روح کو میں ایک بوتل میں بند کر کے پانی میں ڈال دوں گا۔ اس پر ایک شرط لگا دوں گا میں۔ وہ یہ کہ جب تک وہ سچے دل سے اسلام نہیں قبول کرے گا اور لوگوں کو ستانے کا کام بند نہیں کر دے گا' اس کا بدن اسے واپس نہیں ملے گا۔" یہ کہہ کر مولوی منظور نے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ لیا اور ایک بار پھر ہیرا اچھوت کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت بہت سے افراد ہیرا اچھوت کے پاس موجود تھے۔ ہیرا اچھوت کہہ رہا تھا۔

"بھائیو! مجبوری ہے' بالکل مجبوری ہے۔ میں مولوی منظور کو ختم کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اور کوئی حل نہیں میرے پاس' کیا سمجھے؟" اتنے میں مولوی منظور وہاں پہنچ گئے تو انہوں نے کہا۔

"ہیرا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھ سے تیرا بدن چھین لوں اور تجھے اس مٹھ میں بند کر دوں جہاں تو جادو منتر کیا کرتا ہے۔ تیری آتما کو میں اپنے قبضے میں کر لوں' کیا سمجھا؟"

"ارے جاؤ میاں جی! ہوش ٹھکانے ہیں تمہارے۔" ہیرا اچھوت نے کہا اور اسی وقت ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ چاروں طرف فضا میں گونجنے لگی اور اچانک ہی ہیرا اچھوت ایک دھند کے حصار میں گھر گیا۔ حصار نے اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا تھا۔ ہیرا کی چیخیں گونجنے لگیں اور کچھ لمحوں کے بعد اس کا جسم بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کی روح ایک ہیولے کی شکل میں کچھ فاصلے پر نظر آئی۔ مولوی صاحب نے کہا۔

"ایک بوتل لاؤ۔ میں بوتل لانا بھول گیا ہوں۔ میں اس روح کو بوتل میں سمیٹ کر جیل میں پھینک دوں گا۔" ابھی مولوی صاحب کے منہ سے اتنے الفاظ نکلے تھے کہ اچانک وہ سفید ہیولا فضا میں پرواز کر گیا۔ مولوی صاحب کچھ قدم اس کے پیچھے لپکے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ہیرا اچھوت کی آتما فضا میں بلند ہو گئی۔ البتہ اس کا جسم اسی طرح بے جان پڑا ہوا

تھا۔ مولوی صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

"شیطان بھاگ گیا ہے لیکن میں اس کا جسم اس کے قبضے میں نہیں آنے دوں گا اور وہ بے جسم پھرتا رہے گا۔" یہ کہہ کر مولوی صاحب نے کچھ لوگوں کو اکٹھا کیا اور پھر ہیرا اچھوت کی روح تو کہیں اور پرواز کر گئی' اس کا جسم اس مٹھ میں قید کر دیا گیا اور وہاں تالا ڈال دیا گیا۔ اس وقت سے ہیرا اچھوت کا بدن اس کے قبضے میں نہ رہا۔ ہیرا نے اچھے طور پر بہت سے علوم حاصل کر لئے۔ اسے پتہ چل گیا کہ سات پائیل قربان کرنے پڑیں گے شیطان کے قدموں میں۔ تب جا کر اسے اپنے من پسند جسم کا حصول ہو سکتا ہے۔ اور ہیرا کا من پسند جسم اس کا اپنا ہی جسم تھا۔ بس یہ انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ بہرحال وہ تمام کوششوں میں مصروف رہا۔ زندگی کے الٹ پھیر چلتے رہے۔ ساتواں پائیل غلام شیر تھا جسے حاصل کرنے کے لئے ہیرا نے بڑے پاپڑ بیلے تھے لیکن غلام شیر کو وہ قربان نہ کر سکا۔ نعمت خان سنگلی نے مداخلت کر کے اس کا کام خراب کر دیا۔ بہرحال اس کے بعد بحالت مجبوری اسے غلام شیر کا جسم حاصل کرنا پڑا اور اب وہ اسی جسم میں وقت گزار رہا تھا۔ جادو منتر کر کے اس کے لئے دولت وغیرہ حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن اپنے بدن کے بغیر زندگی بے مزہ تھی۔ آخر کار اس نے ایک ترکیب سوچی۔ اپنا جسم کھوئے ہوئے اسے بے شمار سال گزر چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ ذرا دیکھا جائے' مولوی منظور کو کسی طرح دھوکا دے کر جسم حاصل کر لینا چاہئے۔ اب چونکہ اس کے پاس غلام شیر کا جسم تھا چنانچہ وہ ایک لمبا سفر کر کے آخر کار ایک بار پھر اپنی اسی پرانی بستی میں پہنچ گیا۔ بستی سید پور میں داخل ہونے کے بعد اس کی ہزاروں یادیں سامنے آ گئیں۔ بڑی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ جہاں مولوی منظور کا گھر تھا وہاں ایک عجیب سی عمارت بنی ہوئی تھی۔ جب وہ اس عمارت کے دروازے پر پہنچا تو وہاں اسے مولوی منظور نظر آئے جو کوئی چیز اٹھائے ایک طرف جا رہے تھے۔ ہیرا ان کے قریب پہنچا اور اس نے بڑے ادب سے گردن جھکائی تو مولوی منظور نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور مدھم لہجے میں بولے۔

"ہاں بھئی۔ کیا بات ہے؟"

"بابا صاحب! میرا نام غلام شیر ہے۔ بے روزگار ہوں۔ آپ کے قدموں میں آیا ہوں۔ میری کچھ مدد کر دیجئے۔"

"پیسے چاہئیں؟"

"نہیں۔ بابا صاحب! نوکری چاہئے۔"

"اچھا۔ وہ دیکھو وہ سامنے جو عمارت نظر آ رہی ہے۔ اس کی صفائی کر دیا کرو۔ وہاں تمہیں ایک طاق میں سے دس روپے مل جایا کریں گے۔ وہیں سے اٹھا لیا کرو۔ بس اتنا کام کیا کرو۔ کھا پی لیا کرو۔ اکیلے آدمی ہو' تمہارے لئے کافی ہوں گے۔"

"جی بابا صاحب۔ ٹھیک ہے۔" ہیرا اچھوت نے سوچا' مولوی کو دھوکا دینے میں تو وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ یہاں تھوڑے قدم جما لے' اس کے بعد ذرا مولوی منظور کو دیکھے گا۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ کچھ دن اپنا کام خاموشی سے کرے گا۔ اس کے بعد مولوی منظور کو کسی جال میں پھانس کر صورت حال کو دیکھے گا۔ دس روپے روز اسے ایک طاق سے مل جایا کرتے تھے اور وہ اپنا کام صفائی کر لیا کرتا تھا۔ خفیہ طور پر اس نے اپنے جسم کی تلاش جاری رکھی تھی۔ جس کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں تھا کیونکہ وہ جسم کے اصل جگہ تک پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔ بہت عرصے تک وہ یہ ساری کارروائی کرتا رہا۔ ڈھائی تین مہینے گزر چکے تھے اور وہ خاموشی سے سر جھکائے اپنا کام کرنے میں مصروف تھا۔ مولوی منظور اسے دوبارہ نظر نہیں آئے تھے۔ قرب و جوار کی آبادی میں بھی اس کے چند شناسا ہو گئے تھے جو اسے غلام شیر کے نام سے ہی جانتے تھے اور اس کے پاس کبھی کبھی آ بیٹھتے تھے۔ ان میں ایک خاصا عمر رسیدہ شخص امداد علی بھی تھا جو بہت اچھی طبیعت کا مالک تھا اور اکثر وہ غلام شیر کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لے کر آیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے کہا۔

"بھائی غلام شیر! تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں تم اکیلے پڑے رہا کرتے ہو۔ اگر تم چاہو تو اپنے گھر والوں کو یہاں بلا لو۔ وہ ایک کوٹھڑی خالی پڑی ہوئی ہے نا' میں تمہیں وہ کوٹھری دلوا دوں گا۔ ویسے یہاں تمہیں کس نے ملازم رکھا ہے؟"

"وہ بابا صاحب نے۔"

"کون بابا صاحب؟"

"مولوی منظور۔"

"کیا؟" امداد علی نے حیرت بھری آواز میں کہا۔

"ہاں۔ میں انہیں بابا صاحب ہی کہتا ہوں۔"

"کہتے ہو؟"

"ہاں بھئی ہاں۔"

"یار اسے کیا ہو گیا ہے' اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے کیا؟"

"کیوں کیا ہوا؟" ہیرا اچھوت نے غلام شیر کی حیثیت سے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

"مولوی منظور نے تمہیں ملازم رکھا ہے؟"

"ہاں انہوں نے رکھا ہے۔ دس روپے روز دیتے ہیں مجھے۔"

"ارے بھائی یہ تو کھسک گیا۔ ارے بھیا! مولوی منظور کو تو مرے ہوئے بھی دس سال گزر چکے ہیں۔"

"کیا........؟" ہیرا اچھوت کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔

"دس سال پورے دس سال۔ ابھی پچھلے دنوں ہی تو ان کی دسویں برسی منائی گئی ہے۔ یہاں اندر انہی کا تو مزار ہے جس کی تم صفائی ستھرائی کیا کرتے ہو۔" ہیرا اچھوت کا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

"ک.......... کیا.......... کیا کہہ رہے ہو؟" وہ خوف بھرے لہجے میں بولا۔

"کھسک ہی گیا تو بھیا! ارے بھائی یہ مولوی منظور کا مزار ہے جس کی تو صفائی ستھرائی کرتا ہے اور انہیں مرے دس سال گزر چکے ہیں' سمجھا؟" امداد علی نے کہا۔ ہیرا اچھوت کا تو دم ہی خشک ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے لیکن دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مولوی منظور کی روح تھی جس نے اسے یہاں ملازمت پر مقرر کیا۔ بہرحال ہیرا اس وقت تو خاموش ہو گیا پھر اس نے موقع نکال کر امداد علی سے پوچھا۔

"امداد علی بابا! آپ تو یہاں بہت عرصے سے رہتے ہو۔ کسی زمانے میں یہاں ایک آدمی ہیرا رہتا تھا۔ مولوی منظور سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا اور مولوی صاحب نے اس کا بدن چھین لیا تھا۔"

"ارے ہاں! تجھے کیسے معلوم اس کے بارے میں؟"

"بس ایسے ہی لوگوں سے قصے سنے تھے اس کے۔"

"ارے بھیا! اس کا قصہ بھی بڑا عجیب تھا۔ سسرا گندے علم کرتا تھا۔ مولوی صاحب سے اڑ گیا۔ مولوی صاحب نے اسے پہلے تو سمجھایا لیکن جب وہ نہیں مانا تو انہوں نے اس سے اس کا بدن چھین لیا اور اس کی آتما کو بوتل میں بند کرنے جا رہے تھے کہ وہ بھاگ گئی۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اس کا بدن اس کے بنائے ہوئے مٹھ میں رکھ دیا۔ مولوی

صاحب نے اس پر ایک شرط لگا دی تھی اور کہا تھا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے اور سارے برے کام چھوڑ دے تو وہ اس کا بدن واپس کر دیں گے لیکن پھر وہ واپس نہیں آیا۔ کئی سال گزر گئے۔ مولوی صاحب بیمار ہوئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ لوگ اس کے بدن کو بھول بھی گئے تھے۔ پھر ایک مرتبہ یاتریوں کی ایک ٹولی جو کہیں تیرتھ یاترا کے لئے جا رہی تھی' پیدل سفر کرتے ہوئے اس مٹھ کے پاس رکی۔ یاتریوں کے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ وہ دیکھیں تو سہی اس مٹھ میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ مٹھ کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ انہیں وہاں ایک انسانی لاش نظر آئی جو کسی ہندو کی تھی۔ انہوں نے اس جسم کا مخصوص طریقوں سے جائزہ لے کر یہ اندازہ لگا لیا۔ ان کی سمجھ میں اور کچھ تو نہیں آیا۔ اپنے نیک جذبوں کے تحت انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا کریا کرم کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس لاش کی ارتھی بنائی اور اسے لکڑیاں رکھ کر جلا دیا۔"

"کیا؟" ہیرا کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ روتا ہوا وہاں سے نکل بھاگا۔ اس کا رخ مٹھ کی جانب تھا۔ امداد علی حیران رہ گیا تھا۔ پھر اس نے باہر نکل کر بستی کے دوسرے لوگوں کو بھی اس بارے میں بتایا اور دوسرے لوگ بھی مٹھ کی جانب دوڑ پڑے لیکن ہیرا غلام شیر کے بدن میں دوڑتا ہوا مٹھ تک پہنچا تھا اور وہاں واقعی اس کی لاش موجود نہیں تھی بلکہ تھوڑے فاصلے پر راکھ پڑی ہوئی تھی۔ یہ اس کی ارتھی کی راکھ تھی۔ وہ اس راکھ کو مٹھی میں اٹھا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ لوگ جب وہاں پہنچے تو انہوں نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا۔ کسی نے اس سے پوچھا۔

"ارے بے وقوف! یہ ایک ہندو اور کالے جادو والے کی لاش کی راکھ ہے۔ تو اسے دیکھ کر کیوں رو رہا ہے؟"

"ارے بھیا کیا بتاؤں ارے کیا بتاؤں۔" ہیرا چیخیں مار مار کر روتا رہا اور اس کے بعد روتا ہوا وہاں سے آگے چل پڑا۔ اب یہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جا کر اچانک ہی وہ اپنی جگہ پر رکا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"مولوی منظور! تو نے میرا کریا کرم کر دیا پر میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ قبر کھود کر تیری ہڈیاں نکالوں گا اور انہیں بھی اپنی ارتھی کے ساتھ ہی جلاؤں گا۔ نہیں چھوڑوں گا میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا اور وہاں ایک جگہ چھپ گیا۔ پھر چار پانچ دن تو اس نے خاموشی سے گزارے اور انتظار کرتا رہا۔ کدال' پھاوڑا وغیرہ لے کر وہ رات کی تاریکی میں خاموشی کے ساتھ مولوی منظور کے مزار پر آ گیا۔ ویسے بھی لوگ اسے

جانتے تھے کہ وہ مزار کا مجاور ہے۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں اس نے اپنے خوفناک منصوبے کے تحت قبر کھودنا شروع کی اور تھوڑی سی قبر کھود لی۔ قرب و جوار میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور وہ اندھیرے میں اپنا کام بخوبی انجام دے رہا تھا۔ اس کے دل میں غصے کا طوفان تھا۔ پھر جب دیر تک کھدائی کرتے ہوئے وہ تھک گیا۔ تو کچھ دیر آرام کرنے کے لئے رکا۔ ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ اچانک ہی اسے اپنے عقب میں ایک مدھم روشنی کا احساس ہوا تھا اور اس کی گردن گھوم گئی تھی۔ تب اس نے دیکھا کہ مولوی منظور تھوڑے فاصلے پر بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔

"جب اوپر اوپر سے یہ مٹی ہٹائے گا تو اس کے بعد تجھے پتھر کی ایک سلیب نظر آئے گی۔ نہ تُو اسے اپنی اس کدال سے توڑ سکتا ہے اور نہ ہی کچھ کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ مٹی برابر کر دے۔ اس کے علاوہ آج سے تیرے پاس تیری کوئی ماورائی قوت قائم نہیں رہے گی۔ تُو صرف ایک گندی روح کی طرح رہ جائے گا۔ بس یہ بدن تیرے پاس ہوگا اور وہ بھی اس شکل میں کہ تُو خود ہی گھبرا کر اسے چھوڑ دے گا اور ایسا ہو جائے گا۔ میں تیری تمام ماورائی قوتوں کو تجھ سے چھینتا ہوں۔"

مولوی صاحب نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور اچانک ہی ہیرا اچھوت کو محسوس ہوا جیسے اس کا سارا وجود ہلکا ہو گیا ہو۔ وہ وہاں سے چیختا ہوا باہر بھاگ نکلا اور اس کے بعد اس نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔

☆======☆======☆

نادیہ کا اشتہار اخبارات میں شائع ہو چکا تھا اور بے شمار لوگ غلام شیر کی تلاش میں تھے۔ مصوّر سے بنوائی ہوئی تصویر بھی اخبار میں چھپ چکی تھی۔ بہرحال یہ کام جاری تھا اور خود غلام شیر نادیہ کے ساتھ اسی مکان میں مقیم تھا۔ نادیہ نے یہاں فون لگوا لیا تھا اور پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے رابطہ قائم کیے ہوئے تھی۔ ادھر شہر کا ایک بہت بڑا بدمعاش جگن استاد اشتہار دیکھ کر ساکت ہو گیا تھا۔

"پانچ لاکھ پورے پانچ لاکھ۔ ابے اُلو کے پٹھو! تم سب کو پانچ لاکھ کمانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تم دیکھ رہے ہو۔ آج کل بازار میں مندہ ہی مندہ ہے۔ ہر کاروبار ٹھپ پڑا ہوا ہے۔ سسرو! اس کے بجائے کہ فاقے کرو۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر وہ کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تو کیا ہوگا؟"

جگن استاد کے گرگے چاروں طرف پھیل گئے اور آخر کار [illegible]

میں چھپی ہوئی تصویر والے آدمی کو تلاش کر لیا۔ ایک کھنڈر نما جگہ تھی جہاں وہ ایک پتھر کی چٹان پر سو رہا تھا۔ یہ اصل میں ہیرا ہی تھا جو وہاں سے بھاگ کر رات بھر دوڑتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ تھکن بری طرح اس کے اعصاب پر سوار تھی۔ چنانچہ ایک کھنڈر کی ایک صاف شفاف سل پر لیٹ کر وہ گہری نیند سو گیا تھا۔ بڑا برا حال تھا اس کا۔ تمام کالی قوتیں اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں اور اب وہ اپنے کسی بھی عمل سے کوئی کام نہیں لے سکتا تھا۔ جگن استاد کے دونوں آدمیوں نے اسے دیکھا اور ان کا منہ خوشی سے چمک اٹھا۔

"لے مراد پوری ہو گئی۔ پکڑ لے بھوتنی والے کو۔" ہیرا اچھوت کی آنکھ اس وقت کھلی جب وہ دونوں اسے رسیوں سے جکڑ چکے تھے۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھا اور بولا۔

"کون ہو تم؟"

"پانچ لاکھ۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"کیا؟"

"مم.......... میرا مطلب ہے تت.......... تُو پانچ لاکھ۔"

"پاگل کے بچو! مجھے باندھ کیوں لیا ہے تم نے؟"

"اس لئے کہ پاگل کے بچے ہیں۔"

"کھولو.......... چھوڑ دو مجھے۔"

"اب اتنے بھی پاگل نہیں ہیں۔ چلو اسے لے کر چلو۔" جب وہ وہاں سے تھوڑے سے آگے نکلے تو ان میں سے ایک نے کہا۔

"یار! ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں۔ بولو۔"

"ہم اسے جگن استاد کے پاس لے جائیں گے' جگن استاد اسے بند کر دے گا۔ پھر ان لوگوں سے بات کرے گا۔ اسے ملیں گے پانچ لاکھ۔ جانتے ہو تم وہ ہمیں ان پانچ لاکھ میں سے کیا دے گا؟"

"پچاس پچاس روپے۔ ہمیشہ کا حرامی ہے۔"

"پانچ لاکھ اور پچاس روپے۔ ان میں ایک صفر اور بھی نہیں لگائے گا وہ کمینہ۔ تو ایک کام کیوں نہ کریں؟"

"کیا؟"

"چپ چاپ اسے بند کر لیتے ہیں اور جگن استاد کے لئے کام کرتے رہتے ہیں۔ ہفتہ دس دن گزر جائیں گے تو پھر فرضی نام سے ان لوگوں سے رابطہ قائم کریں گے۔ ظاہر ہے یہ ہمارے قبضے میں ہوگا تو کوئی اور تو اسے تلاش کر نہیں سکتا۔ جب ہم یہ دیکھ لیں گے کہ سب لوگ ناکام ہو چکے ہیں تو ایک فرضی نام سے ٹیلی فون کر کے ان سے کہیں گے پانچ لاکھ روپے ہمارے حوالے کریں اور اپنا بندہ لے جائیں۔ کیا سمجھا' اس طرح ساری رقم ہماری ہوگی۔"

"یار! مگر ایک بات سوچ لے۔"

"کیا؟"

"جگن استاد کو پتہ چل گیا تو؟"

"کیسے پتہ چلے گا' تو انہیں بتائے گا یا میں؟"

"بات تو ٹھیک ہے۔ زندگی بن جائے گی اپنی تو۔"

"تو اور کیا؟ میرا دماغ اتنی بڑی سوچتا ہے۔"

"مگر اسے بند کہاں کریں؟"

"ڈاک بنگلے میں۔ سیدھی سی بات ہے۔ وہاں اپنا بندہ تو موجود ہے ہی اور پھر اور بھی کچھ سوچیں گے۔"

چنانچہ ہیرا اچھوت کو وہ لوگ کافی فاصلہ کر کے ایک ایسے ڈاک بنگلے میں لے آئے جو شہری آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ یہاں کا چوکیدار ان کا شناسا تھا۔ تینوں نے بیٹھ کر مشورہ کیا۔ چوکیدار نے کہا۔

"یہ بھاگے گا تو نہیں؟"

"بالکل بھاگے گا۔ اگر بھاگتا نہیں تو اسے تیرے پاس کیوں لاتے؟"

"یارو۔ مجھے تو دوسرے کاموں میں بھی جانا پڑتا ہے۔ بندہ چالاک معلوم ہوتا ہے۔ ایسا کرتے ہیں اس کے کپڑے اتار لیتے ہیں۔ ننگا ہوگا تو باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرے گا۔"

"ایسے تو نہیں اتارنے دے گا۔ لڑے گا بھڑے گا۔ اسے چائے وغیرہ میں بے ہوشی کی دوا دیتے ہیں اور پھر یہ کام کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" چنانچہ ہیرا اچھوت کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور پھر چائے میں اسے بے ہوشی کی دوا دے دی گئی۔ ہیرا جب لمبی بے ہوشی سے جاگا تو اس کا سر چکرا رہا

تھا۔ تقدیر اس کے ساتھ برے سے برا کھیل کھیل رہی تھی۔ مولوی منظور آخر اسے بری طرح تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ خود اس دنیا سے چلے گئے تھے لیکن اس کا ستیاناس کر دیا تھا انہوں نے۔ اب کیا کرنا چاہئے اب تو وہ بالکل ہی ایک عام آدمی رہ گیا تھا۔ اچانک ہی اسے ٹھنڈی ہوا کا احساس ہوا تو پہلے اس نے اس کھڑکی کی جانب دیکھا جس میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور وہ کھلی ہوئی تھی۔ پھر اسے اپنے بدن کا خیال آیا اور ایک لمحے کے اندر اندر اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن پورے کمرے میں اس کے اترے ہوئے کپڑوں کا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ وہ زور زور سے چیخنے لگا۔

"کوئی ہے۔ کوئی ہے۔ مر جاؤ تم لوگ' ستیاناس ہو تمہارا' ابے کپڑے کہاں ہیں میرے؟" کھڑکی میں ایک اجنبی چہرہ نظر آیا اور اس نے کہا۔

"بھائی صاحب ویسے تو تم دروازہ کھول کر نکل نہیں سکتے لیکن اب کپڑے نہیں ہیں تو بھاگو گے کیسے؟"

"اوہ شرم نہیں آتی تم لوگوں کو میرے کپڑے اتار دیئے؟"

"پرواہ مت کرو۔ تمہیں کھانا بھی ملے گا پانی بھی ملے گا۔ بس کپڑے نہیں ملیں گے۔" ہیرا کی حالت بری ہو گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ چوکیدار نے اسے کھانا پینا سب کچھ دیا۔ وہ دونوں کارکن جگن استاد کو دکھانے کے لئے تصویر والے کی تلاش میں مصروف تھے اور ذمہ داری چوکیدار نے ہی سنبھالی ہوئی تھی۔ بہرحال لباس ہیرا کو نہیں مل سکا۔ وہ ترکیبیں سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہئے۔ بہرحال اس نے دروازے کو آزمایا اور اسے اندازہ ہوا کہ دروازہ تھوڑی سی محنت کھولا جا سکتا ہے لیکن انتظار کرتا تھا۔ کوئی دو دن اسے اس طرح بند رہنا پڑا۔ کوئی تکلیف نہیں تھی اسے سوائے کپڑوں کے۔ تیسرے دن اسے موقع مل گیا۔ دوپہر کو بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ چوکیدار کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اس نے اپنی مہارت سے کام لے کر دروازے پر زور آزمائی شروع کر دی اور چالاکی سے دروازے کا بولٹ گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ وہ باہر نکل آیا۔ اس نے لوہے کی ایک سلاخ ہاتھ میں اٹھا لی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اگر موقع مل گیا اور چوکیدار نے راستہ روکنے کی کوشش کی تو اسے ہلاک کر دے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اس ڈاک بنگلے میں اپنے کپڑوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ چوکیدار کسی کام سے گیا ہوا تھا لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اپنے شکار کو روکے رکھنے کا ایک ہی طریقہ اسے مل سکا تھا وہ

یہ کہ اس کے کپڑے غائب کر دے۔ اس نے کپڑے غائب ہی نہیں کئے تھے بلکہ ان کی گٹھڑی بنا کر ایک کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ ڈاک بنگلے میں اور کوئی لباس نہیں تھا۔ ہیرا پریشان ہو گیا کہ کیا کرے۔ چنانچہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ایسے ہی یہاں سے نکل لے۔ ڈاک بنگلہ ذرا ویران سے علاقے میں تھا۔ ہیرا نے سوچا کہ آس پاس کوئی موجود تو نہیں ہے۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ کوئی بھی مل گیا تو اسے مار پیٹ کر کپڑے حاصل کر لے گا۔ چنانچہ وہ درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں ہوتا ہوا وہاں سے آگے چل پڑا۔ کوئی ایک کلو میٹر جانے کے بعد اسے ایک سر سبز و شاداب علاقے میں ایک چھوٹی سی جھیل نظر آئی۔ جھیل کے کنارے دو خیمے لگے ہوئے تھے۔ یہاں کچھ لوگ پکنک بنانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ہیرا دبے قدموں اس طرف چل پڑا۔ اسے صرف لباس کی تلاش تھی۔ چھپتا چھپاتا خیموں تک پہنچا اور پھر ایک خیمے کا پردہ اٹھا کر وہ اندر داخل ہوا۔ کان پھاڑنے والی چیخ سنائی دی تھی جو کسی لڑکی کی تھی اور ہیرا کے حواس بگڑ گئے تھے۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ اس نے خیمے کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی اور جیسے ہی خیمے سے باہر آیا' تین چار لڑکوں نے اسے پکڑ لیا۔

"ارے۔ یہ تو ننگا ہے۔ مارو سالے کو۔" اور اس کے بعد یہ چار پانچ لڑکے ہیرا پر پل پڑے۔ ہیرا کی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی کی جانے لگی اور وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ خیمے کے اندر داخل ہونے کے جرم میں' اور وہ بھی بے لباس ایک لڑکی کے خیمے میں گھسنا ایسی ہی پٹائی کا موجب بن سکتا ہے۔ ہیرا بس ایک بار ان کے قبضے سے نکل سکا تھا اور تیز رفتاری سے ایک طرف دوڑ پڑا تھا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ہیرا اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ مگر لڑکوں نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بمشکل تمام کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہیرا کو سڑک نظر آئی اور وہ نشیب سے اتر کر سڑک پر پہنچ گیا سامنے سے ایک گاڑی آ رہی تھی جس نے قریب آ کر بریک لگائے تھے۔ ہیرا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ان لڑکوں سے جان بچانے کے لئے گاڑی والے سے لفٹ مانگ رہا تھا مگر گاڑی سے تین چار آدمی کود آئے۔

"ارے...... لو پکڑا گیا...... پکڑا گیا...... پکڑو...... پکڑو جانے نہ پائے۔"

اور دو تین آدمیوں نے اس پر رسی کے پھندے بنا کر ڈالے اور اسے جکڑ لیا۔ ادھر وہ لڑکے قریب پہنچ چکے تھے۔

"کیا ہے آپ لوگ کیوں پیچھا کر رہے ہیں اس کا؟"

"ہمارے خیمے میں گھسا تھا اور حلیہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو اس کا۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ نے اس سے کچھ بات چیت کئے بغیر اسے مار پیٹا ہو گا؟"

"کیا مطلب؟" لڑکوں میں سے ایک نے گاڑی میں اترنے والوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں اس گاڑی پر کیا مونو گرام ہے؟"

"ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"یہاں سے کوئی دس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک پاگل خانہ ہے۔ دماغی مریض وہاں رکھے جاتے ہیں۔ یہ پاگل خانے سے بھاگا ہوا مریض ہے۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ ہم ادھر سے گزر رہے تھے۔ پاگل ہے یہ بے چارہ۔ جائیں آپ لوگ' آپ نے پہلے ہی اسے کافی مار پیٹ لیا ہے۔"

ہیرا نے سوچا کہ ان لڑکوں کے چنگل سے تو نکلا جائے۔ چنانچہ خاموشی سے وہ بند گاڑی کے پچھلے حصے میں جا بیٹھا۔ مگر تقدیر اس کے ساتھ جو کھیل کھیل رہی تھی وہ خود اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس طرح ہیرا پاگل خانے میں پہنچ گیا۔ وہاں اسے کپڑے تو پہننے کو مل گئے جو پاگل خانے کا یونیفارم تھے لیکن وہاں جو اس پر مار پڑی اور جو دوائیں استعمال کرنی پڑیں' انہوں نے اس کے ہوش و حواس درست کر دیئے۔ پھر پاگل خانے کے انچارج نے اسے دیکھا اور اچانک ہی اس پر حیرتوں کے دورے پڑ گئے۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ کو بلایا اور کہا۔

"دیکھو۔ کچھ دن پہلے اخبارات میں ایک اشتہار شائع ہوا تھا جس میں کسی بندے کی بازیابی پر پانچ لاکھ روپے کی پیشکش کی گئی تھی۔"

"ہاں۔ کی تو گئی تھی۔"

"یہ وہی چہرہ ہے۔" اخبار تلاش کر کے تصویر کے ساتھ اس کا چہرہ ملایا گیا اور پاگل خانے کے انچارج کو یقین ہو گیا کہ یہ وہی چہرہ ہے۔ چنانچہ وہ اسے لے کر چل پڑے لیکن کچھ اور ہی کھیل ہونے والا تھا۔ راستے میں ٹریفک سگنل پر گاڑی رکی تو جگن استاد دوسری گاڑی میں اپنے گرگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہیرا کو دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو اشارے کرنے لگا۔ پاگل خانے کا انچارج اپنی ذاتی گاڑی میں جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جگن کے آدمی اس کے پاس پہنچ گئے۔ اور انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' ہیرا

اچھوت کو گاڑی سے نیچے کھینچ لیا۔ پاگل خانے کے انچارج کی اچھی خاصی پٹائی کر دی گئی تھی اور جگن ہیرا کو لے کر چل پڑا۔ اب ہیرا کے لئے سارے کام انتہائی مشکل ہو گئے تھے۔ وہ اس بھاگ دوڑ اور ان مصیبتوں سے تنگ آ گیا تھا چنانچہ جب اسے جگن استاد نے قید خانے میں بند کر کے رکھا تو بحالت مجبوری اس نے غلام شیر کا بدن چھوڑ دیا اور اپنی آتما کو سمیٹ کر وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ کسی ایسے جہان کی تلاش میں جہاں اسے سکون مل سکے۔

یہاں جگن استاد نے جب قید خانے میں غلام شیر کو دیکھا تو اس کا جسم بے جان تھا لیکن اشتہار میں یہ بھی لکھا تھا کہ زندہ یا مردہ چاہئے۔ چنانچہ جگن نے پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ قائم کیا اور اس طرح غلام شیر کا جسم اس مکان تک پہنچ گیا جہاں اسے پہنچانا تھا۔ طویل عرصے کے بعد غلام شیر کو اپنے جسم کا احساس ہوا۔ نادیہ نے بابا صاحب کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق غلام شیر کو اس کے بدن میں داخل ہونے کی ترکیب بتائی اور بہت عرصے کے بعد غلام شیر اپنی اصل شکل میں آیا۔ پھر یہاں سے بابا صاحب کے پاس جانے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا تھا۔ بابا صاحب نے غلام شیر کو اس کے جسم کے حصول کی مبارک باد دی اور کہا۔

"بیٹے! جاؤ.......... بہت سی محبتیں اور دعائیں تم لے کر جا رہے ہو۔ نادیہ تمہیں بھی اپنے جسم میں واپس آ جانا چاہئے۔ اپنے اصل وجود میں واپس آ جاؤ۔ غلام شیر تم اپنے باپ کریم شیر کے پاس واپس جاؤ اور اپنی قوتوں سے اپنے ماں باپ کی خدمت کرو کہ ساری کائنات ایک طرف اور ماں باپ کا وجود ایک طرف۔"

نادیہ غلام شیر اپنے گھر پہنچے۔ نادیہ تو اپنے بارے میں بتا چکی تھی کہ ایک بہن کے علاوہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے چنانچہ یہ چھوٹا سا خاندان پھر سے آباد ہو گیا۔ نادیہ کی شادی غلام شیر سے کر دی گئی اور نادیہ اپنی چھوٹی بہن کو بھی اپنے پاس لے آئی جو اب جوان ہو رہی تھی۔ یوں ان واقعات کا اختتام ہوا۔

☆======ختم شد======☆